شرعی احکام کی تنفیذ میں اسلامی ریاست کے فرائض واختیارات:

پاکستان کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے **پی ایچ۔ڈی علوم اسلامیہ**

مقالہ نگار

شاہد اسحاق

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

رجسٹریشن نمبر: 658-PhD/IS/F16

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

سیشن: 2022ء

شرعی احکام کی تنفیذ میں اسلامی ریاست کے فرائض واختیارات:

پاکستان کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے **پی ایچ۔ڈی علوم اسلامیہ**

مقالہ نگار

شاہد اسحاق

پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

رجسٹریشن نمبر: 658-PhD/IS/F16

نگران تحقیق

ڈاکٹر محمد ریاض محمود

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

سیشن: 2022ء

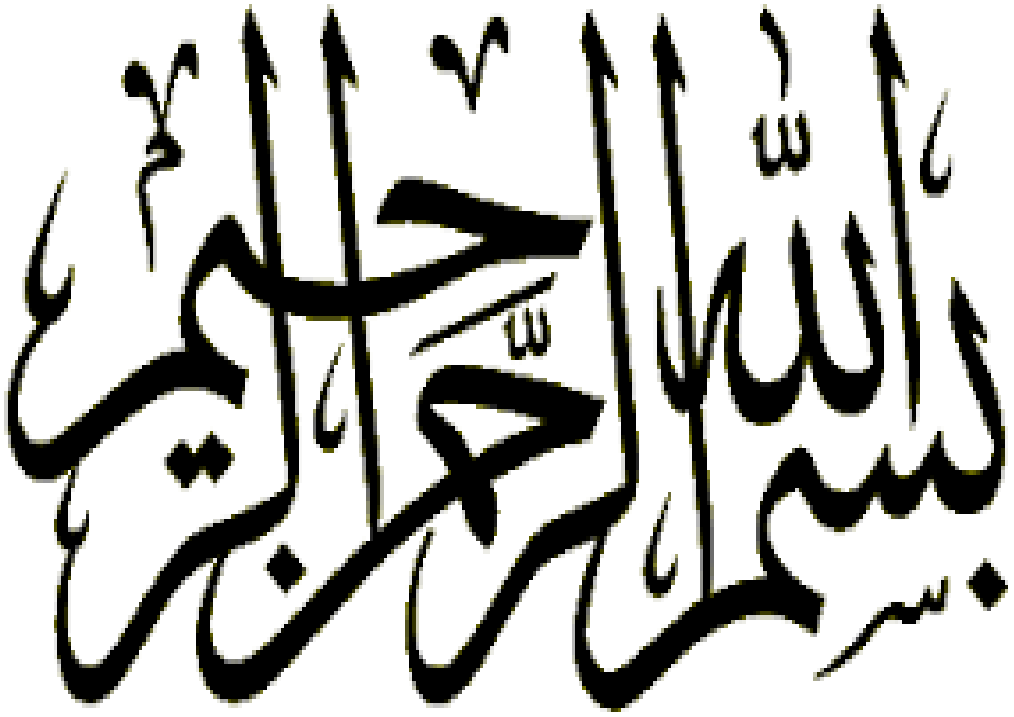
بسم الله الرحمن الرحيم

منظوری فارم برائے مقالہ ودفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھااور مقالہ کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: شرعی احکام کی تنفیذ میں اسلامی ریاست کے فرائض واختیارات: پاکستان کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ

Responsibilites and Powers of the Islamic State in Implementing Sharia Rules: Analytical Study in the Context of Pakistan Sharaei Aahkam ki Tanfeez Ma Islami Rayasat k Fraez o Ikhtiyarat: Pakistan k Tnazar ma Tajziyati Mutala

نام ڈگری: ڈاکٹر آف فلاسفی علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: شاہد اسحاق

رجسٹریشن نمبر: 658-PhD/IS/F16

ڈاکٹر محمد ریاض محمود _____

(نگرانِ مقالہ) دستخط نگرانِ مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی _____

(صدر شعبہ اسلامی فکر وثقافت) دستخط صدر شعبہ اسلامی فکر وثقافت

پروفیسر ڈاکٹر خالد سلطان _____

(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز) دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____

(پرو۔ریکٹر اکیڈمکس) دستخط پرو۔ریکٹر اکیڈمکس

میجر جنرل (ر) محمد جعفر _____

(ریکٹر نمل) دستخط ریکٹر نمل

تاریخ: _____

حلف نامہ فارم

(Candidate declaration form)

میں شاہد اسحاق ولد محمد اسحاق خان

رول نمبر: PD-F16-091 رجسٹریشن نمبر: 658-PhD/IS/F16

طالب، پی ایچ۔ڈی، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ بعنوان: **شرعی احکام کی تنفیذ میں اسلامی ریاست کے فرائض واختیارات: پاکستان کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ**

Responsibilities and Powers of the Islamic State in Implementing Sharia Rules: Analytical Study in the Context of Pakistan

Sharaei Aahkam ki Tanfeez Ma Islami Rayasat k Fraez o Ikhtiyarat: Pakistan k Tnazar ma Tajziyati Mutala

پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے اور **ڈاکٹر محمد ریاض محمود** کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے۔ راقم الحروف کا اصل کام ہے اور یہ کہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کروایا گیا ہے، نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لئے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ ایچ ای سی اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد علمی سرقہ کے حوالے سے عدم برداشت کی پالیسی پر سختی سے عمل پیرا ہیں اس لئے میں بطور مقالہ نگار اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ یہ میرا ذاتی علمی کام ہے۔ اس مقالہ کا کوئی حصہ بھی سرقہ شدہ نہیں ہے۔ اور میں نے جہاں سے بھی کسی علمی کام کو لیا ہے اس کا باقاعدہ حوالہ دیا ہے۔ میں اس بات کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ اگر میرے مقالے میں کسی بھی قسم کا باقاعدہ علمی سرقہ پایا جائے تو یونیورسٹی میری ڈگری کو ختم کرنے/واپس لینے کا اختیار رکھتی ہے۔

نام مقالہ نگار: شاہد اسحاق

دستخط مقالہ نگار: _____

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

(Abstract) ملخص مقالہ

Responsibilities and Powers of the Islamic State in Implementing Sharia Rules: Analytical Study in the Context of Pakistan

Pakistan came into existence as an Islamic state on the basis of the two-nation theory and it was the result of the centuries-long struggle of Indian Muslims and their long-standing dream was to establish a free and independent state where Sharia laws were enforced. A country, in which Muslims would spent their lives according to the teachings of Islam. The Muslims had ruled the subcontinent for centuries, but since there were different nations living in this region, whose way of life, culture, beliefs and ideas, society, affairs, worship and rituals were different from the Muslims, therefore the Muslims established a separate state for themselves. They felt the need and as a result of their hard work, Pakistan was established by the grace of Almighty Allah.

In this study, the implementation of the teachings of Islam in different aspects of life and the obstacles in its way and the responsibilities and powers of the state of Pakistan have been extensively discussed and its analytical study has been presented. On the basis of the study, suggestions have been made to eliminate the obstacles in the way of the implementation of the rules of Islam. It is concluded that the implementation of the rules of Islam in all aspects of life is the responsibility of the state, which has wider powers for the implementation. The Pakistani state, which has come into existence in the name of Islam, has the primary responsibility to use its wider powers to make practical efforts for the implementation of Sharia laws in the country so that Pakistan become a model of the state of Madinah and turn out to be an example for the rest of the world.

Key words: Islamic State; Implementation of Sharia Laws; Responsibilities of Islamic State; Powers of Islamic State; Teachings of Islam; Two-Nation Theory.

فہرست عنوانات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	مقالہ کی منظوری کا فارم	iv
2	حلف نامہ	V
3	ملخص	Vi
4	فہرست عنوانات	vii
5	اظہار تشکر	ix
6	انتساب	X
7	مقدمہ	1
8	**باب اول: اسلامی ریاست کی حیثیت سے پاکستان کی تشکیل اور شرعی احکام کی تنفیذ میں اس کے فرائض واختیارات**	14
9	فصل اول: اسلامی ریاست کی حیثیت اور احکام کی تنفیذ میں اس کا کردار	16
10	فصل دوم: پاکستان کا قیام اور اس کا تاریخی و تہذیبی پس منظر	43
11	فصل سوم: شرعی احکام کی تنفیذ میں ریاست پاکستان کے فرائض واختیارات	59
12	**باب دوم: عبادات سے متعلق اسلامی احکام کی تنفیذ**	74
13	فصل اول: نماز اور زکوۃ سے متعلق امور	76
14	فصل دوم: روزہ اور حج کے معاملات	100
15	**باب سوم: تعلیمی امور میں اسلامی احکام کی تنفیذ**	112
16	فصل اول: اختلاف رائے کے احترام سے متعلق معاملات	114
17	فصل دوم: مخلوط تعلیم	136
18	فصل سوم: غیر نصابی سرگرمیاں	146
19	**باب چہارم: سماجی امور میں احکامِ اسلامی کی تنفیذ**	152
20	فصل اول: پردہ ولباس سے متعلق امور	154

21	فصل دوم: سوشل میڈیا	164
22	فصل سوم: جنسی مصنوعات کی فروخت	173
23	**باب پنجم: معاشی امور میں احکامِ اسلامی کی تنفیذ**	180
24	فصل اول: مہنگائی	182
25	فصل دوم: نظام اراضی	197
26	فصل سوم: سرکاری املاک کی آبادکاری	209
27	**باب ششم: احکام اسلام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹیں اور ان کا حل**	225
28	فصل اول: احکام اسلامی کی تنفیذ کی کوششوں کا جائزہ	227
29	فصل دوم: احکام اسلام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹیں	249
30	فصل سوم: شرعی احکام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کے خاتمے کے لیے تجاویز	257
31	خلاصہ بحث	261
32	نتائج	262
33	سفارشات	263
34	فہرست قرآنی آیات	265
35	فہرست احادیث نبویہ ﷺ	269
36	فہرست مصادر و مراجع	274

اظہار تشکر(ACKNOWLDGEMENTS)

تمام تعریفیں اس اللہ وحدہ لاشریک کے لیے ہیں جس نے ہر لمحہ اپنے فضل واحسان کی بارشیں برسائیں،اس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ لامتناہی درود وسلام ہوں اس ذاتِ بابرکات ﷺ پر جن کی وجہ سے انسانیت کو ہدایت نصیب ہوئی۔ انھی محسنِ انسانیت ﷺ نے رہنمائی فرمائی کہ جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا۔ گویا انسانوں پر اپنے محسنین کا شکریہ ادا کرنا لازم قرار دیا۔اس لیے میں اپنے ان تمام محسنین کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس مقالہ کی تیاری میں میری رہنمائی فرمائی۔ میں اپنے نگرانِ مقالہ جناب ڈاکٹر محمد ریاض محمود ،ایسوسی ایٹ پروفیسر ، شعبہ اسلامی فکر وثقافت نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے انتہائی کم وقت میں محنت ، لگن اور خلوص سے اس مقالہ کی تکمیل میں میری رہنمائی فرمائی۔ میں اپنے استاد جناب ڈاکٹر حافظ راؤ فرحان علی کا بھی شکر گزار ہوں ،جنھوں نے موضوع کے انتخاب اور مقالہ کے ابتدائی مراحل میں میری مدد فرمائی۔ میں اپنے تمام اساتذہ کرام کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے تعلیمی مراحل میں میری رہنمائی فرمائی اور اس منزل تک پہنچنے کا سہارا دیا۔ میں اپنے والدین کا بھی شکر گزار ہوں کہ جن کی دعاؤں اور تعاون سے میں نے پی ایچ ڈی کے اس اہم ترین مرحلہ شوق کو طے کیا۔

شاہد اسحاق

انتساب(DEDICATION)

میں اپنی اس ادنٰی سی کاوش کو اپنے والدین اور اساتذہ کے نام کرتا ہوں جنہوں نے میری تعلیمی میدان میں رہنمائی اور مدد کی۔ ان ہستیوں کی کوششوں کی بدولت ہی میں آج اس مقام پر پہنچا ہوں۔ اللہ پاک انھیں اجر عظیم سے نوازے اور اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے۔

مقدمہ

موضوعِ تحقیق کا تعارف:(Introduction to the Topic)

اللہ تعالی نے انسان کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر بھیجا ہے۔ رب تعالیٰ نے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے ایک مربوط، منظم اور جامع نظام ترتیب دیا تاکہ وہ احسن طریقہ سے بندگی کے فریضہ کو ادا کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہدایت اور نظامِ زندگی انبیاء کے ذریعے انسانوں تک پہنچا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہونے والے انبیاء کرام کے سلسلہ کی آخری کڑی جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ کے ذریعے انسانوں تک پہنچنے والا نظامِ زندگی اپنی جامعیت کے اعتبار سے اکمل ترین ہے، جس پر عمل کر کے وہ خلافت اور بندگی کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے اس نظامِ اطاعت کو نافذ کرنے کے لیے کچھ لوگوں کو اولی الامر کے منصب سے نوزا ہے اور ان کی اطاعت کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے مصداق قرار دیا ہے۔ امراء اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کے نفاذ کا ذریعہ بنتے ہیں اس لیے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود بھی اللہ کے قانون کی پابندی کریں اور اپنے ماتحت لوگوں پر بھی اس کو نافذ اور جاری کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کی تعریف فرمائی ہے اور ان کی ذمہ داریوں کو بھی واضح کیا ہے۔ فرمایا گیا کہ اگر ان کو زمین پر حکومت دی جائے تو وہ نماز اور زکوٰۃ کے نظام کو قائم کرتے ہیں اور لوگوں کو معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکرات سے روکتے ہیں۔

شرعی احکامات کی تنفیذ اسلامی ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا ہے لہذا شرعی احکام کی تنفیذ ریاستِ پاکستان کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ ریاستِ پاکستان کے فرائض واختیارات کو واضح کرنے اور اس ضمن میں ہونے والی پیش رفت کا جائزہ اور مطالعہ کے لیے زیرِ تحقیق موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اگرچہ پاکستان میں شرعی احکام کی تنفیذ کے کے حوالہ سے کسی حد تک قانون سازی ہوئی ہے اور اسلامی نظریاتی کونسل کے نام سے ایک ادارہ اس مقصد کے لیے بنایا گیا ہے جس کا کام یہ ہے کہ اگر ملک میں کوئی قانون خلاف شریعت ہو تو وہ اس کی چھان بین کر کے اپنی سفارشات پیش کرے لیکن بد قسمتی سے آج تک اس ادارہ کی شفارشات کو اہمیت نہیں دی گئی۔ آئے روز شریعت سے متصادم بل اسمبلی میں پیش ہوتے ہیں اور قانون سازی کی جاتی ہے۔ ایسے حالات میں موضوعِ زیر بحث و تحقیق کی اہمیت وافادیت اور ضرورت بڑھ جاتی ہے۔

موضوع تحقیق سے متعلق سابقہ کام کا جائزہ:(Literature Review)

اسلامی ریاست کے عنوان سے اگرچہ بہت سی کتابیں اور رسالے لکھے گئے ہیں جن میں اسلامی ریاست کی خصوصیات، عصر حاضر میں اسلامی ریاست کی تشکیل، اسلام میں فلاحی ریاست کا تصور اور اس کے تقاضے، اسلامی ریاست کے بنیادی اصول و تصورات، اللہ تعالی کی حاکمیت کی تشریع اور معاشرتی عدل وانصاف کے علاوہ مختلف پہلوں کو اجاگر کیا گیا ہے لیکن اللہ تعالی کے احکامات کو نافذ کرنے کے لیے ریاست کے فرائض اور اختیارات کیا ہیں؟ یعنی ریاست کس حد تک عوام کو منکرات سے روکنے اور معروف پر عمل کرنے پر مجبور کر سکتی ہے اور خاص طور پر آج کے دور میں جب کہ منکرات کا شیوع ہے، ریاست کس طرح ان کا سد باب کر کے معروف کو رواج دے سکتی ہے۔ یہ ایک اہم موضوع ہے جس پر کوئی قابل ذکر تحقیق و تصنیف نہیں ہوئی۔

اسلامی ریاست کے مختلف پہلوں پر قبل ازین ہونے والی تحقیق کے موضوعات درج ذیل ہیں۔

1 فرید الدین طارق کا پی ایچ ڈی مقالہ "عصر حاضر میں اسلامی ریاست کی تشکیل، تحقیقی جائزہ، مسلم مفکرین کے افکار کی روشنی میں" نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز میں پیش کیا گیا۔ محقق نے اس مقالہ کو مقدمہ کے بعد پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب ریاست اور اس کا اسلامی تصور کے عنوان سے ہے جو تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ فصل اول ادارہ ریاست: تعارف وارتقاء اور جدید تصور کو زیر بحث لاتی ہے۔ دوسری فصل میں دین اسلام اور سیاست وریاست کا ذکر کیا ہے اور تیسری فصل میں ریاست اسلامی کے بنیادی اصول اور اجزاء ترکیبی کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ باب دوم اسلامی ریاست کا طرز حکومت کے عنوان سے ہے جو تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل، اسلامی مملکت کی دستوری قانون کی تشکیل اور ماخذ کے بارے میں ہے، دوسری فصل میں ریاست اسلامی میں سربراہ مملکت، انتخاب، مقام، اختیارات وغیرہ پر بحث کی گئی ہے اور تیسری فصل میں اسلامی ریاست کی انفرادیت کا تذکرہ ہے۔ باب سوم اسلامی ریاست کا نظم مملکت سے متعلق ہے جو پانچ فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل عدالتی نظام، دوسری فصل نظام معیشت، تیسری فصل نظام تعلیم وتربیت، چوتھی فصل امور داخلہ اور پانچویں فصل عسکری نظام سے متعلق ہے۔ چوتھا باب اسلامی ریاست کا تہذیبی پہلو اور عصر حاضر کے تہذیبی مسائل کے عنوان سے ہے جو تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل اسلامی تہذیب وثقافت، دوسری فصل تعمیر معاشرہ اور ریاست کی تہذیبی ذمہ داریاں اور تیسری فصل اسلامی معاشرے میں تنظیم خاندان، مرد اور عورت کا مقام، کردار سے بحث کرتی ہے۔ باب پنجم اسلامی ریاست: بنیادی انسانی حقوق، بین الاقوامی تعلقات کے عنوان سے ہے جو چار

فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل اسلامی ریاست اور بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ، دوسری فصل اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق وفرائض، تیسری فصل اسلامی ریاست کے دیگر ریاستوں سے تعلقات اور چوتھی فصل اسلام کا تصور و قانون جنگ، جہاد اور اس کا فلسفہ کے عنوان سے ہے۔

2 اسلام میں فلاحی ریاست کا تصور: دور نبوی ﷺ اور خلافت راشدہ کے تناظر میں، یہ ایم فل مقالہ ہے جسے محمد بشیر احمد نے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، 2014ء میں پیش کیا۔ اس مقالہ کو بشیر احمد نے مقدمہ کے علاوہ پانچ ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب فلاحی ریاست کا تعارف واہمیت اور تاریخی ارتقاء کے عنوان سے ہے۔ اس باب کے ذیل میں چار فصول کو ذکر کیا ہے۔ فصل اول میں ریاست و فلاحی ریاست کا مفہوم: لغوی واصطلاحی اعتبار سے بیان کیا گیا ہے۔ فصل دوم میں حاکمیت واقتدار اعلی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس فصل کے ذیل میں دو مباحث ذکر کی گئی ہیں، جن میں حاکمیت واقتدار اعلیٰ کو قرآن وحدیث اور عصر حاضر کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ فصل سوم اسلام میں دین وسیاست کا باہمی ربط کے عنوان سے ہے۔ فصل چہارم ماقبل اسلام اور عہد نبوی کی اہم ریاستوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

باب دوم فلاحی ریاست سیرت نبوی ﷺ کے آئینے میں کے عنوان سے ہے اور اس باب کی پانچ فصلیں ہیں۔ پہلی فصل ریاست مدینہ اور رسول اللہ ﷺ کی سیاسی حکمت عملی کو بیان کرتی ہے۔ دوسری فصل آئین اور دستور کی تشکیل کے بارے میں ہے۔ تیسری فصل میں عہد نبوی میں فلاحی معیشت کے قیام کا ذکر کیا ہے۔ چوتھی فصل مساوات اور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ سے متعلق ہے اور پانچویں فصل میں عہد نبوی میں غیر مسلم رعایا کے حقوق کا تذکرہ ہے۔ تیسرا باب فلاحی ریاست خلافت راشدہ کے آئینے میں کے عنوان سے ہے جس کے ذیل میں چار فصول ہیں جن میں خلفاء راشدین کے دور خلافت کے مباحث مذکور ہیں۔ چوتھا باب فلاحی ریاست کی ذمہ داریوں کے عنوان سے ہے۔ اس باب کی پانچ فصلیں ہیں۔ فصل اول قانون سازی سے متعلق ہے، فصل دوم بنیادی انسانی حقوق، فصل سوم معاشی اور معاشرتی عدل وانصاف کی فراہمی، فصل چہارم دفاع ریاست اور خارجہ پالیسی میں توازن اور پانچویں فصل تعلیمی سہولیات کے بارے میں ہے۔ پانچواں باب پاکستان فلاحی ریاست کب اور کیسے بنا کے عنوان سے ہے۔ اس باب کے تحت چار فصلیں ہیں۔ پہلی فصل نظریہ پاکستان اور آئین سازی کے مراحل سے متعلق ہے۔ دوسری فصل دستور پاکستان میں بنیادی فلاح کے قوانین کے بارے میں ہے۔ تیسری فصل پاکستان میں طرز حکمرانی سے متعلق ہے اور اس فصل کے ذیل میں دو مباحث ہیں۔ پہلی بحث جمہوری طرز

حکومت سے متعلق ہے اور دوسری بحث آمرانہ طرز حکومت کے حوالے سے ہے اور فصل چہارم میں پاکستان بطور فلاحی ریاست کا ذکر کیا ہے۔

3 شیخ الاسلام احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ کی کتاب "اَلْحِسْبَةُ فِيْ الْاِسْلَامِ اَوْ وَظِيْفَةُ الْحُكُوْمَةِ الْاِسْلَامِيَّةِ" ہے جو دار الکتب العلمیۃ بیروت سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب مقدمہ کے بعد سات فصول پر مشتمل ہے، جس کے 61 صفحات ہیں۔ پہلی فصل "اَلْوَلَايَاتِ الْاِسْلَامِيَّةِ" "اَلْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهْيٍ عَنِ الْمُنْكَرِ" کے عنوان سے ہے۔اس فصل میں انھوں نے قرآن پاک کی آیت نقل کر کے بتایا ہے کہ مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے اولیاء ہیں، وہ ایک دوسرے کو نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائیوں سے منع کرتے ہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان پر واجب ہے جبکہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہو، اس کی حیثیت فرضِ کفایہ کی ہے اور جب اس کے علاوہ کوئی اور قادر نہ ہو تو فرض عین ہو جاتا ہے۔ قدرت سے مراد سلطنت اور حکومت ہے۔اس لیے حکمران سب سے زیادہ ذمہ دار ہوتا ہے ، اور اسی طرح ہر آدمی حسب قدرت ذمہ دار ہوتا ہے۔دوسری فصل "مَسْئُوْلِيَّة الْمُحْتَسِبْ" کے عنوان سے ہے۔ جس میں محتسب کی ذمہ داریوں کا ذکر کیا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کا پابند ہو۔ جب وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کا پابند ہو تو لوگوں پر اس کی اطاعت واجب ہے۔ تیسری فصل "اَلْغَشُّ وَالتَّدْلِيسُ فِيْ الدَّيَانَاتِ"، چوتھی فصل "اَلْعُقُوْبَاتُ شَرْعِيَّة"، پانچویں فصل "اَلتَّعْزِيْرُ مَالِي"، چھٹی فصل بلا عنوان اور ساتویں فصل "اَلثَّوَابُ وَالْعِقَابُ" کے عنوان سے ہے۔

4 ڈاکٹر نثار احمد کی کتاب "عہد نبوی ﷺ میں ریاست کا نشوو ارتقاء" ہے۔اس کتاب میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ نے معاشرہ کی اصلاح اور تعمیر نو کے لئے سب سے پہلے عقائد کی تعلیم دی اور یہ عقائد اسلامی ریاست کی فکری بنیاد ہیں۔ یہی وہ عقائد ہیں جنھوں نے لوگوں کے دلوں کو اور ان کے ذہنوں کو بدلا جس سے ان کے رسم ورواج اور عادات بدلے ،آپس میں ہم آہنگی پیدا ہوئی اور دلوں کے جڑنے سے ایک اجتماعیت کی شکل پیدا ہوئی جس نے بالاخر ریاست کو جنم دیا۔ پھر ان عقائد کو جو ریاست کی فکری بنیادیں ہیں تفصیل سے بیان کیا۔ڈاکٹر نثار احمد کی یہ کتاب مقدمہ، پانچ ابواب، اختتامیہ، کتابیات اور اشاریہ پر مشتمل ہے، جس کے پانچ صد آٹھ صفحات ہیں۔پہلے باب میں بعثت نبوی ﷺ کے وقت دنیا کے سیاسی نظام کا ذکر کیا ہے دوسرا باب تاسیس ریاست کے عنوان سے ہے جس میں ریاست کی فکری بنیادوں کو بیان کیا گیا ہے۔ جن میں اللہ ، فرشتوں، رسولوں، آسمانی کتابوں اور آخرت کے دن پر ایمان کا ذکر ہے۔اس کے بعد معاشرہ کی تشکیل و تنظیم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرا

باب توسیع ریاست کے عنوان سے ہے، جس میں 1 ہجری سے 11 ہجری تک کے واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں استحکام ریاست کے دو ادوار مذکور ہیں۔ پانچویں باب میں انتظام ریاست کا تذکرہ ہے کہ ریاست کا نظم و نسق کن بنیادوں پر قائم تھا اور اس کے مختلف انتظامی ادارات کی نوعیت، طریقہ کار، مقاصد اور کارکردگی کیا رہی ہے۔

5 مولانا امین احسن اصلاحی کی کتاب "اسلامی ریاست" ہے۔ اس کتاب کو مصنف نے تقدیم کے بعد پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے جس کے کل صفحات 388 ہیں۔ پہلے حصہ میں چند بنیادی مباحث بیان ہوئے ہیں جن میں سب سے پہلے ریاست کا اسلامی تصور ہے اور اس کے ذیل میں خلافت اور امامت میں فرق، خلافت کے تضمنات، خلافت کے حقیقی اہل اور خلافت اور ایک عام ریاست میں فرق تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ پھر اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں کو ذکر کیا ہے جن میں اللہ تعالی کی حاکمیت، اولوالامر کی حیثیت، جمہور کی حیثیت اور اسلامی نظام حکومت اور اس کے مقابلے میں دوسرے نظام ہائے حکومت کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ پھر ان بنیادی مباحث میں خلافت کے لیے قرشیت کی شرط اور اسلامی قومیت کے عوامل وغیرہ ذکر کیے ہیں۔ دوسرا حصہ شہریت کے حقوق و فرائض کے عنوان سے ہے جس میں شہریت کی شرائط، غیر ملکی مسلمان اور حق شہریت، شہریت کے حقوق، شہریت کے فرائض اور عورتوں کے حقوق و فرائض ذکر کیے ہیں۔ تیسرا حصہ غیر مسلموں کے حقوق کے عنوان سے ہے جس کے ضمن میں غیر مسلموں سے متعلق دو بنیادی سوال، اہل صلح یا معاہد رعایا اور ان کے حقوق، ذمیوں کے حقوق، بعض غلط فہمیوں کا ازالہ، پاکستان کے غیر مسلموں کا شرعی حکم اور ان کے حقوق کو ذکر کیا ہے۔ چوتھا حصہ اطاعت کے شرائط و حدود کے عنوان سے ہے جن میں اسلامی نظام اطاعت اور طریق نبوت سے حکومت کے انحراف کی صورتیں وغیرہ ذکر کی ہیں۔ حصہ پنجم کارکنوں کی ذمہ داریاں اور ان کے اوصاف سے متعلق ہے جن میں مناصب کے متعلق اسلامی تصور، اسلامی حکومت کے امرا اور عمال میں کیا اوصاف مطلوب ہیں؟ جیسے اپنا عمل دوسروں کے لیے نمونہ ہو، نرمی بردباری اور فیاضی ہو، رعایا کی خبر گیری اور ان کے حال پہ شفقت، تمسک بالکتاب والسنہ، عمال کا احتساب، سرکاری مال کی حفاظت، امیر و مامور میں مساوات، رشوت سے، ہدیے، تحفے قبول کرنے سے احتراز وغیرہ امور ذکر کیے ہیں۔

6 سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "اسلامی ریاست: فلسفہ، نظام کار اور اصول حکمرانی" کے عنوان سے ہے۔ اس کتاب کے حصہ اول میں اسلام کے فلسفہ سیاست کو بیان کیا گیا ہے۔ باب اول دین و سیاست کے عنوان سے ہے

جس میں مذہب کا اسلامی تصور، اسلامی ریاست کیوں، اسلام اور اقتدار، دین وسیاست کی تفریق کا باطل نظریہ، تفریق دین وسیاست کا دفاع اور اس کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب دوم اسلام کے سیاسی نظریہ کو بیان کرتا ہے۔ باب سوم میں قرآن کا فلسفہ سیاست، باب چہارم میں معنی خلافت اور باب پنجم میں اسلامی تصور قومیت کو بیان کیا ہے۔ حصہ دوم میں اسلامی نظم مملکت: اصول اور نظام کار کو واضح کیا ہے۔ اس حصہ میں اسلامی ریاست کی بنیادوں کے ضمن میں عقائد و نظریات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

7 ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب "اسلامی ریاست عہد رسالت کے طرز عمل سے استشہاد" کے عنوان سے ہے۔ یہ کتاب تعارف کے بعد 7 ابواب پر مشتمل ہے جس کے 172 صفحات ہیں۔ پہلا باب مملکت اور نظم ونسق کے عنوان سے ہے۔ دوسرے باب میں نظام مالیہ و تقویم پر روشنی ڈالنے کے بعد نظام تشریع وعدلیہ، دفاعی نظام، غزوات، نظام تعلیم، سرپرستی علوم، تبلیغ اسلام اور قانون بین الممالک کو ذکر کیا ہے۔

8 اسلام کا سیاسی نظام: مفتی محمد سراج الدین کا مرتب کردہ مقالات کا مجموعہ ہے جو اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے زیر اہتمام 28، 29 اپریل 2012ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اسلام کے نظام سیاست کے عنوان سے منعقدہ سیمینار میں پیش کیے گئے۔ مقالات کے موضوعات اور محققین کے نام درج ذیل ہیں:

- کلیدی خطبہ، اسلام کا سیاسی نظام: — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
- اسلام کا سیاسی نظام — ڈاکٹر عبد الخالق
- انتخابی نظام، اسلامی ہدایات کی روشنی میں — محمد تنزیل الصدیقی الحسینی
- انتخابات اور اسلامی ہدایات — مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی
- خلافت - علی منہاج النبوۃ - خصوصیات وامتیازات — ڈاکٹر و مفتی محمد شاہ جہان ندوی
- آزاد عوامی حکومت - اسلامی تصور — مولانا اختر امام عادل قاسمی
- اسلام میں حکمران کے انتخاب کا طریقہ — پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی
- اسلامی مملکت میں حکمرانوں کا احتساب — مولانا سید احمد ومیض ندوی
- حکمرانوں کا احتساب ایک فریضہ ہے — پروفیسر محسن عثمانی ندوی
- اسلامی مملکت میں حکمرانوں کا احتساب — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
- اسلامی مملکت میں رعایا کے حقوق — مفتی راشد حسین ندوی
- اسلامی مملکت میں رعایا کے حقوق — محمد طارق محمود نیازی

- اسلامی مملکت میں آزاد عدالتیں — مولانا محمد راشد قاسمی
- اسلامی مملکت میں آزاد عدالتیں — مولانا محمد ضیاءالدین
- اسلامی عدل کی حکمرانی اندلس کی تاریخ، اموی قضاء کا ایک جائزہ — عبرت جہان
- غیر اسلامی ریاست میں حصہ داری علامہ یوسف قرضاوی کی آراء کی روشنی میں — مسعود عالم فلاحی
- اسلامی سیاسی فکر جدید اسلامی فکر کے تناظر میں — ڈاکٹر غطریف شہباز
- میثاق مدینہ کی سیاسی اہمیت- عہد حاضر میں — ظفر دارک قاسمی
- اسلامی تناظر میں انسانی حقوق اور خاص کر اقلیتی حقوق کا تحفظ — عبدالخالق کامل
- کیا جمہوریت اور اسلام کے سیاسی نظام میں مطابقت ممکن ہے؟ — ڈاکٹر سید عبدالباری
- اسلامی شوریٰ اور اس کا دائرہ اختیار — ڈاکٹر عبیداللہ فہد
- شراکتِ اقتدار اور اسلام (بعض علماء اور دانشوروں کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ) — ڈاکٹر ضیاءالرحمن

9 محمد ارشد کا ایچ ڈی مقالہ "اسلامی ریاست کی تشکیل جدید، محمد اسد کے افکار کا تنقیدی جائزہ" پنجاب یونیورسٹی، 2008ء۔

10 اسلامی ریاست کے اساسی اصول و تصورات، مولانا سید محمد داؤد غزنوی 1979ء۔

11 مسلمانوں کا نظم مملکت، مترجم: مولوی علیم اللہ صدیقی۔

12 نفاذ شریعت اور اس کے مسائل، مفتی تقی عثمانی۔

13 مقدمۃ فی التاریخ (مقدمہ ابن خلدون)، عبدالرحمان بن محمد بن خلدون۔

14 البدایۃ والنہایۃ، حافظ عمادالدین ابن کثیر۔

15 تاریخِ مسلمانانِ عالم، پروفیسر محمد رضا خان۔

16 خليف، محمد صالح أحمد، **مقومات الدولة الإسلامية في ضوء وثيقة (دستور) المدينة المنورة**، الفرائد في البحوث الإسلامية والعربية، Article 35, Volume 35, Issue1, 2018, Page 2137-2236

17 الاحکام السلطانیۃ، امام ابو الحسن علی بن محمد الماوردی، 364ھ–450ھ۔

18 Al mujahid, sharif, **idelogical foundation of pakistan**, shari'ah academy, international islamic university islamabad, 2nd adition 2012.

19 Rubya Mehdi **The Islamization of the Law in Pakistan (RLE Politics of Islam).**Edition:1st,First Published1994, eBook Published 8 May 2013. London.

20 **Sharia Incorporated. A Comparative Overview of the Legal Systems of Twelve Muslim Countries in Past and Present**.Publisher: Leiden University Press.

جواز تحقیق: (Rationale of The Study)

اسلامی ریاست کے عنوان سے بہت سی کتابیں اور رسالے لکھے گئے ہیں جن میں اسلامی ریاست کے مختلف پہلوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ نظمِ مملکت چلانے کے لیے ریاست کا ادارہ ہر زمانہ میں ناگزیر رہا ہے۔ علماء و محققین نے وقت اور حالات کے تقاضوں کے پیش نظر اسلامی ریاست کے مختلف پہلوں کو اجاگر کیا ہے لیکن شرعی احکام کے نفاذ میں اسلامی ریاست کے فرائض واختیارات کیا ہیں اس پہلو پر کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ زیر نظر مقالہ میں اسلامی ریاست کے شرعی احکام کی تنفیذ میں کردار کے حوالہ سے بحث کی گئی ہے۔ شرعی احکام کی تنفیذ میں اسلامی ریاست کے فرائض واختیارات ایک جامع موضوع ہے جس میں عبادات، معاملات اور معاشرت تمام پہلوں میں شرعی احکام کی تنفیذ کا احاطہ کیا گیا ہے جو یقیناً اپنی ضرورت، انفرادیت اور افادیت کی وجہ سے انفرادی نوعیت کا کام ہے۔ موجودہ دور جو مادی ترقی کے انتہائی عروج کا دور ہے اور قرب قیامت کی وجہ سے دین سے دوری بھی بڑھتی جارہی ہے۔ شرعی احکام کو پس پشت ڈالا جارہا ہے۔ ایسے حالات میں پاکستانی ریاست جو اسلام کے مقدس نام سے معرضِ وجود میں آئی ہے اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے فرائض واختیارات کو پہچان کر شرعی احکام کے نفاذ میں اپنا کردار ادا کرے۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بشری کمزوریوں کے باعث کوئی بھی تحقیق حتمی نہیں ہوسکتی بلکہ اس میں ارتقاء اور بہتری کی گنجائش تو ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

بیان مسئلہ:(Statement of the Problem)

- انسانی معاشرے کا تحفظ اور اس کی بقا ریاست کی تشکیل پر ہی منحصر ہے۔
- ریاست انفرادی اور اجتماعی سطح پر لوگوں کے جان ومال کے تحفظ اور امن وسلامتی کو یقینی بنانے کے ساتھ نظم وضبط کا بھی انتظام کرتی ہے۔
- ریاست کی تشکیل کی بدولت ہی ہر شخص بیرونی اور اندرونی خطرات سے مامون ہو کر اپنے فرائض سرانجام دے سکتا ہے۔
- پاکستان کا قیام اسلامی ریاست کے طور پر ہوا لہذا اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے فرائض اور اختیارات کو پہچان کر ایسے اقدامات کرے کہ معاشرہ اسلامی اصولوں پر استوار ہو۔ معروفات کی اشاعت ہو اور منکرات کا سدباب ہو۔

ضرورت واہمیت:(Significance of the Study)

یہ موضوع بہت اہمیت کا حامل ہے کہ پاکستانی ریاست شرعی احکام کی تنفیذ میں اپنی ذمہ داریوں اور اختیارات کو پہچان کر فرائض سرانجام دے۔ کیونکہ ریاست کی صرف یہی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ معاشرے کے بگاڑ کو درست کرے اور منکرات کا خاتمہ کرے بلکہ اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے اقدامات کرے کہ کسی قسم کا فساد پیدا ہی نہ ہو۔ وہ ان اسباب کا بھی سد باب کرے جو معاشرے کو فساد کی طرف لے جانے والے ہیں۔ اور اس کے ساتھ معروفات کی اشاعت و تنفیذ کے اسباب بھی پیدا کرے۔ موجودہ دور میں دین کو انفرادی اور ذاتی معاملہ بنا کر عبادت گاہوں تک محدود کیا جارہا ہے۔ شخصی اور رائے کی آزادی کے نام پر شعائر اسلام کی توہین اور اس کا مذاق اڑانا معمول بن گیا ہے۔ دین چند عبادات اور رسومات کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک پورا نظام زندگی ہے جو انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر فرد کو کچھ اصولوں، قاعدوں اور ضابطوں کا پابند بناتا ہے۔ ایسے حالات میں ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوے شرعی احکام کی تنفیذ کرے، منکرات کا سد باب کرے اور معاشرے کو اسلامی اصولوں کے مطابق استوار کرے۔

مقاصدِ تحقیق:(Objectives of the Study)

1- شرعی احکام کی تنفیذ میں اسلامی ریاست کے فرائض واختیارات کی کھوج لگانا۔
2- شرعی احکام کی تنفیذ میں ریاست پاکستان کے فرائض واختیارات کا تجزیہ کرنا۔
3- پاکستان میں شرعی احکام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا جائزہ لینا۔
4- پاکستان میں شرعی احکام کی تنفیذ کے لیے لائحہ عمل تجویز کرنا۔

سوالاتِ تحقیق:(Research Questions)

1- شرعی احکام کی تنفیذ میں اسلامی ریاست کے فرائض کن اصولوں کے تحت انجام پاتے ہیں؟
2- شرعی احکام کے نفاذ کے لیے اسلامی ریاست اپنے اختیارات کو کس حکمتِ عملی کے تحت استعمال کرتی ہے؟
3- پاکستان میں شرعی احکام کی تنفیذ میں تحدیات کی نوعیت کیا ہے؟
4- پاکستان میں شرعی احکام کی تنفیذ کی راہ میں حائل چیلنجز کو کن اقدامات کے ذریعے ختم کیا جاسکتا ہے؟

منہج تحقیق:(Research Method)

مقالہ ہذا کا منہج تجزیاتی Analytical study ہے اور qualitative approach ہے

بنیادی اور ثانوی ماخذ سے بقدر ضرورت استفادہ کیا گیا۔ بنیادی ماخذ میں قرآنِ حکیم، سیرت النبویۃ۔

کتب تفاسیر: **معالم التنزیل**، امام بغوی 516ھ، **مفاتیح الغیب**، امام فخر الدین الراضی 606ھ، **تفسیر ابن کثیر**، امام ابن کثیر 774ھ۔

کتب سیرت: **السیرۃ النبویۃ**، امام ابن ہشام 213ھ، **الطبقات الکبریٰ**، امام ابن سعد 230ھ، **تاریخ الرسل والملوک**، ابن جریر الطبری 310ھ۔ (تاریخ طبری)

عربی کتب: **الاحکام السلطانیہ**، امام ابوالحسن علی بن محمد الماوردی، 364ھ–450ھ۔ **الحسبۃ فی الاسلام او وظیفۃ الحکومۃ الاسلامیۃ** اور **السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعایۃ**، شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ، 661ھ-748ھ۔

اردو کتب: **اسلامی ریاست**، امین احسن اصلاحی۔ **اسلامی ریاست: فلسفہ، نظام کار اور اصول حکمرانی**، سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

انگریزی کتب:

"Muslim Conduct of State" Dr Muhammad Hamidullah.

"Islamic Ideology" Dr. Khalifa Abdul Hakim.

"The Principles of State and Government in Islam" Muhammad Asad

"The Reconstruction of Religious Thought in Islam" Dr Muhammad Iqbal.

Digital Sources اور برقی ذرائع کو اختیار کیا گیا ہے جیسے: مکتبہ شاملہ وغیرہ

Encyclopedia Britannica.
The Encyclopedia of World Religions.
Stanford Encyclopedia of Philosophy.

ابواب وفصول کی تقسیم وترتیب

باب اول: اسلامی ریاست کی حیثیت سے پاکستان کی تشکیل اور شرعی احکام کی تنفیذ میں اس کے فرائض واختیارات

فصل اول: اسلامی ریاست کی حیثیت اور احکام کی تنفیذ میں اس کا کردار

فصل دوم: پاکستان کا قیام اور اس کا تاریخی وتہذیبی پس منظر

فصل سوم: شرعی احکام کی تنفیذ میں ریاست پاکستان کے فرائض واختیارات

باب دوم: عبادات سے متعلق اسلامی احکام کی تنفیذ

فصل اول: نماز اور زکوۃ سے متعلق امور

فصل دوم: روزہ اور حج کے معاملات

باب سوم: تعلیمی امور میں اسلامی احکام کی تنفیذ

فصل اول: اختلاف رائے کے احترام سے متعلق معاملات

فصل دوم: مخلوط تعلیم

فصل سوم: غیر نصابی سرگرمیاں

باب چہارم: سماجی امور میں احکام اسلامی کی تنفیذ

فصل اول: پردہ ولباس سے متعلق امور

فصل دوم: سوشل میڈیا

فصل سوم: جنسی مصنوعات کی فروخت

باب پنجم: معاشی امور میں احکام اسلامی کی تنفیذ

فصل اول: مہنگائی

فصل دوم: نظام اراضی

فصل سوم: سرکاری املاک کی آبادکاری

باب ششم: احکام اسلام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹیں اور ان کا حل

فصل اول: احکام اسلام کی تنفیذ کی کوششوں کا جائزہ

فصل دوم: احکام اسلام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹیں

فصل سوم: شرعی احکام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کے خاتمے کے لئے تجاویز

باب اول: اسلامی ریاست کی حیثیت سے پاکستان کی تشکیل اور شرعی احکام کی تنفیذ میں اس کے فرائض واختیارات

فصل اول: اسلامی ریاست کی حیثیت اور احکام کی تنفیذ میں اس کا کردار

فصل دوم: پاکستان کا قیام اور اس کا تاریخی و تہذیبی پس منظر

فصل سوم: شرعی احکام کی تنفیذ میں ریاست پاکستان کے فرائض واختیارات

فصل اول: اسلامی ریاست کی حیثیت اور احکام کی تنفیذ میں اس کا کردار

فصل اول: اسلامی ریاست کی حیثیت اور احکام کی تنفیذ میں اس کا کردار

اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد اللہ کے اوامر کی تنفیذ اور اس کی شریعت کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا ہے۔ اصطلاحی تعریف میں: "خلافت دین کی حفاظت اور دنیا کی حکمرانی میں نبوت کے قائم مقام ہوتی ہے۔"[1] اس ذمہ داری کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے: ﴿ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ أَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا۟ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَمَرُوا۟ بِٱلْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا۟ عَنِ ٱلْمُنكَرِ[2]﴾ وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین پر حکومت عطا کریں تو وہ نماز اور زکوٰۃ (کے نظام) کو قائم کریں اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔

یہ آیت کریمہ حکومت کی ذمہ داریوں اور اوامر واحکامِ الٰہی کی اشاعت کے بارے میں ریاست کے کردار کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اسی آیت کریمہ سے مفسرین، خلفاء راشدین کی حقانیت پر استدلال کرتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ وہ اوامر کی تنفیذ میں کسی قسم کی لچک نہیں دکھاتے تھے، یوں ایک اسلامی ریاست کے قیام کا بنیادی مقصد اللہ کی زمین پر اللہ کے نظام کو نافذ کرنا ہے۔ جس ریاست میں اللہ کے احکام کی تنفیذ نہ ہو وہ حقیقی اسلامی ریاست نہیں کہلا سکتی۔ پاکستان کا قیام اسلام کے نام پر ہوا۔ برصغیر کے مسلمانوں کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ ایک ایسی آزاد مملکت ہو جہاں مسلمانانِ ہند آزادانہ طور پر اپنے دین اور شریعت کے مطابق زندگیاں گزار سکیں۔

یوں تو برصغیر پر صدیوں مسلمانوں نے حکومت کی لیکن چونکہ اس خطہ میں مختلف قومیں آباد تھیں جن کے رسم ورواج، معاشرت اور معاملات مسلمانوں سے جدا تھے۔ مسلمان اپنی عبادات، نکاح طلاق، پرسنل لاء اور وراثت وغیرہ کے انفرادی معاملات میں تو باسہولت عمل پیرا تھے لیکن اجتماعی زندگی کے متعلق امور جیسے سیاست، معاشرت، معیشت اور ثقافت میں بھی اسلامی اصولوں کی تنفیذ کے خواہاں تھے۔ اس اعتبار سے دو قومی نظریہ کا تصور پیش کیا گیا جس کی رو سے مسلمانوں کو ایک قوم اور باقی تمام برادریوں کو ایک قوم شمار کیا گیا اور مسلمانوں نے اپنے لیے ایک الگ ریاست کی جد وجہد شروع کی جس کے نتیجے میں پاکستان 1947ء میں ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے معرض وجود میں آیا لیکن آج 75 سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود پاکستان میں اسلامی شریعت کا نفاذ نہیں ہو سکا، جس کے اسباب کے بارے میں ہم اس مقالہ کے آخری باب میں تفصیل سے بحث

---

[1] تفتازانی، سعد بن عمر، **شرح العقائد النسفیہ**، (میر محمد کتب خانہ کراچی)، ص108

[2] الحج:45

کریں گے۔اس باب میں ہم اسلامی ریاست کی حیثیت، پاکستان کا اسلامی ریاست کی حیثیت سے قیام اور اس کا تاریخی پس منظر اور شرعی احکام کی تنفیذ میں پاکستانی ریاست کے فرائض واختیارات کو زیر بحث لائیں گے۔

ریاست:

عربی زبان کے لفظ "رئیس" سے لفظ "ریاست" وجود میں آیا ہے جس کے معنی ہیں سردار یا سربراہ۔انگریزی زبان میں ریاست کا مترادف "state" ہے جو لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "عوامی معاملات کا قیام کرنا" ہے۔ارسطو کے نزدیک ریاست کی تعریف یہ ہے:

"The state is a union of families and villages having for its end a perfect and self-sufficing life[1]".

انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کے مطابق ریاست کی تعریف یہ ہے:"یہ انسانوں کا وہ عظیم گروہ ہے جو مشترکہ مقاصد کے لیے مل جل کر کام کرے"۔[2]

شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں ریاست کے تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اہل مدینہ سے مراد لوگوں کی وہ جماعت ہے جو ایک ہی نظام تمدن کے تابع اور پابند ہوں اور باہم مل جل کر اجتماعی زندگی بسر کریں۔اس جماعت کو اگرچہ وہ مختلف شہروں میں رہتے ہوں شخص واحد سمجھا جاتا ہے۔"[3]

ریاست کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں جن کی رو سے ریاست اپنے وجود میں جن امور کی محتاج ہے ان میں سب سے بنیادی بات ایک انسانی معاشرے کا میسر ہونا ہے جو ایک مخصوص علاقہ پر قابض ہو، وہ داخلی اعتبار سے بااختیار ہو اور خارجی اعتبار سے بھی خود مختار ہو۔اس کے پاس ایک ایسا سیاسی ادارہ (گورنمنٹ) ہو جو اس کے ارادوں اور احکامات کی تنفیذ کر سکے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کر سکے۔گویا ریاست کی تشکیل کے لیے چار عناصر عوام، علاقہ، حکومت اور اقتدار اعلیٰ کا ہونا ضروری ہے۔

ریاست اور حکومت میں فرق:

حکومت ریاست کا ایک اہم ادارہ ہے جو ریاست کے اعلیٰ اختیارات کا استعمال کرتا ہے اور جس کے ذریعے ریاست اپنے احکامات جبری طور پر منوا سکتی ہے۔ریاست میں قانون سازی، قوانین کے نفاذ اور ان کی تشریح کے فرائض حکومت ہی کے تین شعبے یعنی

---

[1] محمد امین جاوید، پروفیسر، **تعارف مدنیت**، (ایوان ادب: لاہور، 1992ء)، ص 91

[2] **Encyclopaedia of Social Sciences** 14/328 Newyork.

[3] شاہ ولی اللہ، **حجۃ اللہ البالغہ**، مترجم: مولانا خلیل احمد، (کتب خانہ شان اسلام، اردو بازار لاہور)، ص 34

مقننہ، عاملہ اور عدلیہ سرانجام دیتے ہیں۔ جس طرح کسی منتظم کے بغیر کوئی معاشرہ قائم نہیں رہتا اسی طرح ریاست کا وجود بھی حکومت ہی کا مرہون منت ہے۔ ریاست کا اہم ادارہ ہونے کے باوجود حکومت بذات خود ریاست کہلانے کا دعویٰ نہیں کر سکتی کیوں کے دونوں میں واضح فرق ہے۔

* حکومت ریاست ہی کا ایک حصہ ہے۔
* حکومتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں جب کہ ریاست ایک مستقل ادارہ ہے۔
* حکومت کی کئی اقسام ہوتی ہیں مثلاً صدارتی و پارلیمانی طرز حکومت وغیرہ، لیکن ریاست کی طبعی خصوصیات ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہیں۔[1]

ریاست کا جدید تصور:

جدید تصور ریاست کی بنیاد دراصل اس نظریے پہ ہے کہ ریاست ایک منظم اجتماعیت ہے جو کسی خاص علاقے میں موجود انسانوں کا ایسا معاشرہ جن کے اختیارات، حاکمیت، افراد کے گروہ یعنی حکومت کے پاس ہوں اور وہ اس معاشرے میں اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو۔

جدید ماہرین سیاست کی رائے میں ریاست کے بنیادی عناصر چار ہیں: علاقہ، آبادی، حکومت، اقتدار اعلیٰ، جن کے بغیر کسی اجتماعِ انسانی کو ریاست نہیں کہا جا سکتا ہے۔ جدید جمہوری فکر میں ریاست کو انسان کا تخلیق کیا ہوا ادارہ قرار دیا گیا ہے جو انسانی معاہدہ عمرانی کے تحت معرضِ وجود میں آیا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان نے ریاست اپنے مفاد کے حصول کے لیے تشکیل دی ہے۔ لہذا اس پر حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا اختیار بھی انسان ہی کو حاصل ہے۔

یورپ میں سولہویں صدی عیسوی کی نشاۃ ثانیہ اور تحریک اصلاح کے نتیجے میں سلطنت روما مذہب و ریاست کا اتحاد ختم ہو گیا اور اس طرح ریاست پہ چرچ یعنی مذہب کی گرفت ختم ہو گئی اور اس طرح ریاست کے لیے تخلیق ربانی کا تصور بھی مدہم پڑ گیا۔[2]

اسلامی ریاست کی حیثیت اور اس کی بنیادیں:

اسلامی ریاست سے مراد وہ ریاست ہے جہاں دین اسلام کے قوانین نافذ ہوں، حاکمِ ریاست عوام کا منتخب کردہ ہو، جہاں نماز اور

---

[1] بشیر احمد، محمد، **اسلام میں فلاحی ریاست کا تصور: دور نبوی ﷺ اور خلافت راشدہ کے تناظر میں**۔ مقالہ برائے ایم فل، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز۔ 2014ء، ص 11۔

[2] طارق، فرید الدین، **عصر حاضر میں اسلامی ریاست کی تشکیل، تحقیقی جائزہ مسلم مفکرین کے افکار کی روشنی میں**، مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، 2016ء، ص 19۔

زکوۃ کا مکمل نظام رائج ہو۔" سربراہ حکومت عوام کا خادم ہو اور عوامی نمائندے صوم وصلوۃ کے پابند اور باکردار ہوں۔ بیت المال کا مکمل نظام رائج ہو جس سے ریاست کے ناداروں، غرباء، یتیموں اور بیواؤں کی امداد کی جاتی ہو۔"[1]

اسلام کی آمد سے قبل عمومی طور پر پوری دنیا میں انسانی معاشرہ اخلاقی اعتبار سے انتہائی پستی اور زوال کا شکار ہو چکا تھا۔ حکومتیں عدل وانصاف کے بجائے ظلم وجبر، آمریت، مطلق العنان اور کشت وخون کی بنیاد پر قائم تھیں۔ ریاست کا استحکام طاقت کے زور پر تھا۔ مخالفین کو تمام اختیارات سے محروم کرنے کو کمال سمجھا جاتا تھا۔ ذہنی اور سیاسی خلفشار عروج پر تھا۔ غرض عالم انسانی کا نظامِ فکر وعمل مجموعی طور پر منتشر اور پراگندہ تھا۔ خاص طور پر اسلام کا جس علاقہ میں ظہور ہوا یعنی جزیرہ نما عرب، وہ ایسی سر زمین تھی جس میں اجتماعیت اور مرکزی حکومت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ لوگ اجتماعیت سے ناواقف تھے۔ ملی وحدت پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ ہر طرف انتشار ہی انتشار تھا۔ عوام قبائل میں بٹے ہوئے تھے اور قبائلی جنگوں کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ جاری تھا۔ ایسے حالات میں یہ بات تصور کرنا بھی مشکل تھی کہ کوئی انسانیت کا نجات دہندہ بھی آئے گا جو اس کشتی کو بھنور سے نکال سکے گا اور دنیا کو غیر الٰہی حکومت، جبر واستعداد، ظلم اور مطلق العنانیت کے حلقہ تنگ سے آزاد کرائے گا۔[2] ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا جنہوں نے دین اسلام کی بنیاد پر عرب جاہلیت کے معاشرے کو بدلا اور اس کو یکجا کیا، جس سے ایک نئی ریاست کی بنیاد پڑی جس نے پوری دنیا میں انقلاب برپا کیا۔ ڈاکٹر نثار احمد[3] اس بارے میں لکھتے ہیں:

"سیرت کا مطالعہ کرنے سے مجملاً یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے کام کا نقشہ یوں مرتب کیا:

1۔ پہلے تو دین کی بنیادوں یعنی عقائد کی تعلیم دی۔

2۔ پھر اس تعلیم کی بنیاد پر ایک گروہ منظم کیا اور جب ایک تنظیم بن گئی تو،

3۔ پھر اس کی بنیاد پر ایک ریاست کی تاسیس فرمائی، اسی لیے ہمیں ولہازن کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ "اسلام کا سیاسی اجتماع دینی اجتماع سے ظہور پذیر ہوا"۔[4]

---

[1] محمد وسیم اکبر، شیخ، **"اسلامی ریاست میں ذرائع ابلاغ کا کردار"** (مقالہ برائے پی ایچ ڈی گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان 1994)، ص 134 (ڈاکٹر محمد وسیم اکبر شیخ، گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان میں شعبہ صحافت وابلاغیات میں لیکچرر کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں)

[2] نثار احمد، ڈاکٹر، **عہد نبوی ﷺ میں ریاست کا نشوارتقا**، (نشریات، اردو بازار، لاہور، 2008)، ص 88

[3] (ڈاکٹر نثار احمد ایک ممتاز سیرت نگار، محقق اور مورخ ہیں۔ 1941 کو انڈیا یوپی میں پیدا ہوئے۔ 1976ء میں جامعہ کراچی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 38 برس تک درس وتدریس سے منسلک رہے۔ مختلف موضوعات پر بہت سے تصانیف اور علمی وتحقیقی مقالات شائع کیے۔ علمی خدمات کے اعتراف میں حکومتی سطح پر بہت سے ایوارڈز سے نوازے گئے۔)

[4] نثار احمد، **عہد نبوی ﷺ میں ریاست کا نشوارتقا**، ص 92

آپ ﷺ نے اپنی جد وجہد کا آغاز انفرادی سطح پر عقائد کی درستی سے کیا اور کیونکہ انسانی سیرت کی تعمیر و تخریب کا تمام تر مدار عقائد پر ہی ہوتا ہے۔ عقائد اور افکار اگر مختلف، متضاد اور کمزور ہوں تو پھر کوئی اجتماعی ہیئت نہیں بن سکتی۔ اس لئے آپ ﷺ نے معاشرہ کی اصلاح اور تعمیر نو کے لیے سب سے پہلے عقائد کی تعلیم دی، یہ عقائد اسلامی ریاست کی فکری بنیاد ہیں۔ یہی وہ عقائد ہیں جو لوگوں کے دلوں اور ذہنوں کو بدلنے کا ذریعہ بنے۔ ان عقائد کی وجہ سے ان کے رسم ورواج اور عادات بدلے، آپس میں ہم آہنگی پیدا ہوئی اور دلوں کے جڑنے سے ایک اجتماعیت کی شکل پیدا ہوئی جس نے بالاخر ریاست کو جنم دیا۔

اسلامی ریاست کو فکری بنیادیں فراہم کرنے والے عقائد بذیل ہیں۔

1- توحید: (ایمان باللہ)

عقیدہ توحید تمام عقائد واعمال کی اصل اور سرچشمہ ہے باقی سب عقائد اس کی فرع ہیں۔ اللہ رب العزت کی ذات قدسیہ کو ذات اور صفات میں وحدہ لاشریک ماننا توحید ہے۔ اس عقیدہ کا مطلب صرف وجودِ الٰہی کا اقرار ہی نہیں بلکہ اللہ کی صفات کا بھی مکمل اور صحیح تصور رکھنا ہے۔ اللہ کے وجود کا تصور تو زمانہ جاہلیت میں بھی پایا جاتا تھا مگر اسلام اسے وسیع معنوں میں اقرار اور عمل میں جاگزیں کرتا ہے۔

2- رسالت:

اللہ تعالی نے انسانوں تک اپنے تشریعی احکام پہچانے اور انھیں اپنی مرضی کی راہ بتانے کے لیے انبیاء اور رسل دنیا کے اندر مبعوث فرمائے۔ اللہ تعالی کی ذات وصفات کا علم بھی انبیاء ہی کے ذریعہ ممکن ہوا ہے۔ انبیاء کرام کے سلسلہ کی آخری کڑی جناب محمد ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں۔ آپ ﷺ کی رسالت سارے عالم کے لیے ہے اور آپ ﷺ قیامت تک کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپ ﷺ کے ہاتھوں دین کی تکمیل ہو چکی ہے اس لیے اب نہ کسی نئی شریعت اور نہ کسی نئے نبی ورسل کی گنجائش باقی ہے۔

3- ایمان بالملائکہ:

اللہ تعالی نے مختلف کاموں کو سرانجام دینے کے لیے اپنی نورانی مخلوق فرشتوں کو پیدا کیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ فرشتوں کے متعلق تصورات میں افراط و تفریط میں مبتلا تھے۔ وہ فرشتوں کو اللہ کی اولاد کہتے اور ان کو الوہیت میں شریک قرار دیتے تھے۔ اسلام نے ایک طرف ملائکہ کا صحیح تصور پیش کیا اور دوسری طرف ان کے بارے میں لوگوں کے غلط عقائد کی بھی تردید کی اور بتایا کہ وہ اللہ کی اولاد یا خدائی میں شریک یا لائق عبادت نہیں ہیں۔ قرآن نے واضح فرمایا: "وہ اللہ کے معزز بندے ہیں اطاعت گزار ہیں اور اس کے حکم پر چلتے ہیں اور صرف وہی کرتے ہیں جس کا وہ حکم

دیتا ہے۔"﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ[1]﴾ بلکہ وہ معزز بندے ہیں اور کسی حال میں بھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ یعنی ان کو خدا کی اولاد یا خدائی میں شریک تصور کرنا درست نہیں ہے۔

4- ایمان بالکتاب:

ایمان بالکتاب سے مراد ان کتابوں پر ایمان لانا ہے جو خالق کائنات نے نسلِ انسانی کی راہنمائی کی خاطر اپنے رسولوں پر وحی کے ذریعے نازل کی ہیں۔ جن کی رسولوں نے لوگوں کو تعلیم دی۔ ان کتابوں میں آخری کتاب "قرآن پاک" جو رب العزت نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ پر وحی کے ذریعے نازل کی اور اس کتاب کو "ھدی للناس" قرار دیا ہے۔ اب قیامت تک آنے والے سارے انسان اسی کتاب کو دستور العمل بنا کر دارین کی فلاح پا سکتے ہیں۔ اس کتاب کی حفاظت خود اللہ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔

5- ایمان بالاخرت:

آخرت پر ایمان کا مطلب دنیا کی عارضی حیات کے بعد ہر انسان کو دائمی اور پائیدار زندگی عطا کی جائے گی جس کی انتہا کوئی نہیں ہو گی۔ اس اخروی اور دائمی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا دار مدار اس دنیا کی عارضی اور مختصر زندگی کے اعمال پر ہے۔ "انسان نے جو کچھ کمایا ہے ایک دن اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضر ہونا ہے، جہاں اس کا محاسبہ کیا جائے گا۔ اعمال صالح والا عیش و عشرت والی زندگی گزارے گا اور برے اعمال والوں کا ٹھکانہ جہنم قرار پائے گا۔"[2]

یہ وہ بنیادی عقائد ہیں جن کی تعلیمات نے ایک منتشر اور پراگندہ معاشرے کو مجتمع کیا اور ایسا سنوارا کہ رہتی دنیا کے لیے مثال بن گیا۔ انھیں بنیادوں پر اسلام کا تہذیبی و تمدنی، معاشی و معاشرتی اور سیاسی نظام قائم ہے اور انھیں بنیادوں پر اسلامی ریاست کی عمارت تعمیر کی گئی۔

اسلام جس طرح عقائد و عبادات اور حسن اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اسی طرح معاشرت، معاملات، معیشت، تمدن، سیاست اور زندگی کے جملہ معاملات کے بارے میں واضح احکام و ہدایات فراہم کرتا ہے۔ اسلام دین اور سیاست کی تفریق کا کوئی تصور نہیں رکھتا اسی لیے مسلمان نے ہمیشہ اپنی حکومت کو اسلامی اصولوں اور اخلاقی ضابطوں پر قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ایک اسلامی ریاست قائم ہو جہاں مسلمان عقائد، عبادات اور حسن اخلاق کے ساتھ ساتھ اسلام کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی اصولوں پر بھی عمل کر سکیں۔

---

[1] الانبیاء:26

[2] نثار احمد، عہد نبوی ﷺ میں ریاست کا نشو و ارتقا، ص94-103

پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

"اسلام ایک قانون شہادت دیتا ہے۔ اس کا اپنا فوجداری اور دیوانی قانون ہے۔ وہ تجارت اور معاملات کے لیے قانونی ہدایات دیتا ہے۔ وہ نکاح و طلاق، وراثت و وصیت، بیع و ھبہ کے لیے قوانین دیتا ہے۔ اگر حکومت و اقتدار اس کو عطاء نہ ہو تو اس کی شریعت کا ایک حصہ معطل، بے کار اور نا قابل عمل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اسلام اور حکومت دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔"[1]

اسلامی ریاست کی انتظامی تشکیل:

اسلامی ریاست کی تنظیم و تشکیل کا پہلا مرحلہ فکری بنیادوں پر قائم ہے۔ آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے پہلے عقائد و نظریات کی تعلیم دی۔ یعنی عقائد و نظریات کا وجود پہلے ہے اور ریاست بعد میں قائم ہوتی ہے۔ یہ بات عمومی سیاسی فلسفہ سے مختلف تھی کیوں کہ وہاں ترتیب یہ نظر آتی ہے کہ پہلے سوسائٹی یا ریاست کا قیام عمل میں آتا ہے اور پھر اس کے زیر اثر نظریات اور اصول و ضوابط ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حالات کے تغیر و تبدل سے جب معاشرہ یا ریاست کی ہیت میں تغیر آتا ہے تو ساتھ سیاسی نظریات میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ اس کے برعکس ریاست نبوی ﷺ کے سیاق و سباق میں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ یہاں معاشرہ اور ریاست کا ظہور عقائد و نظریات کا مرہون منت ہے لہذا یہاں ریاست کی ہیت میں تغیر سے عقائد و نظریات میں تغیر کا کوئی امکان نہیں رہتا ہے۔

دوسری بات آپ ﷺ نے معاشرہ کے افراد کے اتحاد و یگانت کے لیے دین کو بنیاد بنایا اور مروجہ سیاسی و معاشرتی اتحاد کی بنیادوں یعنی زبان، رنگ، نسل، وطن، اور قومیت سے صرف نظر کیا، بلکہ ان تمام معیارات اور بنیادوں کو باطل قرار دیا اور اس کے ساتھ ہر قسم کی عصبیت کو بھی حرام ٹھرایا۔ آپ ﷺ چونکہ ایک عالمگیر پیغام کے علمبردار تھے اور یہ امتیازات انسانیت کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے ایک عالمگیر معاشرہ کے قیام میں بڑی رکاوٹ کھڑی کر دیتے۔ اس لیے آپ ﷺ نے ان معیارات باطلہ سے صرف نظر کرتے ہوئے عقیدہ، ایمان اور دین کی بنیاد پر معاشرہ کو منظم کیا کیوں کہ آپ ﷺ کا مقصد ہی انسانیت کو ایک امت بنانا تھا۔

---

[1] خورشید احمد، پروفیسر، **اسلامی نظریہ حیات**، (شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، 1982) ص 470

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى أَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَى[1]))خبردار کوئی فضیلت نہیں ہے کسی عربی کو عجمی پر نہ کسی عجمی کو عربی پر، کسی گورے کو کالے پر نہ کسی کالے کو گورے پر سوائے تقویٰ کی بنیاد کے۔

آپ ﷺ کے مقصد کی وضاحت کرتا ہے۔عام طور پر مادیت کو معاشرہ کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔یعنی انسان کی ساری جدوجہد کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کو بنیادی انسانی ضروریات یعنی کپڑا، مکان اور روٹی وغیرہ میسر آجائیں جبکہ آقاء نامدار ﷺ نے اس کے برعکس معاشرہ کو روحانی بنیادوں پر قائم کیا اور اصل ہدف آخرت کی فلاح کو سامنے رکھا۔

رسول اقدس ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز((يَاأَيُّهَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَا اِلَهَ اِلَّا اللهُ تُفْلِحُوْنَ[2]))"اے لوگو! لاالہ الا اللہ کہہ دو کامیاب ہو جاؤ گے" سے کیا۔جو شخص بھی اس دعوت کو قبول کر لیتا وہ ایک نئی برادری کا رکن بن جاتا۔چاہے وہ کسی زبان، رنگ، نسل یا وطن سے تعلق رکھتا ہو۔جو اس حق کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا چاہے وہ کسی بھی زبان، رنگ، نسل یا وطن سے تعلق رکھتا ہو وہ اس رکنیت سے محروم رہتا۔یہی وجہ ہے کہ عرب کے قبائل جو صدیوں سے آپس میں برسرپیکار تھے، وہ اس دعوت حق کو قبول کرتے ہی اپنی تمام تر عداوتوں کو بھلا کر صرف دینی رشتے کے تحت ایک نئے مرکز پر جمع ہوتے گے۔یوں عقیدہ کی بنیاد پر ایک نئے معاشرہ کا آغاز ہو گیا اور ایک عظیم اسلامی ریاست کی راہ ہموار ہوئی جس کا سنگ بنیاد ہجرت مدینہ سے قبل ہی بیعت عقبہ کے موقع پر رکھ دیا گیا تھا اور ہجرت کے بعد عقد مواخاۃ کے ذریعہ اسے ایک منظم معاشرہ کی شکل دی گئی۔یوں ایک مخصوص اراضی پر میثاق مدینہ کے عنوان سے باقاعدہ ایک نظریاتی ریاست کا قیام عمل میں آگیا۔ڈاکٹر نثار احمد رقم طراز ہیں:

"دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کسی ریاست کا قیام تھوڑی بہت قوت استعمال کیے بغیر ہوا ہو لیکن یہ تاریخ کی ایک بڑی حقیقت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے بلکل اجنبی ماحول میں، باہم متضاد و منتشر عناصر کے تعاون سے نہ صرف ریاست بلکہ ایک نظریاتی ریاست کو قائم فرمایا۔پھر خاص بات یہ ہے کہ اس تعاون کو آپ ﷺ نے کسی طاقت و تشدد یا ظلم و جبر کے بل بوتے پر نہیں بلکہ محض ایک نوشتہ کے ذریعے حاصل کیا تھا۔"[3]

---

[1] احمد ابن محمد بن حنبل، امام، **مسند احمد**، (دار السلام للنشر والتوزیع، طبع اولی، فروری 2013ء) ح: 2297 شعیب الارنؤوط مسند احمد کی تحقیق میں فرماتے ہیں: اسنادہ صحیح۔

[2] ایضاً: (بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی للطباعۃ والنشر، 1398ھ/1987ء) ح: 14119 شعیب الارنؤوط مسند احمد کی تحقیق میں فرماتے ہیں: صحیح لغیرہ۔

[3] نثار احمد، **عہد نبوی ﷺ میں ریاست کا نشوو ارتقا**، ص 157

اس منشور کی شقوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام اس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں معروفات فروغ پائیں اور منکرات کا استحصال ہو۔ چناچہ اسلامی ریاست کے فرائض و مقاصد کا تعین کرتے ہوئے قرآن پاک میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ أَقَامُوا ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا ٱلزَّكَوٰةَ وَأَمَرُوا بِٱلْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ ٱلْمُنكَرِ[1]﴾ وہ لوگ کہ اگر ہم انھیں زمین میں حکومت عطا کریں تو وہ نماز اور زکوۃ کے نظام کو قائم کریں اور نیکی کا حکم دیں اور برائیوں سے منع کریں۔ یعنی ریاست کے بنیادی تصور کو پیش کرتے ہوئے اس کے مقاصد کو بھی واضح کیا ہے کہ ریاست کا دائرہ عمل محدود نہیں ہے بلکہ وہ ایک مخصوص نقطہ نظر کے مطابق پوری زندگی کی اصلاح کرنا چاہتی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں کی اصلاح اور انتظام کے لیے آپ ﷺ نے اداروں کی کثرت کے بجائے ان کی کارگردگی کو بہتر بنانے پر توجہ دی اور ان اداروں کے فرائض سرانجام دینے کے لیے ایسے افراد کا انتخاب کیا جو علم و تجربہ میں پختہ اور باصلاحیت و باکردار تھے اور یہ ادارے ریاست کے مقاصد بالا کو پورا کرنے کے لیے قائم کیے تھے۔

اسلامی ریاست کے امتیازات اور خصوصیات:

اپنے ظاہری ڈھانچے اور اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے ایک عام ریاست اور اسلامی ریاست میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ جس طرح ایک عام ریاست اپنے وجود میں جن چند امور کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح اسلامی ریاست بھی ان ساری چیزوں کی محتاج ہوتی ہے۔ اس پہلو سے تو ان میں کوئی خاص فرق نہیں البتہ اصول اور مقاصد کے اعتبار سے عام ریاست اور اسلامی ریاست کا کوئی تقابل نہیں ہے۔ اسلامی ریاست کی امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

اقتدار اعلی اور حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے:

اسلامی ریاست کی بنیاد ہی اس عقیدہ پر ہے کے زمین پر اصل حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے چاہے وہ تکوینی حکومت ہو یا تشریعی حکومت ہو انسان کی حیثیت صرف نائب کی ہے۔ یعنی اللہ رب العزت اکیلے ہی کائنات کے بنانے والے، مالک اور حاکم ہیں۔ اس لیے اللہ رب العزت کو ہی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ نسل انسانی کے لیے نظام زندگی اور قانون تجویز کریں۔ یعنی قانون بنانے اور فراہم کرنے کا اختیار اسی کا ہے جو ساری مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ[2]﴾ خبردار رہو کہ

---

[1] الحج:45

[2] الاعراف:54

مخلوق اسی کی اور حکم بھی اسی کا اور ﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ[1]﴾ اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں اور ﴿فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ[2]﴾ پس حکم تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے اوپر اور بڑا ہے اور ﴿اَلَا لَهُ الْحُكْمُ[3]﴾ سن لو کہ حکم اسی کا ہے۔ سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"اسلام میں حاکمیت خالصۃ اللہ تعالی کی تسلیم کی گئی ہے۔ قرآن عقیدہ توحید کی جو تشریح کرتا ہے اس کی رو سے خدائے وحدہ لاشریک صرف مذہبی معنوں میں ہی معبود نہیں ہے، بلکہ سیاسی اور قانونی مفہوم کے لحاظ سے حاکم، مطاع، امر و نہی کا مختار اور واضح قانون بھی ہے"۔[4]

یعنی اللہ کو حاکم تسلیم کیے بغیر وہ ریاست اسلامی ریاست تصور نہیں ہو گی۔ اسی طرح ڈاکٹر خالد علوی اسلامی ریاست میں حاکمیت کا تصور پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اسلامی ریاست معاہدہ ربانی پر مبنی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نے خدائے واحد سے معاہدہ اطاعت کیا تھا۔ اسلامی ریاست اس معاہدہ پر مبنی معاشرہ منظم کرتی ہے۔ یہ معاہدہ ایسا ہے جس میں ریاست کا ہر فرد مسؤل ہے۔ کوئی شخص اطاعت سے بالاتر نہیں اور کوئی شخص احکام خداوندی سے بغاوت کر کے اسلامی ریاست کی انتظامیہ میں نہیں رہ سکتا۔ قرآن کریم کی رو سے انسانی حکومت کی صرف وہ صورت درست ہے جس میں ریاست خدا اور رسول کی قانونی بالادستی قبول کر کے اپنی حاکمیت سے دستبردار ہو جائے۔ اللہ جو کہ حاکم حقیقی ہے کی نیابت قبول کرے اور اس کے تمام اختیارات ہر حال میں اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کے تابع ہوں گے۔"[5]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَابَ بِٱلْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ ٱلْكِتَابِ وَمُهَيْمِناً عَلَيْهِ فَٱحْكُم بَيْنَهُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ وَلاَ تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ ٱلْحَقِّ[6]﴾ اور اتاری ہے ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ، تصدیق کرنے والی ہے ان کی جو اس سے پہلے تھیں اور ان پر نگران بھی ہے سو آپ ان میں فیصلہ کیجیے جو اتارا اللہ نے اور نہ کریں اتباع ان (کفار) کی خواہشات کی کیوں کہ آپ پر حق واضح ہو چکا ہے۔

---

[1] یوسف:40

[2] مؤمن:12

[3] الانعام:62

[4] مودودی، ابوالاعلیٰ، **اسلامی ریاست**، (اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور)، ص489

[5] خالد علوی، ڈاکٹر، **اسلام کا معاشرتی نظام**، (الفیصل ناشران وتاجران کتب، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور، 285/1

[6] المائدۃ:48

اس آیت شریفہ سے معلوم ہوتا ہے اللہ رب العزت نے جب حق کو واضح کر دیا ہے تو اب تمام معاملات میں اسی کی پیروی کی جائے گی۔ اپنی یا لوگوں کی خواہشات کے مطابق فیصلے کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔ یعنی ریاست اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے شریعت کے احکامات کے مطابق قانون سازی کرے گی اور کسی حال میں بھی اس سے روگردانی نہیں کرے گی۔

رسالت کا نظام:

حاکمیت الٰہی کے ساتھ رسالت کا اقرار بھی لازمی جزو ہے۔ بغیر اس کے اقرار کے توحید کا اقرار بھی مکمل نہیں ہوتا کیوں کے انبیاء اللہ کی حاکمیت تشریعی کے مظہر ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے نمائندے اور سفیر کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لاتے ہیں، لوگوں کو بتاتے ہیں کے اللہ اپنے بندوں کو کن باتوں کو اختیار کرنے اور کن چیزوں سے اجتناب کرنے کا حکم صادر فرماتا ہے اور بندوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے کس ضابطہ حیات کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے انبیاء کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین پر بندوں کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے بغاوت کریں اور ایسا کوئی قانون بنائیں جو اللہ رب العزت اور رسول کریم ﷺ کے فرمان کے خلاف ہو۔ لیکن اللہ نے اپنی تکوینی حاکمیت کی طرح تشریعی حاکمیت پر لوگوں کو مجبور نہیں کیا بلکہ انہیں اختیار دیا ہے۔ اختیار دینے سے مراد ہر گز یہ نہیں کہ حاکمیت ان لوگوں کے سپرد کر دی ہے بلکہ اسی اختیار کو ان کے لیے امتحان و آزمائش بنایا ہے اور اسی کو ان کی کامیابی و ناکامی کا پیمانہ قرار دیا ہے۔ چناچہ ارشاد عزوجل ہے: ﴿وَمَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ[1]﴾ اور جو دیں تم کو رسول سو اس کو اختیار کرو اور جس چیز سے روکیں اس سے باز آجاؤ۔ ہم دو چیزیں حاصل کرتے ہیں ایک کتاب (قرآن حکیم) جس میں اللہ کے قوانین اور احکامات درج ہیں دوسرے قرآن کی تشریح جو رسول خدا ﷺ نے اپنے قول و عمل سے پیش کی ہے۔ قرآن پاک میں اسلامی ریاست قائم کرنے کے تمام اصول بیان کیے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قرآن حکیم کے مطابق عملاً اسلامی ریاست قائم کر کے اسے باقاعدہ چلا کر اور اس کی دیگر تمام تفصیلات بتا کر ہمارے لئے ایک نمونہ پیش کر دیا ہے۔ انہی دو چیزوں (قرآن و سنت) کے مجموعے کا نام اسلامی اصطلاح میں "شریعت" ہے اور اسی شریعت کے مطابق اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے۔ حکم خداوندی ہے کہ: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا[2]﴾ پس قسم ہے آپ کے رب کی

---

[1] الحشر: 7

[2] النساء: 65

وہ ایمان والے نہ ہوں گے حتی کہ وہ آپس کے نزاع میں آپ ﷺ کو حاکم تسلیم نہ کرلیں پھر وہ نہ پائیں اپنے نفس میں کوئی حرج جو آپ نے فیصلہ کرلیا اور اس کو اچھی طرح تسلیم کرلیں۔

اس آیت کریمہ میں ایمان کو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کو دل وجان سے تسلیم نہیں کرتا وہ ایمان والا نہیں کہلا سکتا۔ یہ آیت اس امر کو واضح کرتی ہے کہ اسلامی ریاست کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے فرامین کو قانون سازی میں مقدم رکھتی ہے۔

نظم مملکت:

مسلمانوں نے اپنے نظم مملکت کو کن اصولوں پر استوار کیا یہ تاریخ کا ایک نہایت اہم موضوع ہے۔ دینِ اسلام ایک کامل دین ہے اور مکمل دستورِ حیات ہے۔ جس نے زندگی کے تمام شعبوں میں راہنمائی کرتے ہوئے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر معاشرے کی اصلاح کے لیے زریں اصول وضع کیے ہیں۔ اسلام نے جو نظام سیاست وحکمرانی دیا ہے وہ مغربی جمہوری نظام اور اس کے مفاسد ونقائص سے بلکل پاک ہے۔

اسلام صرف عبادات کا دین نہیں ہے بلکہ معاشرت، معاملات اور اخلاقیات کو بھی بہت اہمیت دیتا ہے۔ اسلام کے جیسے اپنے اقتصادی اصول ہیں اپنا نظامِ معیشت ہے، اسی طرح اپنا نظامِ سیاست وحکومت بھی ہے۔ اسلام میں دین ومذہب اور ریاست وسلطنت سب ساتھ چلتے ہوے ایک دوسرے کی تکمیل کا اور تقاضوں کو پورا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ علامہ ماوردی "الاحکام السلطانیہ" میں لکھتے ہیں:

> "حکومت دین کے کمزور پڑھنے کی وجہ سے کمزور پڑ جاتی ہے اور جب دین کی پشت پناہی کرنے والی حکومت نہیں رہتی تو دین میں بھی خلل آجاتا ہے اور دین کے نشانات بھی ختم ہونے لگتے ہیں۔"[1]

اسلام کی نظر میں دین وسیاست لازم وملزوم ہیں، ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ دین اسلام زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں نے ہر دور میں اپنی حکومت کو اسلامی اصولوں کے مطابق استوار کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ یہ کوشش کرنا مسلمانوں کے دین اور ایمان کا تقاضہ بھی ہے کیوں کہ شریعت اسلامیہ نے حکومت، معاشرت اور تمدن کے بارے میں بھی ایسے ہی واضح احکامات دیے ہیں جیسے کے حسن کردار اور حسن اخلاق کی تعلیم دی ہے۔

---

[1] الماوردی، ابوالحسن علی بن حبیب البصری: **الاحکام السلطانیہ والولایات الدینیہ**، (المطبعۃ المحمدیۃ التجاریۃ بمصر)، ص: 54

اسلامی ریاست میں حاکم یا خلیفہ کی حیثیت:

اسلامی ریاست میں حاکم ریاست کی حیثیت رسول اللہ ﷺ کے نائب اور خلیفہ کی ہے۔ علامہ مودودی خلیفہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "خلیفہ کہتے ہی اس شخص کو ہیں جو کسی ملک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حثیت سے استعمال کرے۔ وہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کا کام مالک کی منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔"[1]

لہذا اس کا یہ فرض بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اور اللہ کے رسول ﷺ کی خود بھی اطاعت کرے اور دوسروں لوگوں کو بھی اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کا پابند کرے۔ اسی وجہ سے اس حاکم کی اطاعت بھی رعایا پر واجب ہے۔ اللہ رب العزت قرآنِ پاک میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ[2]﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور تم میں سے جو اولی الامر ہیں ان کی بھی۔

گویا اولوالامر کی اطاعت سے انحراف کرنا اللہ کی اطاعت سے اور رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری سے انحراف ہے۔ یہ آیت شریفہ اسلامی ریاست کے خلیفہ یا امیر کی حیثیت اور مقام کو واضح کرتی ہے کہ ریاست کے خلیفہ کی اطاعت رعایا پر بلکل اسی طرح واجب ہے جس طرح کے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت واجب ہے۔

اسلام نے اولوالامر کو یہ بلند مرتبہ اور مقام اس لیے دیا ہے کہ وہ زمین پر اللہ کی حاکمیتِ تشریعی کے نفاذ کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یعنی حاکم اس بات کا ذمہ دار ہے کہ وہ اللہ کے احکامات کی خود بھی پابندی کرے اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دے۔ خود اللہ کی نافرمانی سے بچے اور دوسروں کو بھی کوئی ایسا حکم نہ دے جو اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی کے زمرہ میں آتا ہو۔ اس لیے کہ حاکم کی حیثیت صرف نائب کی ہے وہ اصل حاکم کے حکم کے خلاف کوئی حکم دینے کا حق نہیں رکھتا۔

خلیفہ کی تقرری اور نظام شوری:

ریاست کی تشکیل اور اس کا انتظام چلانے کے لیے اسلام نے شوری کا نظام دیا ہے۔ اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی فردِ واحد اپنی مرضی سے طاقت کے زور پر اس منصب پر فائز نہیں ہو سکتا، نہ ہی اکثریت کا لحاظ کیا گیا ہے کہ کسی بھی نااہل شخص کو

---

[1] مودودی، سید، ابوالاعلی، **اسلامی ریاست**، (اسلامی پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور، 1985) ص184

[2] النساء:59

کثرتِ رائے کی وجہ سے اس منصب کا حقدار بنایا جا سکتا ہے۔ بلکہ اسلام نے شوری کا ایک نظام دیا ہے۔ اس شوریٰ نظام میں معاشرے کے دین دار اور صاحب بصیرت لوگ ایسے شخص کا انتخاب کرتے ہیں جو ہر لحاظ سے اس منصب کا اہل ہو۔

قرآن پاک میں نبی پاک ﷺ سے فرمایا گیا ہے: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ ۔۔۔[1]﴾ سو اللہ کی رحمت سے آپ ﷺ ان کے لیے نرم دل ہیں ورنہ اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل والے ہوتے تو بھاگ کھڑے ہوتے آپ کے ارد گرد سے، پس آپ در گزر کر جائیں ان سے اور استغفار کریں ان کے لیے اور مشورہ لیا کریں ان سے کاموں میں اور جب کسی کام کا پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر توکل کریں اور کوئی شک نہیں کہ اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

مؤمنین کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ[2]﴾ اور وہ اپنے کاموں کو آپس کے مشورہ سے انجام دیتے ہیں۔ ان کے کام آپس کے مشورے سے ہوتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول اگر آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ہمیں کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جس کے متعلق قرآن وسنت میں کوئی چیز نہ ملے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا:

((اجْمَعُوا لَهُ الْعَابِدِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَاجْعَلُوهُ شُورَى بَيْنَكُمْ وَلا تَقْضُوا فِيهِ بِرَأْيٍ وَاحِدٍ[3]))

میری امت میں سے عبادت گزاروں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرنا اور ایک آدمی کی رائے پر ہی فیصلہ نہ کر ڈالنا۔

اس روایت میں مشورہ کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ آداب بھی بتا دیئے کہ ہر فاسق فاجر کے مشورے کا اعتبار نہیں ہے بلکہ مشورہ دین دار، عبادت گزار لوگوں سے لیا جائے اور مشورے کے بعد سب کی رائے کا احترام ملحوظ رکھا جائے کسی ایک کی رائے پر ہی فیصلہ نہ کیا جائے اور باقیوں کی رائے کو نظر انداز کر دیا جائے۔ کنز العمال میں ہے:

((مَنْ دَعَا اِلى اَمَارَةِ نَفْسِهِ اَوْغَيْرِهِ مِنْ غَيْرِ مَشْوَرَةٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَلَا يَحِلُ لَكُمْ اَنْ لَّا تَقْتُلُوْه[4]))

---

[1] آل عمران: 159

[2] شوریٰ: 38

[3] ابن قیم الجوزیہ، محمد ابن ابی بکر، **اعلام المعوقین عن رب العالمین**، المحقق، مشہور بن حسن، (دار ابن الجوزیہ القاھرۃ)، 54/1

[4] علاء الدین بن حسام الدین، **کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال**، (دار الاشاعت، ایم اے جناح روڈ، کراچی پاکستان)، 2577/5

اور جو شخص اپنی امارت کی طرف دعوت دے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر تو ایسے شخص کو قتل نہ کرنا تمھارے لیے حلال نہیں ہے۔

اسلامی ریاست کے سربراہ یا خلیفہ کا انتخاب علم، تقوی اور تجربہ کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ خلیفہ کے لیے جو اوصاف لازمی شمار کیے جاتے ہیں، ان میں اس کا عالم، باکردار ہونا، اجتہادی قابلیت، عسکری بصیرت، اور علمی استعداد کا ہونا ضروری ہے۔ خلیفہ کے لیے علم، عدالت، کفایت اور ان اعضاء و حواس کی صحت و سلامتی ضروری خیال کی جاتی ہے جن کا اثر رائے و عمل پر پڑتا ہو۔ (تاکہ) وہ نئے نئے مسائل کا اپنی اجتہادی قابلیت سے فیصلہ کر سکے۔ محمد ارشد بھٹی لکھتے ہیں:

"خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اس پر پورا اعتماد کیا جائے گا، لوگوں پر اس کی اطاعت کرنا اس وقت تک فرض ہو گی کہ جس وقت تک وہ خدا اور رسول ﷺ کی پیروی کرے گا۔ "امیر المومنین تنقید سے بالاتر نہ ہو گا، ایک عام آدمی بھی امیر کی ریاستی یا نجی زندگی پر تنقید کرنے کا مجاز ہو گا، قانون کی نظر میں ایک خلیفہ اور ایک عام شہری برابر ہوں گے۔"[1]

امیر یا خلیفہ مجلس شوری کا ایک رکن ہو گا، جسے دیگر ممبران کی اکثریت کی حمایت حاصل ہو گی مجلس شوری کے فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے۔ پروفیسر ارشد بھٹی خلیفہ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

"کوئی ایسا شخص خلیفہ یا امیر نہیں بن سکتا جو اپنے آپ کو خود امیدوار کی حیثیت سے پیش کرے یا اس کے لئے کوشش کرے۔ اس قسم کی انتخابی مہم اور اپنے لیے کوشش کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے صاف صاف بتلا دیا کہ امیدوار کو کوئی منصب نہ دیا جائے۔"[2]

اسلامی ریاست میں عدلیہ اور انتظامیہ کے شعبے الگ الگ ہوں گے اور دونوں ایک دوسرے کے اثر سے بالکل آزاد ہوں گے، انتظامیہ میں سب لوگ خلیفہ کے ماتحت ہوں گے جب کہ عدلیہ میں خلیفہ بھی عوام کی طرح عام آدمی تصور کیا جائے گا۔ موجودہ دور میں جو مغربی طرز جمہوریت پوری دنیا میں رائج ہے یہ اسلام کی منشا کے بھی خلاف ہے اور اس میں بہت سے مفاسد بھی شامل ہیں جس میں ہر شخص کو اقتدار میں شریک کرنے کی بات کی جاتی ہے چاہے وہ انتخاب کرنے کا اہل بھی ہے کہ نہیں نیز اس طرز انتخاب میں دنیاوی اور مادی مفاد کو ہی سامنے رکھا جاتا ہے اسی وجہ سے ایسے لوگ منتخب ہو کر آتے ہیں جو شریعت کی منشا کے مطابق حکومت کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ اکثریت کی رائے پر فیصلہ کیا جاتا ہے اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے کسی قسم کی ظلم، زیادتی اور دھاندلی سے گریز نہیں کیا جاتا۔ جو کسی عہدے کا طلب گار بن کر آتا ہے تو وہ اسی کے حوالے ہو جاتا ہے اور اگر کسی کو بغیر

---

[1] بھٹی، محمد ارشد خان، **تہذیب اسلامی**، (اصباح الادب، لاہور، 1991)، ص236

[2] ایضاً، ص236

طلب کے کوئی عہدہ سپرد کیا گیا اللہ تعالیٰ اس کے مددگار ہو جاتے ہیں۔اس کے مقابلہ میں اسلام کا جو شوریٰ طرز انتخاب ہے۔اس میں یہ ذمہ داری معاشرے کے اولو الباب کے اختیار میں ہے کہ وہ ایسے شخص کا انتخاب کریں جو اس منصب کا حقیقی حقدار ہے جیسے خلافت راشدہ کا سنہری دور اس کی بہترین مثال ہے۔

خلیفہ/امیر کی ضرورت واہمیت:

اسلامی ریاست میں امام یا خلیفہ کا ہونا لازمی امر ہے جو ریاست کو اسلامی اصولوں کے مطابق چلانے میں کردار ادا کرے۔العقائد النسفیہ کے مؤلف لکھتے ہیں:

"اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ لَا بُدَّ لَهُمْ مِنْ اِمَامٍ يَقُوْمُ بِتَنْفِيْذِ اَحْكَامِهِمْ، وَاِقَامَةِ حُدُوْدِهِمْ وَسَدِ ثُغُوْرِهِمْ، وَتَجْهِيْزِ الْجُيُوْشِ، وَاَخْذِ صَدَقَاتِهِمْ، وَقَهْرِ الْمُتَغَلِّبَةِ، وَقُطَّاعِ الطَّرِقِ، وَاِقَامَةِ الْجُمَعِ وَالْاَعْيَادِ، وَقَطْعِ الْمَنَازِعَاتِ الْوَاقِعَةِ بَيْنَ الْعِبَادِ، وَقُبُوْلُ الشَّهَادَاتِ الْقَائِمَةِ عَلَى الْحُقُوْقِ، وَتَزْوِيْجِ الصِّغَارِ الَّذِيْنَ لَا اَوْلِيَاءَ لَهُمْ، وَقِسْمَةُ الْغَنَائِمِ[1]"

ضروری ہے کہ مسلمانوں کا ایک امیر / خلیفہ ہو جو احکامات کی تنفیذ کرے، حدووں کو قائم کرے، حملوں کو روکے، لشکر تیار کرئے، صدقات وصول کرے، مافیا پر اور ڈاکوں پر فتح پائے، جمعہ اور عیدین کو قائم کرئے، لوگوں کے درمیان ہونے والے تنازعات کو ختم کرے، حقوق پر قائم ہونے والی شھادتوں کو قبول کرے، ایسے بچے جن کے سرپرست نہ ہوں ان کی سرپرستی کرئے اور مال غنیمت کی تقسیم کرے۔

امام شہرستانی خلیفہ کی اہمیت وضرورت کو بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لَاُ بدَّ مِنْ اِمَامٍ يَنْفُذُ اَحْكَامُ الْمُسْلِمِيْنَ وَيُقِيْمُ حُدُوْدَهُمْ وَيَحْفَظُ بِيْضَتَهُمْ وَيَحْرُسُ حِصْنَهُمْ وَيُهَيِئُ جُيُوْشَهُمْ وَيُرَاعِىْ فِيْهِمْ اُمُوْرَ الْجُمَعِ وَالْاَعْيَادِ، وَيَنْصِفَ الْمَظْلُوْمَ وَيَنْتَصِفُ مِنَ الظَّالِمِ، وَيَنْصِبَ الْقُضَاةَ وَلْوَلَاةَ فِىْ كُلِّ نَاحِيَةٍ وَيَبْعَثُ بِالْقُرَاءِ وَالدّعَاةِ اِلَى كُلِّ طَرْفٍ-"[2]

ضروری ہے کہ ایک امام ہو جو مسلمانوں کے احکام کو نافذ کرے، حدود کو قائم کرے، ان کی افزائش کی حفاظت کرے، ان کے حقوق کا محافظ ہو، ان کی فوجیں تیار کرے، جمعہ اور عیدوں کے معاملات کا خیال رکھے، مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے، ظالموں سے انتقام لے، ہر طرف قاضی اور ولی مقرر کرے اور ہر طرف قراء اور داعی بھیجے۔

---

[1] النسفی، نجم الدین عمر: **العقائد النسفیۃ**، (القاھرۃ دار احیاء الکتاب العربیۃ لاصحابہا عیسی البابی الحلبی وشرکاء)، ص25-35

[2] الشہرستانی، عبدالکریم: **نہایۃ الاقدام فی علم الکلام**، دون مکان ص12-17

امام ابو یوسفؒ حاکم کے فرائض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"الرُّعَاةُ مُودُوْنَ اِلَی رَبِّهِمْ مَا يُؤَدِی الرَّاعِی اِلی رَبِّهِ" اور خلیفہ کی ذمہ داریوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں"فَاقِمِ الْحَقَّ فِيْمَا وَلَاکَ اللهُ وَقَلَّدَکَ وَلَا تَزُغْ فَتَزِيْغُ رَعِيَتَکَ وَاِنِّی اُوصِيْکَ اَمِيْرَ الْمُؤمِنِيْنَ بِحِفْظِ مَا اسْتَحْفَظَکَ اللهُ وَرِعَايَةَ مَا اسْتَرْعَاکَ، وَاحْذَرْ اَن تَضِيْعَ رِعِيَتَکَ فَيَسْتَوفَی رَبّاً حَقَّهَا مِنْکَ وَيَضِيْعَکَ وَلَا تَنْسَی الْقِيَامَ بِاَمْرِ مَّن وَّلَاکَ اللهُ اَمْرَهُ "۔[1]

پس حق کو قائم کرو جس معاملہ میں اللہ نے تجھے ولایت دی ہے اور تجھے اس کا مقلد بنایا ہے اور انحراف مت کرنا ورنہ تمھاری رعایا بھی انحراف کر جائے گی اور اے امیر المؤمنین میں تمھیں وصیت کرتا ہوں، جو کچھ اللہ نے آپ کے لیے محفوظ کیا ہے اسے محفوظ رکھیں۔اس کا خیال رکھیں جس نے آپ کی دیکھ بھال کی ہے اور اس سے ڈریں کہ آپ کی رعایا ضائع نہ ہو جائے۔ پس اس کا رب تجھ سے اس کا پورا حق طلب کرے گا اور تجھے ضائع کر دے گا۔ جن امور کا اللہ نے تمھیں ذمہ دار بنایا ہے ان کے قائم کرنے کو ہر گز نہ بھولنا۔

علامہ ماوردی نے اپنی کتاب "الاحکام السلطانیة والویات الدینیة" میں حکومت کی ذمہ داریوں اور واجبات کو دس تک شمار کیا ہے۔

1- حِفْظُ دِيْن عَلَی اُصُوْلِهِ الْمُسْتَقَرَّةِ۔
2- تَنْفِيْذُ الْاَحْكَامِ بَيْنَ الْمُتَشَاجِرَيْنِ۔
3- حِمَايَةُ الْبِيْضَةِ وَالذَّبِّ عَنِ الْحَرِيْمِ۔
4- اِقَامَةُ الْحُدُوْدِ لِتُصَانِ مَحَارِمِ اللهِ عَنِ الْاِنْتِهَاکِ۔
5- تَحَصُّنَ الثَّغُوْرِ بِالْعِدَّةِ وَالْمَنِّ۔
6- جِهَادُ مَنْ عَائِدَ عَنِ الاِسْلَامِ بَعْدَ الدَّعْوَةِ حَتَّی يُسَلِّمَ اَوْ يَدْخُلَ فِیْ الذِّمَّةِ۔
7- جِبَايَةَ الْفَيءِ وَالصَّدَقَاتِ عَلَی مَا اَوْجَبَهُ الشَّرْعُ۔
8- تَقْدِيْرُ الْعَطَايَا وَمَايَسْتَحِقُّ فِیْ بَيْتِ الْمَالِ۔
9- اِسْتَكْفَاءُ الْاُمَنَاءُ وَتَقْلِيْدُ النُّصَحَاءُ فِيْمَايَفُوْضُ اِلَيْهِمْ مِنْ الْاَعْمَالِ۔
10 -اَنْ يُّبَاشِرَ بِنَفْسِهِ الْاُمُوْرَ وَتَصْفَحُ الْاَحْوَالُ لِيَنْهَضَ بِسَيَاسَةِ الْاُمَّةِ وَحَرَاسَةِ الْمِلَّةِ ۔[2]

---

[1] ابو یوسف یعقوب، بن ابراھیم: **کتاب الخراج**، (القاھرۃ، المطبعۃ السلفیۃ، ط6، 1397ھ)، ص4-6

[2] الماوردی، ابوالحسن علی بن حبیب البصری: **الاحکام السلطانیۃ والولایات الدینیۃ**، (المطبعۃ المحمدیۃ التجاریۃ بمصر، د۔ت۔) ص15-16۔ کذلک ینظر، صلاح الدین، بسیونی رسلان، صلاح الدین بسیونی، **الفکر السیاسی عند الماوردی**، (مکتبۃ نہضۃ الشرق۔1985)، ص:192-194۔

(پہلا)مذہب کواس کی مستحکم بنیادوں پر محفوظ رکھے۔

(دوسرا)دو جھگڑنے والوں کے درمیان فیصلے کا نفاذ کرے۔

(تیسرا)ملک کی حفاظت کرے اور دشمن سے اسے بچائے۔

(چوتھا)حدوں کو قائم کرئے تاکہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کے ارتکاب سے بچا جائے۔

(پانچواں)سرحدوں کی پوری طرح حفاظت کرئے کہ دشمن کو اچانک دراندازی کا موقع نہ ملے۔

(چھٹا)اسلام کی دعوت نہ ماننے والوں سے جہاد کرئے تاکہ یا تو وہ اسلام قبول کریں یا ذمی بن کر رہیں۔

(ساتواں)شریعت نے جو صدقات و خراج واجب کیے ہیں ان کی وصولی کرئے۔

(آٹھواں) مستحقین کے لیے بیت المال سے وظیفے مقرر کرئے۔

(نواں)امانت داروں کو ذمہ داری سونپے اور جو ذمہ داری سونپی جائے اس میں خیر خواہوں کی تقلید کرئے۔

(دسواں)خود تمام امور سلطنت کی نگرانی کرے اور تمام حالات سے باخبر رہے تاکہ امت کی پاسبانی اور ملت کی حفاظت وہ خود کر سکے۔

ان ہی واجبات کو ابو یعلی الفراء نے بھی اپنی کتاب "الاحکام السلطانیۃ" میں ذکر کیا ہے۔[1]

اسلامی ریاست کے مقاصد و فرائض:

اسلامی ریاست کے وجود کا بنیادی مقصد ریاست کے تمام افراد کو احکام خداوندی کا پابند بنانا، ان کی معاشی و معاشرتی بہبود، خوشحالی اور بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کا خیال رکھنا ہے۔ ریاست عوام کے حقوق و فرائض کو ادا کرنے اور ان کی جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ اسلامی ریاست کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ اللہ رب العزت کی ہدایت کے مطابق اور اس کے نازل کردہ میزان عدل کے مطابق لوگوں میں اجتماعی عدل قائم کرے اور اس مقصد کو اللہ رب العزت نے یوں واضح فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ[2]﴾ تحقیق ہم نے بھیجے اپنے رسول واضح دلیلوں کے ساتھ اور اتاری ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ وہ لوگوں کے درمیان انصاف کا بول بالا کریں۔

---

[1] نت: **وظائف الدولۃ:** دراسۃ فی الفکر العربی الاسلامی۔ http://www.madaarik.net/mag5and6/12.htm

[2] الحدید:25

اس آیت کریمہ میں رسولوں کے بھیجنے کا مقصد بتادیا کہ وہ لوگوں میں عدل وانصاف قائم کرنے کے لیے کتابِ حق اور میزانِ عدل کو معیار بنائیں۔ یہ کام ایک ریاست کی صورت میں ہی سرانجام دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ: ﴿ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ أَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا۟ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَمَرُوا۟ بِٱلْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا۟ عَنِ ٱلْمُنكَرِ[1]﴾ اگر ان لوگوں کو ہم زمین پر تمکن دیں تو وہ نماز کا اور زکوٰۃ کا نظام قائم کریں اور اچھائیوں کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں۔

اس آیت کریمہ میں اسلامی ریاست کی چار بنیادی ذمہ داریوں کو بیان فرمایا گیا ہے۔ اقامت الصلٰوۃ، نظامِ زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

احکام کی تنفیذ میں ریاست کا کردار:

شرعی احکام کی تنفیذ ایک اسلامی ریاست کا بنیادی فرض ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

> "خلاف اسلام امور کی روک تھام کرنا، اسلامی اقدار کے تحفظ واحیاء کے لیے کوشش کرنا، صلوۃ اور زکوٰۃ کے نظام کو قائم کرنا، معروفات کی اشاعت اور منکرات کی روک تھام کے لیے اقدامات کرنا یہ سب اسلامی ریاست کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔"[2]

اس ذمہ داری کو قرآن پاک نے بڑے احسن انداز میں بیان کیا ہے: ﴿ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ أَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا۟ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَمَرُوا۟ بِٱلْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا۟ عَنِ ٱلْمُنكَرِ[3]﴾ اگر ان لوگوں کو ہم زمین پر تمکن دیں تو وہ نماز کا اور زکوٰۃ کا نظام قائم کریں اور اچھائیوں کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں۔

اسلامی ریاست کی اجتماعی حیثیت بیان کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے فرمایا: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ[4]﴾ اور ضرور تم میں ایک جماعت ایسی ہو جو خیر کی طرف بلائے اور معروفات کا حکم دے اور منکرات سے روکے اور یہی لوگ کامیابی کو پہنچنے والے ہیں۔

اس آیت کریمہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ معاشرے سے برائیوں کے خاتمے کے لیے اور اچھائیوں کو فروغ دینے کے لیے ریاست کو اجتماعی طور پر کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے ایک جماعت ہمہ وقت سرگرم رہے۔

---

[1] الحج:45

[2] خالد علوی، ڈاکٹر، **اسلام کا معاشرتی نظام**، ص286

[3] الحج:45

[4] ال عمران:104

شخصی آزادی:

اسلام اجتماعیت کا علمبر دار دین ہے اور افراد کو ایک خاص نظم کا پابند بنانے کے ساتھ ساتھ ہر شخص کو ایک مخصوص دائرہ کے اندر رہتے ہوے پوری آزادی دیتا ہے۔ یہ آزادی تب تک قائم رہتی ہے کہ جب تک کہ وہ شخص کسی دوسرے کے حقوق یا آزادی میں خلل کا ذریعہ نہ بنے۔ جب کوئی شخص دوسروں کے حقوق اور آزادی کے لیے خطرہ بن جائے تو ریاست اسلام کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اس سے باز پرس کرنے کا حق رکھتی ہے، لیکن بلاوجہ محض شبہ کی بنیاد پر ریاست کسی کی شخصی آزادی سے تعارض نہیں کر سکتی۔ حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے:

((عَنْ مَعْدِيْكَرِبٍ وَاَبِيْ أُمَامَةَ عَنِ النَّبِيﷺ قَالَ:إنَّ الأميرَ إذا ابتغى الرِّيبةَ في النَّاسِ أفسَدَهُم[1]))

مقدام ابن معدیکرب اور ابوامامہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب امیر لوگوں میں شبہات تلاش کرتا ہے تو ان کو بگاڑ دیتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے:

((ادْرَؤوا الحُدودَ عن المسلِمينَ ما اسْتَطَعْتُم، فإن كانَ له مَخرَجٌ فخَلُّوا سَبيلَه؛ فإنَّ الإمامَ لَأن يُخطِئَ في العَفْوِ خَيْرٌ مِن أن يُخطِئَ في العُقوبةِ[2]))

جس حد تک ممکن ہو مسلمانوں کو سزا سے بچاؤ، کوئی گنجائش بھی اگر نکلتی ہو تو ان کو چھوڑ دو، یہ بات کہ امام (حکومت) کسی شخص کو معاف کرنے میں خطاء کر جائے اس بات سے بہتر ہے کہ وہ اس کو سزا دینے میں خطاء کر جائے۔ اسی طرح دوسری حدیث میں ارشاد ہے:

((ادْفَعُوا الْحُدُودَ مَا وَجَدْتُمْ لَه مَدْفَعًا[3]))جب تک بچانے کی کوئی راہ مل رہی ہو اس وقت تک لوگوں کو سزا سے بچاؤ۔

---

[1] ابو داؤد، سلیمان بن اشعث سجستانی، **السنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی النہی عن التجسس**، (بیروت، لبنان: دار الفکر، 1414ھ/1994ء)، 375/4

[2] ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، **الجامع الصحیح، کتاب الحدود، باب حد الزنا**۔ (بیروت، لبنان: دار الغرب الاسلامی، 1998ء)، ح: 1424

[3] ابن ماجہ، ابو عبد اللہ محمد بن یزید، **سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب الستر علی المؤمن ودفع الحدود بالشبہات**، (دار الحضارۃ للنشر والتوزیع ریاض، طبع ثانی)، ح 2545

اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی حفاظت کی ضامن ہوتی ہے۔ وہ شبہ کی بنیاد پر کسی کو سزا نہیں دیتی۔ امام ابو یوسفؒ کتاب الخراج میں لکھتے ہیں:

"نہ یہ بات درست ہے اور نہ ہی اس کے درست ہونے کی کوئی صورت ہے کہ کسی شخص کو صرف اس وجہ سے جیل میں ڈال دیا جائے کہ کسی دوسرے شخص نے اس پر الزام لگایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ خالی الزام کی بنیاد پر کسی آدمی کو گرفتار نہیں کرتے تھے۔ اگر ایسی صورت پیش آجائے تو مدعی اور مدعاعلیہ دونوں کو حاضر کیا جائے۔ اگر مدعی کے پاس ثبوت موجود ہو تو اس کے حق میں فیصلہ دے دیا جائے، ورنہ مدعاعلیہ سے ضمانت لے کر اس کو آزاد کر دیا جائے۔ اگر اس کے بعد مدعی کوئی ثبوت فراہم کرتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ مدعاعلیہ سے کوئی تعارض نہیں کیا جائے گا۔[1]

ریاست اس کی مجاز نہیں ہے کہ وہ شہریوں کی شخصی آزادی کو حیلوں بہانوں سے ختم کر دے۔ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم اس بارے میں لکھتے ہیں:

"اسلام کی رو سے حکومت کوئی مقصود بالذات شے نہیں ہے۔ بلکہ وہ محض ایک ذریعہ ہے اس بات کا کہ شہریوں کو رائے و عمل کی آزادی ہر وقت آسانی سے میسر ہو، جو شریعت نے افراد و معاشرہ کو دی ہے، تاکہ جو غرض ہے ان کے امتحان کی وہ اچھے طریقے سے پوری ہو۔ جس کی وجہ سے اللہ رب العزت نے انسان کی تخلیق کی۔ اسی لیے اسلام کسی غیر معمولی حالت میں بھی حکومت کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ انصاف کی شرطیں پوری کیے بغیر کسی شہری کی آزادی کو سلب یا محدود کرے۔[2]

مذہبی آزادی:

ایک اسلامی ریاست کے فرائض میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ اپنے ہر شہری کو اپنے مذہب اور عقیدہ کے مطابق زندگی گزارنے کے پورے مواقع فراہم کرے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں احکامات اسلام کی تنفیذ کرے۔ اسلام کی دعوت سارے عالم تک پہنچائے۔ لوگوں کو اپنی زندگیاں اسلامی عقائد اور اسلام کے وضع کردہ طریقہ کے مطابق گزارنے کے لیے سہولیات مہیا کرے اور اسلام کے منافی جو چیزیں اور طریقے رائج ہیں ان کا سدباب کرے۔

---

[1] ابو یوسف یعقوب، بن ابراھیم: **کتاب الخراج**، (القاھرۃ، المطبعۃ السلفیۃ، ط6)، ص107

[2] اصلاحی، امین احسن، **اسلامی ریاست**، (اشاعت ثانی مطبع، گنج شکر پرنٹرز، دار التذکیر، تاریخ اشاعت 2006ء رحمن مارکیٹ، اردو بازار لاہور)، ص16

مولانا امین احسن اصلاحی رقمطراز ہیں: "اسلامی نظام کے اندر مسلک و مذہب اور فکر و رائے کی آزادی کے لیے ہر شہری کو ایک وسیع میدان ملتا ہے، جس کے اندر ریاست یا تو سرے سے مداخلت کرتی ہی نہیں یا مداخلت کرتی ہے تو صرف تعلیمی اور تبلیغی نوعیت کے امور میں مداخلت ہوتی ہے۔ قانون اور طاقت کی مداخلت نہیں ہوتی۔"[1]

عدل وانصاف/ قانونی مساوات:

اسلامی ریاست اپنے ہر شہری کو چاہے وہ مالدار ہو یا غریب، لکھا پڑھا ہو یا جاہل، شریف النفس ہو یا وضیع، بادشاہ ہو یا رعایا برابری کا درجہ دیتی ہے۔ اسلام کی نظر میں سب برابر ہیں۔ کسی طرح کی کوئی درجہ بندی روا نہیں رکھی جاتی اور نہ ہی کہ کسی صاحب اقتدار کو استثنا حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بالاتر سمجھے۔ حدیث پاک میں ارشاد ہے: ترجمہ

> "ایک دفعہ قریش کے ایک معزز گھرانے کی ایک عورت سے چوری کا عمل سرزد ہو گیا تو آپ ﷺ نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ لوگوں کو عورت کے خاندان کی عظمت کی وجہ سے یہ بات گراں گزری تو حضرت اسامہ سے (جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بہت محبوب تھے) سفارش کروائی۔ آپ ﷺ نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا "تم اللہ کی حدود کے معاملہ میں سفارش کرنے آئے ہو۔ پھر لوگوں کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے بہت سی قومیں اس وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ جب ان قوموں میں کوئی معمولی حیثیت کا آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا دیتے اور اگر کوئی باثر آدمی اس فعل کا مرتکب ہوتا تو اس سے درگزر کر جاتے، لیکن میں ایسا نہیں کرنے والا۔ پھر خطبہ کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا: ((وَأَيْمُ اللهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ ابْنَةَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا.)) اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ ضرور کاٹ دیتا۔[3]

جبلہ ابن ایہم غسانی نے جو ایک ریاست کا والی تھا، جب دوران طواف ایک دیہاتی کو تھپڑ مار دیا اور معاملہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچا تو آپ نے قصاص کا فیصلہ صادر فرمایا، لیکن وہ راتوں رات وہاں سے بھاگ نکلا اور جا کر مرتد ہو گیا۔ حضرت عمر نے کسی امیر غریب کی کوئی رعایت نہیں کی بلکہ قانون کی نظر میں سب کو برابر رکھا۔[4]

---

[1] اصلاحی، امین احسن، **اسلامی ریاست**، ص122

[3] مسلم، ابوالحسین بن حجاج القشیری، **صحیح مسلم، باب قطع السارق الشریف**، (بیت الافکار الدولیۃ، ریاض، 1998ء)، ح1917

[4] الناصری، احمد بن خالد، **الاستقصا لاخبار دول المغرب الاقصی**، (دار الکتاب، طبع ثالث، 1997ء)، 83/1

عمرو بن میمون رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے خطبہ دیا:

"اے لوگو! میں اپنے عاملوں کو تمہارے اوپر اس لیے مقرر نہیں کرتا کہ وہ تمھیں ماریں پیٹیں یا تمارے مالوں کو ناجائز طریقہ پر لیں، بلکہ ان کو بھیجنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ تم کو تمہارا دین اور تمارے نبی کا طریقہ سکھائیں۔ اگر کسی شخص کے ساتھ اس قسم کی کوئی تعدی کی گئی ہو تو وہ اسے میرے علم میں لائے۔ اس ذات عالی کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے، میں اس کو زیادتی کرنے والے سے اس کا قصاص ضرور دلاؤں گا۔" یہ سن کر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھ کر کھڑے ہوئے اور بولے: اے امیر المومنین! فرض کیجیے کہ ایک شخص کہیں کا گورنر ہے اور وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو کیا آپ اس سے بھی بدلہ دلوائیں گے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں اس سے بھی مظلوم کو بدلہ دلواؤں گا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ اپنی ذات کو بھی قصاص کے لیے پیش کرتے تھے۔ خبردار! مسلمانوں کو مارو پیٹو نہیں کہ ان کو ذلیل کر کے رکھ دو۔"[1]

اس کا ثبوت بھی موجود ہے کہ خلفاء راشدین نے اپنے دور خلافت میں اپنے آپ کو مدعا علیہ کی حیثیت سے عام عدالتوں میں پیش کیا اور لگائے گئے الزامات کی جوابدہی کے لیے حاضر ہوے۔

اسلام نے انسان کی عزت و شرف کا معیار صرف تقوی کو قرار دیا ہے۔ لہذا اسلامی ریاست اپنے شہریوں کے درمیان رنگ، نسل، خاندان اور پیشہ وغیرہ کی وجہ سے فرق تسلیم نہیں کرتی۔ آپ ﷺ نے اسی بات کو حجۃ الوداع کے خطبہ میں تفصیل سے بیان فرمایا:

"خبردار کسی عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر اور کسی گورے کو کالے پر یا کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے، سوائے تقویٰ کی بنیاد کے اور سب آدم کی ذریت ہو اور آدم کی تخلیق مٹی سے کی گئی۔"[2]

حکومت اور سلطنت کا وجود انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ سلطنت و حکومت کا قیام غلبے کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ ہر شخص کو دوسرے شخص سے کسی نہ کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے اور بسا اوقات طاقتور شخص کمزور شخص سے اپنی ضرورت کی اشیاء بزورِ قوت لینا چاہتا ہے۔ اس لیے ظلم و جور ختم کرنے اور عدل و انصاف قائم کرنے کی خاطر کسی قوت حاکمہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عدل و انصاف کے قیام کے لئے قوانین کا وجود ناگزیر ہے۔ یہ قوانین اگر انسانوں کے بنائے ہوئے ہوں تو یہ سیاست عقلی کہلائے گی اور اگر یہ قوانین شرعی ہوں تو یہ سیاست شرعی ہوگی۔ اللہ تعالی کے پیغمبر زمین پر رب تعالیٰ کا خلیفہ اور

---

[1] ابو یوسف یعقوب، بن ابراھیم: **کتاب الخراج**، (القاھرۃ، المطبعۃ السلفیۃ، ط6)، ص66

[2] احمد ابن محمد بن حنبل، امام، **مسند احمد**، (دار السلام للنشر والتوزیع، طبع اولی، فروری 2013ء) ح: 22978

نائب ہوتے ہیں۔ وہ براہ راست احکام الٰہیہ کو حاصل کر کے اور ان احکامات کی تفصیل اور تشریح کر کے ان احکامات کو اللہ رب العزت کے بندوں پر نافذ کرتے ہیں اور یہی احکامات شریعت کہلاتے ہیں۔

تعلیم:

اسلامی ریاست کا ہر شہری تعلیم کا حقدار اور ذمہ دار ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ[1])) علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔

اسلام نے حصول علم کی اہمیت کو کس طرح واضح کیا ہے اس کا اندازہ اس واقعے سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بدر کی لڑائی میں جو کفار گرفتار ہوئے، ان میں سے جو تعلیم یافتہ قیدی تھے ان کا فدیہ یہ قرار دیا گیا کہ وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو آزاد کر دیے جائیں گے۔ لہٰذا ایک مسلم ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی بنیادی اور ضروری تعلیم کا خود انتظام کرے۔ ہر ایک کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع فراہم کرے۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرب کی بگڑی ہوئی معاشرت کو تعلیم کے ذریعہ سے ہی بدلا اور ارشاد فرمایا: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا[2]))۔ میں معلم بنا کر مبعوث کیا گیا ہوں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر:

اسلامی ریاست کے فرائض میں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اہم ذمہ داری ہے کیوں کہ یہ دونوں کام معاشرے کی اصلاح کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اسلامی ریاست کی صرف یہی ذمہ داری نہیں بنتی کے وہ منکرات کا سدِ باب کرے بلکہ منکرات کے سدِ باب کے ساتھ ساتھ معروف کی اشاعت بھی ضروری ہے۔ لوگوں کو نیکی کرنے اور اس کی طرف مائل ہونے کے موقع فراہم کرے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے: اسلامی حکومت کے امراء کی اطاعت واجب ہے جب تک کہ خدا اور رسول کی نافرمانی کی بات نہ کریں جب وہ ایسا کریں تو اس وقت نہ سننا ہے اور نہ ماننا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

> ((اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ حَقٌّ مَا لَمْ يُؤمَرْ بِالْمَعْصِيَةِ فَإِذَا اَمَرَ بِالْمَعْصِيَةِ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ۔[3])) سننا اور اطاعت کرنا حق ہے اس وقت تک کہ کوئی گناہ وغیرہ کے بارے میں حکم نہ دیں۔ پس جب وہ معصیت وغیرہ کا حکم دیں تو اس وقت سننا اور اطاعت کرنا واجب نہیں ہے۔

---

[1] ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، الکتاب فی الایمان و فضائل الصحابۃ والعلم، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، ح224

[2] ایضاً، ح220

[3] بخاری، کتاب الجہاد والسیر، جامع الصحیح: باب السمع والطاعۃ للامام، ح2955

اسی طرح قرآن پاک میں ارشاد ہے:﴿اَلَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهم فِيْ الْأَرْضِ أَقَامُوْا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبةُ الْأُمُوْر[1]﴾ اگران لوگوں کو ہم زمین پر حکومت دیں تو یہ نماز اور زکوۃ کا نظام قائم کریں اور اچھی باتوں کا حکم کریں اور بری باتوں سے منع کریں اور تمام کاموں کا انجام اللہ کے پاس ہے۔

اس آیت کریمہ میں حکم بصورت خبر دیا گیا ہے جس کے اندر زیادہ تاکید کا معنی پایا جاتا ہے۔ اور اس آیت کریمہ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری صرف سرحدوں کی حفاظت، امن وامان کا قیام، صحت تعلیم اور عوام کی کفالت ہی نہیں، بلکہ الامر بالمعروف والنہی عن المنکر بھی اس کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

قرآن پاک نے جہاں﴿اَلَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهم فِيْ الْأَرْضِ أَقَامُوْا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبةُ الْأُمُوْر[2]﴾ آیت کریمہ سے حکومت کی ذمہ داری کو واضح کیا ہے وہاں آیت کریمہ:﴿وَٱلْمُؤْمِنُونَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِٱلْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ ٱلْمُنكَرِ﴾"اور مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں مددگار ہیں وہ اچھی باتوں کا حکم کرتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں" سے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ فریضہ صرف حکمرانوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عمومی فریضہ ہے کہ جس میں حکومت اور علماء وعوام سب برابر شریک ہیں۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

"قَالَ الْعُلَمَاءُ: وَلَا يَخْتَصُّ الْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ بِأَصْحَابِ الْوَلَايَاتِ بَلْ ذَلِكَ ثَابِتٌ لِآحَادِ الْمُسْلِمِيْنَ- قَالَ إِمَامَ الْحَرَمَيْن: وَالدَّلِيْلُ عَلَيْهِ إِجْمَاعُ الْمُسْلِمِيْنَ فَإِنَّ غَيْرَ الْوَلَاةِ فِيْ الصَّدْرِ الْأَوَّلِ وَالْعَصْرِ الَّذِيْ يَلِيْهِ كَانُوْا يَأْمُرُوْنَ الْوِلَاةَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْهَمْ عَنِ الْمُنْكَرِ مَعَ تَقْرِيْرِ الْمُسْلِمِيْنَ إِيَّاهُمْ وَتَرك تَوبِيخَهُمْ عَلَى التَّشَاغُلِ بِالأَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ مِنْ غَيْرِ وَلَاةٍ-"[3]

علماء فرماتے ہیں کہ یہ اچھائیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے منع کرنا صرف صاحب اقتدار لوگوں کے لیے ہی خاص نہیں ہے، بلکہ یہ تمام اہل ایمان کے لیے ثابت ہوتا ہے۔ امام الحرمین فرماتے ہیں اس پر دلیل مسلمانوں کا اجماع ہے، کیوں کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اور اس کے بعد کے ادوار میں عام لوگ حکمرانوں کو معروف کی ترغیب دیتے تھے اور منکرات سے روکتے تھے۔ اس پر مسلمانوں کی تقریر موجود ہے اور مسلمان حکمرانوں کا عوام کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے نہ روکنا بھی یہ بات ثابت کرتا ہے کہ یہ امت کا اجماعی فیصلہ ہے کہ یہ صاحب اقتدار لوگوں کے علاوہ عام لوگوں کے لیے بھی ضروری ہے۔

---

[1] الحج:41

[2] الحج:41

[3] النووی، **شرح المسلم، کتاب الایمان، باب کون النھی عن المنکر من الایمان**، (المطبعۃ المصریہ بالازھر، طبع اولی 1929)، 23/2

"حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اس آیت مبارکہ ﴿اَلَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهم فِيْ الْأَرْضِ أَقَامُوْا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبةُ الْأُمُوْر[1]﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَلَا إِنَّهَا لَيْسَتْ عَلَى الْوَالِي وَحْدَهُ وَلَكِنَّهَا عَلَى الْوَالِيْ وَالْمَوْلِي عَلَيْهِ[2]۔" "سن لو! یہ صرف حاکم پر ہی نہیں ہے بلکہ حاکم اور محکوم سب کے لیے ہے۔" کیونکہ زمین پر تمکین صرف حکمرانوں کو ہی حاصل نہیں ہے بلکہ ہر انسان زمین پر کسی نہ کسی نوع کی تمکین رکھتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ مَكَّنَّكُمْ فِي ٱلْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَٰيِشَ[3]﴾ اور تحقیق ہم نے زمین پر تمہیں اقتدار دیا اور رکھ دی اس میں تمہارے لیے روزی۔

واضح ہوتا ہے کہ بھلائیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا صرف حکومت کی ہی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ عام افراد بھی اس ذمہ داری میں شریک ہیں اور یہ بات قرآن وحدیث اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔ لیکن یہ بلکل واضح ہے کہ اس فریضہ کی ادائیگی میں حکومت اور عوام کے دائرہ اختیار اور دائرہ عمل میں بہت فرق ہے اور ہر ایک اپنے دائرہ اختیار میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مکلف ہے۔ ریاست و حکومت منکرات پر حد یا تعزیر جاری کرنے کی مجاز ہے لیکن عام آدمی جتنا ازالہ کی طاقت رکھتا ہے وہ اسی قدر ازالہ کرنے کا مکلف ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور یہ ریاست اور عوام کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ وہ معروفات کی اشاعت اور منکرات کے سد باب میں اپنا کردار ادا کریں، ورنہ اس عظیم فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی پر دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں سخت سزاؤں کی وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

((اَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وآله وسلم قَالَ:((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ! لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ، وَلَتَنهوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ، اَوْ لَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْ عِنْدِهِ، ثُمَّ لَتَدْعُنّه فَلَا يَسْتَجِيْبُ لَكُمْ۔))[4]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم ضرور ضرور نیکی کا حکم دو گے اور ضرور ضرور برائی سے منع کرو، وگرنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے کوئی عذاب تم پر مسلط کر دے اور پھر تم اس کو پکارو گے، لیکن وہ تمہیں جواب نہیں دے گا۔

---

[1] الحج: 41

[2] ابن کثیر، حافظ عماد الدین، **تفسیر القران العظیم**، (دار الکتب العلمیۃ بیروت، لبنان، طبع اولی 1998) 383/1

[3] الاعراف: 10

[4] ترمذی، سنن ترمذی، **کتاب الفتن، باب ماجاء فی الامر بالمعروف و نہی عن المنکر**، 39/2 ح، 2169 (تحفۃ الاشراف میں اس حدیث کو صحیح لکھا ہے اور علامہ البانی نے اس حدیث کو حسن لکھا ہے۔)

دوسری جگہ ارشاد ہے:((مَا مِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ فِيْ قَوْمٍ يَعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِيْ يَقْدِرُوْنَ عَلَى أَنْ يُّغَيِّرُوْا عَلَيْهِ فَلَا يُغَيِّرُوْا إِلَّا أَصَابَهُمُ اللهُ بِعَذَابٍ مِنْ قَبْلِ أَن يَّمُوْتُوْا[1]))

کوئی آدمی اگر ایسے لوگوں میں ہو جو گناہوں مرتکب ہو رہے ہیں اور وہ اسے تبدیل کرنے پر قادر ہوں لیکن تبدیل نہ کریں تو اللہ تعالی انھیں موت سے پہلے ہی عذاب سے دوچار کر دیں گے۔

خلاصہ:

اس فصل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے جد وجہد کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔ایسی ریاست کا قیام ہو جہاں مسلمان آزادانہ طور پر اپنے دین وشریعت کے مطابق زندگیاں گزار سکیں نیز اسلامی ریاست کے سربراہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں شریعت کے قوانین کا نفاذ کرے، نماز کو قائم کرنے کے لیے اقدامات کرے، زکوٰۃ کا نظام قائم کرے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور لوگوں کو شریعت کے مطابق زندگیاں گزرانے کے مواقع فراہم کرے۔اسلامی ریاست میں حکمران اقتدار کو عیش وعشرت کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ وہ خود کو عوام کا خادم سمجھتے ہیں اور اللہ کے سامنے اپنے آپ کو جواب دے سمجھتے ہیں اس لیے وہ اپنی ذمہ داریوں میں سب سے زیادہ لوگوں کے دین وایمان، جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کو اہمیت دیتے ہیں۔

---

[1] ابوداؤد، **سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب الأمر والنهي**، ح: 4339

فصل دوم: پاکستان کا قیام اور اس کا تاریخی و تہذیبی پس منظر

فصل دوم: پاکستان کا قیام اور اس کا تاریخی و تہذیبی پس منظر

پاکستان 1947ء کو ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے دینا کے نقشے پر ابھرا۔ ملک خداداد پاکستان مسلمانان ہند کی صدیوں پر محیط جد وجہد و خواہشات کا ثمرہ ہے۔ یوں تو برصغیر پر مسلمانوں نے ایک طویل عرصہ حکومت کی، لیکن چونکہ برصغیر پاک وہند میں مختلف قومیں آباد تھیں جن کا رہن سہن، طرزِ زندگی، معاشرت و معاملات، مذہب و سیاست اور تہذیب و ثقافت سب کچھ مسلمانوں سے جدا تھا۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ 1857ء میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ، جنگ آزادی کے عنوان سے لڑی، جس میں ناکامی کے بعد انگریزوں کا پورے برصغیر پر مکمل قبضہ ہو گیا۔ مسلمانوں نے انگریز سامراج کے خلاف آزادی کی تحریک شروع کی تو انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں سے بھی الگ ایک ریاست کا مطالبہ کیا۔ جس میں مسلمان اپنے دین و شریعت کے مطابق آزادی سے عمل پیرا ہو سکیں، جہاں اسلامی اقدار کو تحفظ حاصل ہو، جہاں شرعی احکام کی تنفیذ ہو، جہاں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی ترقی ہو، جہاں امن وامان کا قیام ہو، جہاں مسلمانوں کی سیاسی و معاشی ترقی ہو، جہاں مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔ اس فصل میں ہم پاکستان کے قیام کے تاریخی و تہذیبی پس منظر کو اور پاکستان کے قیام کے اغراض و مقاصد کو زیر بحث لائیں گے۔

مسلمانوں کے متحدہ ہندوستان پر آٹھ سو سال تک حکومت کرنے کے بعد 1857ء میں جنگ آزادی کی ناکامی کے نتیجہ میں برصغیر پر انگریزوں کے قبضہ سے مسلمان عتاب کا شکار ہو گے۔ مسلمانان ہند نے آزادئ ہند کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ انگریزوں نے برصغیر میں برطانوی طرز حکومت قائم کرنے کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کے عنوان سے ایک جماعت کا قیام عمل میں لایا۔ چونکہ ہندو اکثریت میں تھے اس لیے مرکزی اور صوبائی سطح پر انتخابات سے ہندوؤں کو ہی فائدہ پہنچنا تھا۔ جس کے نتیجہ میں مسلمان انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندوؤں کے ماتحت ہو کر رہ جاتے۔ ہندوؤں نے انگریزوں کی چاپلوسی اور کاسہ لیسی شروع کر دی اور انگریزوں سے مقابلے کے امتحانات منعقد کروا کر ہندوؤں کے لیے ملازمتوں کے حصول کو بھی آسان بنایا۔ کلیدی عہدوں پر ہندو فائز ہوتے گے، یہ بات مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت تھی، اس لیے کے انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اور ہندو انگریزوں کے ساتھ مل کر اپنے مفادات کے حصول کے لیے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ مسلمان مفکرین میں سے سب سے پہلے سر سید احمد خان وہ شخص تھے جنھوں نے اس صورتحال کا ادراک کیا کہ مسلمان انگریزوں سے آزادی کے بعد ہندوؤں کی غلامی میں چلے جائیں گے اور مسلمانوں کا ہندوؤں کے ماتحت ہو کر رہنا ان کے معاشی، معاشرتی،

تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور مذہبی قتل کے مترادف ہے۔ چناچہ انھوں نے دو قومی نظریہ کا تصور پیش کیا۔ جس کو بنیاد بنا کر برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے لیے ایک آزاد خود مختار ریاست کا مطالبہ کیا۔ ایک ایسی ریاست جہاں مسلمانانِ ہند آزادی سے اپنے دین اور شریعت کے مطابق زندگیاں گزار سکیں۔ بقول محمد اسحاق بھٹی:

> "محمد بن قاسم کے سندھ کو فتح کرنے کے ساتھ ہی پاکستان کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ اسلام کی آمد تو برصغیر میں بعثت کے کچھ سال بعد ہی عربوں کے تجارتی قافلوں کے ذریعہ ہو چکی تھی۔ پچیس کے قریب صحابہ کرام ہندوستان تشریف لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سنہری دور میں بارہ صحابہ کرام ہندوستان تشریف لائے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں چار، علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تین، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں چار اور یزید کے زمانہ میں ایک صحابی ہندوستان تشریف لائے۔ اس کے علاوہ تابعین میں سے بیالیس آدمی اور تبع تابعین میں سے اٹھارہ آدمی بھی ہندوستان تشریف لائے۔"[1]

عربوں نے مجموعی طور پر 283 برس ہندوستان پر حکومت کی اور عربوں کا یہ دور تاریخِ ہندوستان میں سنہری دور شمار ہوتا ہے۔ محمد بن قاسم کے فتح سندھ کے بعد سے لیکر محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملہ تک مقامی مسلمان حکمران ہی اقتدار میں رہے لیکن انھوں نے حکومت کو مظبوط کرنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی جس کے نتیجہ میں مسلم حکومت زوال پذیر ہونے لگی۔"[2]

بقول سید حسن ریاض:

> "ہندوستان پر حملہ کے بعد 976ء سے 1148ء تک غزنویوں نے اس علاقہ پر حکومت کی اور پھر ان کے جانشین غوری خاندان نے 1148ء سے 1206ء تک برصغیر پر حکومت کی، جو اصلاً وسطی ایشیائی باشندے تھے۔ موجودہ پاکستان کے زیادہ تر علاقے ان کے زیر نگین تھے۔ 1206ء سے 1526ء تک مختلف خاندانوں کا برصغیر پر راج رہا۔ اس کے بعد سے مغلوں کا دور شروع ہوا جو 1857ء تک قائم رہا۔"[3]

---

[1] بھٹی، محمد اسحاق، **برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش**، (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1990ء)، ص195

[2] نجیب، اکبر شاہ آبادی، **آئینہ حقیقت نما**، (ہمدرد پریس، واقع کوچپالن، طبع یافت)، 9/1

[3] ریاض، سید حسن، **پاکستان ناگزیر تھا**، (شعبہ تصنیف وتالیف، ترجمہ، جامعہ کراچی۔ 2010ء)، ص4-5 (سید حسن ریاض 1894ء کو بلند شہر، اترپردیش، برطانوی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ وہ 1918ء صحافت سے وابستہ ہوئے اور ہمدم، ہمدرد اور ہمت کی مجلس ادارت میں شامل رہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں پاکستان ناگزیر تھا کا نام سرفہرست ہے۔ اس کتاب پر انہیں 1967ء کا داؤد ادبی انعام اور 1940ء سے 1980ء کے دوران تحریک پاکستان کے موضوع پر لکھی گئی بہترین کتاب کا اعزاز بھی ملا۔)

پروفیسر شریف المجاہد کے بقول:

"اکبر شاہ جہان اور اورنگزیب عالمگیر کا زمانہ مسلمانوں کے ہندوستان میں عروج کا زمانہ تھا۔ اورنگزیب عالمگیر کی رحلت کے بعد مسلمانانِ ہند مجموعی اعتبار سے زوال کی طرف بڑھنے لگے۔"[1]

مغلوں نے مجموعی طور پر تین صدیاں ہندوستان پر حکومت کی۔ برصغیر پاک وہند کے ہر گوشہ میں ان کا حکم چلتا تھا۔ ان کی سلطنت کی تباہی کے اسباب میں ان کا تخت کی جانشینی کا طریقہ کار، دین کی اشاعت میں سستی اور دینی معاملات سے روگردانی کرنا تھا۔ بقول سید حسن ریاض:

"اس بات کا احساس سب سے پہلے شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کو ہوا۔ انھوں نے نظام الملک بادشاہ کی توجہ اس طرف مبذول کروانے کی کوشش کی، لیکن بادشاہ نے اس طرف کوئی التفات نہ کیا اور اپنے اقتدار کی مظبوطی کی فکر میں لگا رہا۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے نجیب دولہ کو بھی اصلاح عمل کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کو مرہٹوں سے شکست کا سامنا کرنا پڑا اور شرائط پر صلح کرلی۔ مرہٹوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے پنجاب میں اٹک تک اپنی حکومت قائم کرلی۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو خطوط کے ذریعہ صورت حال سے آگاہ کیا اور ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ شاہ ولی اللہ کی دعوت کے نتیجہ میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کر کے ہندوستان کو مرہٹوں سے آزاد کروایا اور حکومت شاہ عالم کے سپرد کی[2]

انگریزوں کی برصغیر میں آمد:

1599ء میں انگریز تاجروں کے روپ میں برصغیر میں وارد ہوئے۔ شروع میں باقاعدگی سے شاہی رسوم وآداب کو بجالاتے اور بادشاہ کو ہدیے اور نذرانے وغیرہ بھی پیش کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ تجارتی مراسم کو ذریعہ بناتے ہوئے اعتماد کی فضاء قائم کی اور سامانِ تجارت کے لیے گودام حاصل کیے، پھر ان گوداموں کے تحفظ کے لیے مسلح گارڈز کا اجازت نامہ حاصل کیا اور اس بہانے سے اسلحہ وبارود سمگل کر کے ان گوداموں میں زخیرہ کرتے رہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہی گودام انکی عسکری چھاونیاں ثابت ہوئے۔

---

[1] پروفیسر، شریف، المجاہد، **تحریک پاکستان پس منظر و تجزیہ**، (قائد اعظم اکیڈمی کراچی، 1987ء)، ص 9

[2] ریاض، سید حسن، **پاکستان ناگزیر تھا**، ص 15

1757ء میں انگریزوں نے سازش کے ذریعہ نوابِ بنگال سراج الدولہ کو اس کے سپاسالار میر جعفر کی حمایت سے شکست دی اور پھر قتل کر دیا۔ اس تعاون اور غداری کے عوض میں انگریز نے میر جعفر کو بنگال کو نواب بنا دیا اور عملاً تمام اختیارات بھی حاصل کر لیے۔ یوں انگریزوں نے رفتہ رفتہ پورے ہندوستان کو اپنے ماتحت کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر 1857ء کی جنگ آزادی میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو شکست دے کر پورے ہندوستان کے فرمانروا بن بیٹھے۔ ان کا یہ قبضہ 1857ء سے 1947ء تک تقریباً پوری ایک صدی پر محیط رہے۔ مسلمانوں نے انگریز کے خلاف اپنی تحریک جاری رکھی۔ شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے فرزند شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا اور اپنے شاگرد اور مرید سید احمد شہید اور دیگر رفقاء کے ساتھ مل کر عسکری تحریک شروع کی جسے تحریک المجاہدین کے عنوان سے جانا جاتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ پنجاب کو سکھوں سے آزاد کرا کر ایک مرکز قائم کیا جائے جہاں سے متحد ہو کر ہندوستان کو انگریز سے آزاد کرانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن یہ تحریک بھی سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی بالاکوٹ کے مقام پر شہادت پر اختتام پذیر ہو گئی۔

ہندوؤں کی انگریزوں کے ساتھ قربتیں:

ہندو برصغیر میں اکثریت میں تھے اور ایک طویل عرصہ مسلمان حکمرانوں کے ماتحت رعایا کی حیثیت سے رہے۔ انھوں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوے انگریزوں کے ساتھ قربتیں بڑھا لیں اور ساز باز سے مقابلے کے امتحانات منعقد کروا کر اپنے لیے ملازمتوں کے حصول کو بھی آسان بنالیا۔ غرض ہندوؤں نے انگریز کے ماتحت رہ کر اپنے مفادات کے حصول کے لیے کوششیں تیز کر دیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے انگریز کے خلاف اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ چونکہ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ مسلمانوں سے اقتدار چھین کر کیا تھا اس لیے غدر کا الزام بھی صرف مسلمانوں کے سر لگایا اور انگریز سے بغاوت کر کے اقتدار واپس چھیننا یہ کام مسلمان ہی کر سکتے تھے۔ اس لیے انگریز کے نزدیک سب سے بڑے دشمن مسلمان ہی تھے۔ لہذا انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں لایا۔ جس کا مقصد مسلمانوں کے قومی تشخص کا خاتمہ کرنا تھا۔ مغربی جمہوری تصور کانگریس کے لیے بہت آئیڈیل تھا۔ اس کے ذریعے وہ برصغیر پر اپنی حکومت قائم کر سکتے تھے اور مسلمانوں کو اپنے زیر نگین لا سکتے تھے۔ مسلمانوں کو صرف حکومت سے ہی محروم نہیں کیا گیا تھا، بلکہ عمومی طور پر مسائل زندگی کے اعتبار سے بھی کمزور کر دیا گیا تھا۔ ان دِگرگوں حالات میں سر سید احمد خان مسلمانانِ ہند کے لیے نجات دہندہ کے طور پر سامنے آئے اور ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو بھی علومِ جدیدہ کے حصول کی ترغیب دلائی۔ اس ضمن میں انھوں نے سکول قائم کیا پھر کالج

کا قیام عمل میں لایا اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ان کا خیال تھا کہ مسلمان جدید علوم حاصل کر کے خود کو اس نئے ماحول میں ڈھال کر کے اپنی قوت کو مضبوط کر سکیں۔ شروع میں وہ انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کے حامی تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو مل کر انگریز کے خلاف جدوجہد کرنی چاہیے، لیکن جب 1867ء میں ہندوؤں نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ اردو کے بجائے ہندی زبان کو عدالتی زبان قرار دیا جائے تو انھیں شدید رنج ہوا اور یہ احساس ہو گیا کہ ہندوؤں کی مسلم دشمنی کہاں تک پہنچی ہوئی ہے اور مزید کتنی بڑھ سکتی ہے۔اس لیے انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ مشترکہ جدوجہد ترک کر دی اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔

کانگریس کا قیام:

1885ء میں انگریزوں نے اپنے ناپاک عزائم اور مذموم مقاصد کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے ہندوؤں کے ساتھ مل کر انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں لایا اور وائسرائے ہند سے اس کی باقاعدہ منظوری لی گئی۔ حسن ریاض رقمطراز ہیں:

"انڈین نیشنل کانگریس انگریزوں کی پیدا کردہ اور پروردہ ہے اور طویل زمانہ تک انھوں نے اس کی سربراہی اور سرپرستی کی۔"[1]

بظاہر اس کے قیام کا مقصد تمام ہندوستانیوں کی مذہبی، ثقافتی اور سیاسی نمائندگی کرنا اور برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کرنا تھا۔اس لیے بہت سے مسلمان رہنما بھی اس تنظیم میں شامل رہے، جن میں قائد اعظم محمد علی جناح اور دیگر رہنما بھی شامل رہے۔ لیکن درحقیقت کانگریس کے قیام کا مقصد انگریز کی پالیسی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کا حصہ تھا اور ہندوؤں کے نزدیک اونچی ذات کے ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ اور بالادستی تھی۔ شروع میں اس کے خفیہ مقاصد کھل کر سامنے نہیں آئے اور بظاہر اسے ہندوستان کی اجتماعی سیاسی پارٹی کے طور پر پیش کیا گیا اور مسلمانوں کو بھی دعوت دی گئی کہ وہ اس میں شمولیت اختیار کریں۔ کچھ مسلمان رہنماؤں نے اس کے خفیہ عزائم کا ادراک کرتے ہوئے اس میں شمولیت سے اعراض کیا۔ چناچہ کچھ ہی سالوں میں کانگریس بجائے برصغیر کی تمام مذہبی و ثقافتی اکائیوں کی سیاسی نمائندگی کرنے کے برہمن ہندوؤں کی نمائندہ بن کر سامنے آگئی۔ اس کا مقصد مسلم دشمنی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔اسی بات کو کوالم مداوا پائیکر نے جو ایک انڈین تاریخ دان تھے اپنی کتاب

---

[1] ریاض، سید حسن، **پاکستان ناگزیر تھا**، ص 33-34

"common sence about india"میں یوں ذکر کیا ہے:"1885ء میں قائم ہونے والی انڈین نیشنل کانگریس بھی زیادہ تر ایک ہندو تحریک تھی۔"[1]

جہاں انگریزوں نے مسلمانوں کے تعلیمی نظام کو مفلوج کیا وہاں کانگریس نے بھی انگریزوں کی رفاقت میں مسلمانوں کو سیاسی، معاشی اور تعلیمی طور پر کمزور کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ 1905ء میں تقسیم بنگال کے بعد کانگریس کی مسلم دشمنی کھل کر سامنے آگئی۔ "تقسیم بنگال کو بھارت کے لیے اصل بیداری قرار دیا گیا ہے۔"[2] اسی وجہ سے ہندوؤں نے تقسیم بنگال کو ختم کروانے کے لیے تحریک بھی چلائی۔ اس تحریک کے ذریعے برطانوی اشیاء کی خرید و فروخت کا بائیکاٹ کیا گیا جس کا مقصد برطانوی تجارت کو نقصان پہنچا کر اپنے مطالبات یعنی تقسیم کو کالعدم قرار دلوانا تھا۔ تاکہ انگریزوں کے اس خطے سے چلے جانے کے بعد یہاں صرف ہندوؤں کی حکمرانی قائم ہو سکے اور مسلمان ان کے ماتحت ہو کر رہیں۔ کانگریس کی اسی مسلم دشمنی اور تنگ نظری کی وجہ سے آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

مسلم لیگ کا قیام:

مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے 1906ء میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ایک تنظم قائم کی گئی جو کہ برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت کے طور پر سامنے آئی۔ شریف الدین پیرزادہ مسلم لیگ کے قیام کے مقاصد کو ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> "1906ء میں وقار الملک کی صدارت میں ہونے والے مسلمان رہنماؤں کے اجتماع میں نواب سلیم اللہ خان کی تحریک پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے مندرجہ ذیل مقاصد کے لیے ایک سیاسی تنظیم قائم کی جائے گی۔ 1- حکومت برطانیہ کے لیے مسلمانوں کے وفاداری کے جذبات کو فروغ دیں اور اگر کوئی غلط فہمی ہو تو اسے دور کیا جائے۔ 2- حکومت برطانیہ کے سامنے مسلمانوں کی ضروریات اور آرزؤں کو مؤدبانہ انداز میں پیش کرنا اور مسلمانوں کے سیاسی مفادات کو تحفظ دے کر انھیں آگے بڑھانا۔ 3- ہندوستانی مسلمانوں میں ہندوستان میں بسنے والی دیگر اقوام کے لیے جارحانہ احساسات کی روک تھام کرنا تھا۔"[3]

---

[1] K.M. Panikkav, **Common Sence aborut India**, Victor Gallency, 1960, p 19

[2] تمیمی، جہانگیر حسین، پروفیسر، **زوال سے اقبال تک، مرکز مطالعات**، جنوبی ایشیاء پنجاب یونیوسٹی، لاہور۔

[3] پیرزادہ، شریف الدین، **مسلم لیگ کا قیام پس منظر اور جدوجہد**، مترجم: شمیم آبادی، (نظریہ پاکستان فاونڈیشن لاہور، اگست 2006ء)، ص16

قائداعظمؒ کی مسلم لیگ میں شمولیت:

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے 1913ء میں مسلم لیگ کی رکنیت حاصل کی اور بعدازاں انھوں نے مسلم لیگ کی باگ ڈور سنبھالی۔ مسلم لیگ نے ان کو تاحیات صدر نامزد کیا۔ 1928ء کی نہرو رپورٹ سے پہلے تک قائداعظم ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ لیکن نہرو رپورٹ کی وجہ سے انھیں شدید صدمہ پہنچا؛ کیوں کہ اس رپورٹ کی رو سے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کو ناقابل قبول قرار دیا گیا۔ اس کے جواب میں قائداعظم نے اپنے چودہ نکات 1929ء میں پیش کیے لیکن کانگریس نے انھیں ماننے سے انکار کر دیا۔ قائداعظم کچھ عرصہ کے لیے برطانیہ میں مقیم ہو گئے لیکن مسلم زعماء نے انھیں خطوط لکھ کر وطن واپس آنے پر آمادہ کر دیا۔ چناچہ 1934ء میں وطن واپس آکر مسلم لیگ کی ذمہ داری سنبھال لی اور جماعت کو نئے سرے سے منظم کیا۔ پورے ہندوستان کے مختلف حصوں کے دورے کیے اور تحریک میں ایک نئی روح پھونک دی۔ 1938ء میں آپ کو قائد اعظم کے لقب سے نوازا گیا۔ قائداعظم ایک نڈر، شجاع، اصول پرست، دانا، بے باک، دور اندیش، حکیم اور غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل شخصیت تھے۔ قائداعظم وہ عظیم اور بے باک لیڈر تھے جن کی مدح میں انگریزوں نے بھی اقرار کیا کہ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ جناح اتنی سخت بیماری کا شکار ہیں تو پاکستان کا بننا ممکن نہ ہوتا۔ قائداعظم نے اپنے آخری وقت تک بیماری کو ظاہر نہ ہونے دیا اور پوشیدہ رکھا۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ اگر انگریزوں اور ہندوؤں کو ان کی بیماری کا علم ہو گیا تو وہ تقسیم ہند کو مؤخر کر دیں گے۔ ان کی دور اندیشی اور لازوال قربانیوں کی وجہ سے ہی ہم آج پاکستان کی آزاد فضاء میں سانس لے رہے ہیں۔

علامہ اقبال اور نظریہ پاکستان:

علامہ محمد اقبال نے مملکتِ خداداد پاکستان کی فکری بنیادیں فراہم کیں۔ اسی باعث انھیں مصور پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔ وہ بیسویں صدی کے عظیم مسلم مفکر تھے، جنھوں نے مسلمانوں کی خوابیدہ روح کو بیدار کیا۔ علامہ اقبال نے الٰہ آباد کے جلسے میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے سب سے پہلے مسلم ہندوستان کا نقشہ پیش کیا۔ جس نے بعد میں پاکستان کے نام سے ایک تحریک کی شکل اختیار کی۔ 1947ء کو اس خواب کی حقیقی تعبیر مملکت پاکستان کی شکل میں سامنے آئی۔ بقول شریف الدین پیرزادہ:

> "علامہ اقبال بھی دوسرے مسلم راہنماؤں کی طرح ابتداء میں مسلم ہندو اتحاد کے حامی تھے۔ بعدازاں ہندوؤں کی شاطرانہ سیاسی چالبازیوں سے آگاہ ہو کر اپنے نظریات کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو گے۔ اسی لیے انھوں نے

خطبہ الٰہ آباد میں اس کا مطالبہ کیا کہ میں چاہوں گا کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست بنا دیا جائے اور اسے خود مختاری دے دی جائے۔"[1]

نہرو کمیٹی نے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا کیوں کہ اس خطبہ میں اقبال نے دو قومی نظریہ کو بہت عمدہ انداز میں پیش کیا کہ ہندو مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں جن کا ایک ساتھ رہنا مشکل ہے۔ علامہ اقبال اپنی شاعری اور افکار سے مسلمانوں کے دلوں میں بستے تھے۔ انھوں نے اسلامی تصورِ قومیت مسلمانوں کے ذہنوں میں راسخ کر دیا تھا اور مسلمانانِ ہند انھیں اپنا نظریاتی امام مانتے تھے۔ علامہ اقبال نے خط لکھ کر قائدِ اعظم محمد علی جناح کو برطانیہ سے واپس ہندوستان آنے پر آمادہ کیا اور انھیں یہ بات باور کروائی کہ مسلمانانِ ہند کے لیے ایک الگ وطن کا قیام ناگزیر ہے۔ لہذا مسلم لیگ کا جو لائحہ عمل طے کیا جائے وہ الگ وطن کے تناظر میں ہو تب ہی کامیابی حاصل ہو گی۔ چناچہ علامہ اقبال کا دیا ہوا تصورِ پاکستان اور نظریہ پاکستان دس سال بعد 1940ء میں قائدِ اعظم کی قیادت میں قراردادِ پاکستان کی صورت میں نمودار ہوا اور ان کی اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر ان تھک محنت اور کوششوں کے نتیجہ میں 1947ء کو یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا۔

قراردادِ پاکستان:

ہندوستان میں برطانوی سامراج نے اقتدار کو عوام میں منتقل کرنے کے پہلے مرحلے میں 37-1936ء کو پہلے عام انتخابات منعقد کروائے جس میں مسلم لیگ کو جو برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کی دعوی دار تھی، سخت ہزیمت اٹھانی پڑی۔ کیوں کہ وہ کسی ایک صوبے میں بھی اقتدار حاصل نہ کر سکی۔ اسے تمام گیارہ صوبوں میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کانگریس نے پانچ صوبوں میں واضح اکثریت حاصل کی اور باقی صوبوں میں دیگر جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک مخلوط حکومت تشکیل دی۔ بلکہ جن صوبوں میں مسلمان حاوی تھے مثلاً آسام اور سندھ وہاں بھی کانگریس نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ گویا مسلم لیگ ہندوستان کے سیاسی دھارے سے غائب ہوتی جا رہی تھی جس سے مسلم لیگ کی قیادت کے اور کارکنوں کے حوصلے پست ہونے لگے اور مایوسی کا عالم طاری ہو گیا۔

کانگریس برسر اقتدار تھی اس نے اقتدار کے نشے میں ایسے اقدامات اٹھائے جنھوں نے مسلمانوں کے دلوں کے اندر بہت سے خطرات اور شبہات کو جنم دیا۔ جیسا کہ کانگریس نے اردو کے بجائے ہندی کو قومی زبان قرار دیا، کانگریس کے پرچم ترنگے کو قومی

---

[1] صدیقی، اقبال احمد، مترجم: **علامہ اقبال تقریریں، تحریریں اور بیانات**، (اقبال اکیڈمی لاہور، طبع دوم، 2015ء)، ص 27

پرچم قرار دیااور گائے کو ذبح کرنے پر پابندی عائد کی۔اس صورت حال کے پیشِ نظر مسلم قیادت کو احساس ہوا کہ ان کے اقتدار سے محروم ہونے کا سبب یہ ہے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔یہ مسلمانوں میں دو قومی نظریہ کی بیداری کا نقطہ آغاز تھا۔

دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کی حمایت کے سلسلہ میں کانگریس اور برطانوی راج میں مذاکرات کے دوران اختلاف کی وجہ سے کانگریس نے اقتدار سے علیحدگی اختیار کرلی۔ یوں مسلم لیگ کے لیے ماحول سازگار ہوا۔اس پس منظر میں 22 تا 24 مارچ 1940ء کو لاہور کے منٹو پارک میں مسلم لیگ کا تین روزہ اجلاس ہوا۔ اس وقت پنجاب میں حالات بہت کشیدہ تھے۔ امکان تھا کہ اجلاس نہ ہونے دیا جائے۔ ہنگامہ برپا کیا جاسکتا تھا۔اس موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے قائد اعظم نے اپنا خطاب افتتاحی اجلاس میں کیا۔اس خطاب میں دو قومی نظریہ اور قیام پاکستان پر روشنی ڈالی اور یہ واضح کیا کہ ہندوستان کا مسئلہ فرقہ وارانہ نوعیت کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ بین الاقومی نوعیت کا ہے اور یہ مسئلہ دو بڑی قوموں کے مستقبل کا مسئلہ ہے، جن کے درمیان فرق واضح ہے اور ایک مرکزی حکومت ان کو متحد نہیں کر سکتی بلکہ اس مسئلہ کا واحد حل دو علیحدہ مملکتوں کا قیام ہے۔دوسرے دن 23 مارچ کو شیر بنگال مولوی فضل الحق نے تاریخی قرارداد پیش کی جسے قرارداد لاہور کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس میں مسلمانوں کی عددی اکثریت والے علاقوں کی حد بندی کی تجویز پیش کی گئی اور یہ کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو یکجا کر کے آزاد مملکتیں قائم کی جائیں اور یونٹوں کو خود مختاری حاصل ہو۔اس قرارداد کی تائید پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے رہنماؤں نے کی۔23 مارچ کے اختتامی اجلاس میں اس قرارداد کو منظور کیا گیا اور بعد میں اس قرارداد کو مسلم لیگ کے آئین میں شامل کر لیا گیا۔

تحریکِ پاکستان اور علماءِ کرام:

تحریک پاکستان میں جہاں بے شمار لوگوں نے ناقابل فراموش قربانیاں پیش کیں وہاں متعدد علماء کرام کی قربانیاں، خدمات اور کردار تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ تمام مکاتب فکر کے علماء کرام نے ہر قسم کے مسلکی اختلاف اور تفرقہ کو بالائے طاق رکھ کر ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کو مذہبی فریضہ قرار دیا؛ کیوں کہ تحریک پاکستان درحقیقت مسلمانوں کی مذہبی ثقافت اور قومی تشخص کے تحفظ کی جدوجہد تھی۔اس کا مقصد مسلمانوں کی بحیثیت قوم شناخت منوانا اور ان کے حقوق کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔یہ کام ایک علیحدہ ریاست کے وجود کے بغیر ممکن نہیں تھا۔یوں تو 23 مارچ 1940ء کا جلسہ تحریک پاکستان کا باقاعدہ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا اصل آغاز مسلمانوں کی کانگریس سے علیحدگی سے ہی شروع ہو گیا تھا۔علامہ اقبال نے 1930ء میں برصغیر

کے شمال مغرب میں علیحدہ مسلم ہندوستان کا تصور پیش کیا۔ جسے چودھری رحمت علی نے 1933ء میں پاکستان کے نام سے موسوم کیا۔ 1938ء میں صوبہ سندھ میں مسلم لیگ نے اپنا سالانہ اجلاس منعقد کیا جس میں ہندوستان کی تقسیم یعنی علیحدہ وطن کے حصول کے لیے قرارداد پاس کی اور 1940ء سے باقاعدہ قائدِاعظم کی قیادت میں اس کے لیے تحریک شروع ہوئی۔

1757ء میں انگریز کی برصغیر آمد کے بعد سے ہی مختلف آزادی کی تحریکیں چلتی رہیں جو مسلح بھی تھیں اور سیاسی نوعیت کی بھی تھیں۔ ہندوستان کی انگریز سے آزادی کو لے کر علماء کی آراء دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک جماعت کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہندوستان پر اقتدار اہل ہند کا حق ہے اور غیر ملکی قابضین کو ہندوستان چھوڑ دینا چاہیے۔ اس سیاسی فکر کو لے کر مسلمانوں اور ہندوؤں میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی تھی اور اسی ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر گریٹ الائنس یعنی کانگریس بھی وجود میں آئی جہاں سیاسی وحدت کے طور پر ہندو مسلم قیادت یکجا دکھائی دینے لگی جس کی وجہ سے برطانوی سامراج ملک بدری پر مجبور دکھائی دینے لگا۔ چناچہ انگریزوں نے شاطرانہ چال چلتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد میں دراڑیں ڈالنا شروع کر دیں۔ چونکہ انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اور مسلمانوں نے ہی سامراج کے خلاف بغاوت میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اب انگریزوں نے انتقام لیتے ہوئے مسلمانوں کی راہ کو ایسا الجھا دیا کہ دوبارہ کبھی پورے ہندوستان پر اقتدار حاصل نہ کر سکیں۔ مسلم قیادت کا جمعیت علمائے ہند اور مسلم لیگ کے عنوان سے تقسیم ہونا انگریزوں کے لیے اپنے مشن میں بڑی کامیابی ثابت ہوا؛ کیوں کہ جمعیت علمائے ہند کل ہندوستان کی آزادی پر مصر ہو گی اور مسلم لیگ تقسیم ہند کے فارمولے کو بہتر سمجھنے لگی۔ اس نظریاتی اختلاف کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز قابض سے قاضی بن کر بیٹھ گئے اور تقسیم کے سیاسی مسئلہ کو مذہبی رنگ دے دیا گیا اور فقہی مسئلہ بنا کر مخالفت کرنے والوں کو پاکستان اور اسلام دشمن قرار دیا گیا اور پھر (پاکستان کا مطلب کیا): "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا جذباتی نعرہ دے کر مسلمانوں کی کثیر تعداد کو تقسیم ہند کے مطالبے پر آمادہ کر لیا۔ انگریز نے مسلمانوں کو پوری ہندوستانی سلطنت لوٹانے کے بجائے مسلم اکثریتی علاقوں کے مطالبہ تک محدود کر دیا اور مسلمانوں کو ان کی زیر ملک زمینیں خیرات میں دے کر اپنا ممنون بنا کر واپس برطانیہ لوٹ گیا۔ انگریز کی انہی شاطرانہ چالوں کا ادراک کرتے ہوئے علماء کی ایک جماعت نے تقسیم ہند کے فارمولے کی مخالفت کی اور کل آزادی ہند کے مطالبہ پر مصر رہے۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد پھر کسی نے بھی پاکستان کی مخالفت کبھی نہیں کی اور یہ واضح کیا کہ جس طرح مسجد کے کسی جگہ پر بننے یا نہ بننے پر اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن مسجد کے بن جانے کے بعد پھر اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

علماء کی ایک جماعت وہ بھی تھی کہ جنھوں نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس بات کا ادراک کر لیا کہ انگریز نے جو مغربی طرز جمہوریت کو متعارف کروایا ہے اس کی وجہ سے مسلمان ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے ماتحت ہو کر رہ جائیں گے؛ کیوں کہ ہندو برصغیر میں اکثریت میں تھے اور مسلمان اقلیت میں اس لیے علماء نے برصغیر کی آزادی کی تحریک سے لے کر پاکستان کے دینی نعرے "پاکستان کا مطلب کیا: "لَا اِلٰہَ اِلَا اللّٰہُ مُحَمَّدَ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" تک اور پاکستان کے قیام اور پرچم کشائی تک ہر موقع پر اپنا کردار ادا کیا۔ ان علماء میں ایک نام مولانا اشرف علی تھانوی کا ہے جن کے بارے میں قائد اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ "مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑے عالم ہیں جن کا علم و تقوی اور تقدس سب پر بھاری ہے۔ مسلم لیگ کو ان کی حمایت حاصل ہے۔" یہاں پر ہم تحریک پاکستان میں کوشاں چند علماء کرام کا تذکرہ کریں گے۔

مولانا اشرف علی تھانوی:

مولانا اشرف علی تھانوی کا تحریک پاکستان میں کلیدی کردار رہا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی ایک عالم دین اور صوفی منش انسان تھے۔ اپنے علم و فضل اور تقوی کی وجہ سے دوسروں پر ممتاز تھے۔ بڑے بڑے علماء کرام آپ کے شاگرد و مرید تھے۔ جن میں سید سلیمان ندوی بھی شامل ہیں۔ جب پہلی جنگ عظیم کے وقت مسلمانوں نے تحریک خلافت شروع کی تو ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا لیکن سید سلیمان ندوی نے اسے مثبت نتیجہ خیز نہ سمجھا۔ اس معاملہ میں دیوبند انتظامیہ سے اختلافات شدید ہو گئے تو انھوں نے استعفی دے دیا۔ پھر بعد میں تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کی۔ گو کہ خود علالت کے باعث مسلم لیگ کے اجلاسوں میں شریک نہ ہو سکے، البتہ ان کے تحریریں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی ایک بڑے عالم دین تھے۔ انھوں نے ہندوؤں کی چال بازیوں کو بھانپتے ہوئے فرمایا کہ ہندو بہت احسان فراموش قوم ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ غدر کے وقت بھی ہندوؤں نے مسلمانوں کی حمایت کا اعلان کیا لیکن بعد میں سارا الزام مسلمانوں پر ڈال دیا۔ ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر وجود میں آنے والی انڈین نیشنل کانگریس میں مسلمانوں نے بھی حصہ لیا اور بڑھ چڑھ کر قربانیاں دیں۔ لیکن بعد میں ہندوؤں نے خبثِ باطن کو ظاہر کرتے ہوئے شدھی تحریک بھی چلائی جس کا مقصد مسلمانوں کو ان کے مذہب سے ہٹا کر ہندو بنانا تھا۔

پروفیسر احمد سعید لکھتے ہیں:

"اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں: ان باتوں کے ہوتے ہوئے بھی بعض بد فہم اور بے سمجھ ان کو دوست سمجھ کر ان کی بغلوں میں گھستے ہیں۔"[1]

ان کے نزدیک مسلمانوں کی کانگریس میں شرکت اسلام اور مسلمانوں دونوں کے لیے خطرناک تھی۔اسی طرح مسلم لیگ کے ایک جلسے میں ان کا خط پڑھ کر سنایا گیا کیوں کہ وہ کچھ مصروفیات اور علالت کے باعث خود شرکت نہیں کر سکے تھے۔اس خط میں لکھا تھا:

"میں دلی طور پر آپ کے ساتھ ہوں، مسلم لیگ جن مقاصد حسنہ کو لے کر اٹھی ہے میں ان سے پوری طرح متفق ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ ترقی کی منازل کو طے کرتی رہے۔ میں مسلمانوں کو بھی مشورہ دوں گا کہ وہ اپنی بساط کے مطابق اس کی ترقی کے لیے کوشش کریں اور شرعی لحاظ سے جو کمی کوتاہی ہو اس کی اصلاح کی بھی کوشش کریں۔"[2]

مولانا اشرف علی تھانوی تصور پاکستان اور تخیل پاکستان کے بانیوں میں سے ہیں۔اسی لیے عبدالماجد دریاآبادی نے 1928ء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ سے اپنی پہلی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا: "پاکستان کا تخیل، خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان پڑیں"۔[3]

مولانا شبیر احمد عثمانی:

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا بھی تحریک پاکستان میں بہت اہم کردار ہے۔انھوں نے اس سے پہلے تحریک خلافت میں بھی حصہ لیا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی دارالعلوم دیوبند کے جید علماء میں سے تھے۔ جمعیت علماء اسلام کے بانی صدر تھے۔ جن علماء نے مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شمولیت سے منع کیا تھا، علامہ شبیر احمد عثمانی نے ان کے فتاویٰ کا مدلل رد پیش کیا۔ 1945ء میں مسلم لیگ کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے بھرپور انداز میں انتخابات کی اہمیت کو اجاگر کیا اور مسلم لیگ کے برطانیہ کا حمایتی ہونے کے پروپیگنڈے کا بھی رد کیا۔ وہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے۔انھی کی کوششوں سے 1949ء کو قرار

---

[1] سعید احمد، پروفیسر، **مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی**، (مجلس صیانۃ المسلمین لاہور، 1948ء) ص 31

[2] علوی، مسعود احسن، پروفیسر، **ارشادات حکیم الامت**، (طبع ثانی: جنوری 1938ء ادارہ اسلامیات، لاہور)، ص 531

[3] دریاآبادی، عبدالماجد، **نقوش واثرات حکیم الامت**، (مکتبہ مدینہ، اردو بازار لاہور، 1969ء)، ص 28

دادِ پاکستان بھی منظور ہوئی۔ 13 دسمبر 1949ء کو ان کی وفات ہوئی اور اسمبلی اجلاس کے دوران وزیراعظم لیاقت علی نے انھیں زبردست خراجِ تحسین پیش کیااوران کی وفات کو پوری قوم کا نقصان قرار دیا۔

مولانا ظفر احمد:

مولانا شبیر احمد عثمانی کے بھائی مولانا ظفر احمد عثمانی بھی تحریک پاکستان کے سرکردہ راہنماؤں اور جمعیۃ علماء اسلام کے بانیوں میں سے تھے۔ کانگریس میں شمولیت کے بارے میں ان کا نقطہ نظر سخت تھا۔ وہ اس کو غیر اسلامی گردانتے تھے۔ مسلم لیگ کی کھل کر حمایت کرتے تھے؛ کیوں کہ وہ نظریہ پاکستان کی علمبردار جماعت تھی۔ قیام پاکستان کے وقت علامہ شبیر احمد عثمانی نے مغربی پاکستان میں پاکستان کا پرچم لہرایااور مشرقی پاکستان میں علامہ ظفر احمد عثمانی نے پاکستان کا پرچم لہرایا۔

مولانا مودودی:

مولانا مودودی تحریک آزادی اور تقسیم ہند کے راہنماؤں میں سے ایک اہم راہنماء تھے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بارے میں ان کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے: ان کی پہلی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کی جملہ اکائیوں اور اقوام پر مشتمل ایک وفاق بنا کر ہر قوم کو تہذیبی آزادی دی جائے۔ وہ اپنا نظامِ حکومت اپنے اصولوں اور روایات کے مطابق آزادانہ چلا سکیں۔ قوموں کی آبادی کے تناسب سے انتظامی اداروں میں ان کو حصہ دیا جائے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ پچاس سال کا عرصہ متعین کر کے مختلف اقوام کو امورِ حکومت چلانے کے لیے زمینیں مختص کر دی جائیں۔ اس دوران وفاقی اختیارات کو کم کرتے ہوئے مقامی حکومتوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں۔ تیسری تجویز یہ تھی کہ اگر پہلی دونوں تجاویز ناقابل قبول ہوں تو پھر مسلمانوں کی ریاستیں اور ان کا وفاق الگ بنایا جائے۔ (یہ تجویز گویا آزاد مسلم ریاست کے قیام کی تجویز تھی) اسی طرح ہندو ریاستوں کے لیے بھی الگ وفاق کی تجویز پیش کی اور ان وفاقوں کے درمیان باہمی تعاون اور تجارت اور دیگر امور میں تعلقات ہوں۔[1] مولانا مودودی نے 1939ء میں ترجمان القرآن رسالہ میں کانگریس کو بے نقاب کرنے اور مسلمانوں کو بیدار اور خبردار کرنے کے لیے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ مسلمانانِ ہند کی تاریخ بیان کی اور جمہوری طرز حکومت کی خرابیوں سے بھی مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت میں ہیں، لہذا جمہوری نظام میں ہندوؤں کے چار ووٹ اور مسلمانوں کا صرف ایک ووٹ ہوگا۔[2] یعنی

---

[1] قریشی، اشتیاق حسین، **علماء میدان سیاست میں، مترجم ہلال احمد زبیری**، (شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، جولائی 1994ء)، ص 432

[2] ماہانہ **چراغِ راہ، کراچی، نظریہ پاکستان نمبر**۔ ص 520

مسلمان ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے ماتحت ہو کر رہ جائیں گے۔ مولانا مودودی نے مسلمانوں میں آزادی کی تحریک پیدا کرنے اور غلبہ اسلام کے لیے ایک جماعت قائم کی جو جماعت اسلامی کے نام سے مشہور ہوئی۔

مولانا اکرام اللہ خان بنگالی:

مولانا اکرام اللہ خان بنگالی کا تعلق مشرقی بنگال سے تھا۔ تحریک پاکستان کی حمایت کرنے والے تھے۔ انھوں نے لوگوں کو مسلم لیگ کی حمایت کی جانب راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ "روزنامہ آزاد" جو بنگالی اخبار تھا اس کے ایڈیٹر بھی تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد پہلی مجلس دستور کے ممبر بھی رہے۔[1]

مولانا احمد رضا خان بریلوی:

مولانا احمد رضا خان بریلوی ہندوستان کے ایک جید عالم دین تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے مخالف تھے۔ اسی لیے جب ان سے ترک موالات پر دستخط کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ سیاسی آزادی کے قطعاً مخالف نہیں ہیں مگر وہ ہندو مسلم اتحاد کے خلاف ہیں۔[2]

مولانا نعیم الدین مراد آبادی:

مولانا نعیم الدین مراد آبادی بھی ہندوستان کے ایک عالم تھے اور مولانا احمد رضا خان بریلوی کے جانشین تھے۔ انھوں نے اس بات کا ادراک کر کے کہ انگریز کا اب ہندوستان میں زیادہ دیر رہنا مشکل ہے اور ان کے جانے کے بعد اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ اس خیال سے وہ بھی ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کے حامی ہو گئے۔ 1940ء میں جب قرارداد پاکستان منظور کی گئی تو انھوں نے اس کے بعد باقاعدہ اپنی جماعت کے ساتھ مل کر پاکستان کے قیام کی تحریک میں عملی طور پر حصہ لینا شروع کر دیا اور اپنی تقریروں کے ذریعے قیام پاکستان کے نظریے کی حمایت اور وضاحت کرتے رہے۔[3]

---

[1] قریشی، ص238

[2] ایضاً: ص440

[3] ایضاً: 441

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی:

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے اور ایک جید عالم ہونے کے ناطے دینی حلقے ان کی حیثیت کو تسلیم کرتے تھے۔ درس وتدریس کی مشغولیت کی وجہ سے خود کو عملی سیاست سے الگ رکھتے، مگر اس کے باوجود علامہ شبیر احمد عثمانی کے ساتھ مل کر تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔

مفتی شفیع عثمانی نظریہ پاکستان کے زبردست حمایتی تھے اور تحریک پاکستان کی مخالفت کو اسلام کی مخالفت سمجھتے تھے اسی لیے انھوں نے عملاً علامہ شبیر احمد عثمانی کے ساتھ مغربی سرحد میں استصواب رائے کے وقت حصہ لیا۔ پاکستان کی دستور سازی میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا اور بہت سی اسلامی دفعات دستور میں شامل کروائیں۔

خلاصہ:

اس فصل کا خلاصہ یہ ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد جب انگریز پورے برصغیر پر قابض ہوگئے تو مسلمان عتاب کا شکار ہوگئے۔ ہندوؤں نے انگریزوں کے ماتحت اپنے مفادات کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں اور انگریز کی چاپلوسی اور کانسہ لیسی شروع کر کے اپنے لیے ملازمتوں کا حصول بھی آسان بنالیا اور کلیدی عہدوں پر فائز ہوگئے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر آزادی ہند کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں لیکن جلد ہی انھیں اس بات کا احساس ہوگیا کہ ہندوؤ مسلمانوں کے ساتھ مخلص نہیں ہیں اور انگریز کے برصغیر سے چلے جانے کے بعد مسلمان ہندوؤں کے ماتحت ہو کر رہ جائیں گے اور ان کی غلامی میں چلے جائیں گے۔ مسلمانوں کا ہندوں کے ماتحت ہو کر رہنا ان کے مذہبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی قتل کے مترادف ہوگا۔ اس پس منظر میں مسلمانانِ ہند نے دو قومی نظریہ کا تصور پیش کر کے اپنے لیے ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ کیا اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ اس تحریک میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خاص طور پر تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کے جنھوں نے ہر قسم کے مسلکی اختلاف اور تفریق کو بالائے طاق رکھ کر ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کو مذہبی فریضہ قرار دیا کیوں کہ یہ تحریک جسے تحریکِ پاکستان کا نام دیا گیا یہ مسلمانانِ ہند کی مذہبی ثقافت اور قومی تشخص کی جدوجہد تھی اسی لیے مسلمانوں نے پاکستان کا مطلب کیا؟ لاالہ الااللہ کے مقدس نعرہ کے نیچے جمع ہو کر قیام پاکستان کے لیے اپنی آواز بلند کی اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے 14 اگست 1947ء کو پاکستان ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا۔

فصل سوم: شرعی احکام کی تنفیذ میں ریاست پاکستان کے فرائض واختیارات

فصل سوم: شرعی احکام کی تنفیذ میں ریاست پاکستان کے فرائض واختیارات

ملک خداداد پاکستان اسلام کے مقدس نام پر معرضِ وجود میں آیا ہے۔ پاکستان کا قیام ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے ہوا ہے اور اس کی تشکیل نو اسلامی اصولوں کے عین مطابق ہونی تھی۔ چاہے وہ سیاسی نوعیت کی ہو، معاشی ہو، معاشرتی ہو یا تعلیمی۔ اسلامی تعلیمات چونکہ پوری انسانی زندگی پر حاوی ہیں اس لیے اسے مکمل دین کہا گیا ہے۔

اس کامل دین میں انسان کی سیاسی، معاشی، اخلاقی، معاشرتی، روحانی، اور ثقافتی و تمدنی حیات کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے اصول موجود ہیں۔ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں میں راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اسلام کی یہی وہ خصوصیت ہے جو اسے تمام ادیان اور نظامہائے فکر سے ممتاز کرتی ہے۔ اسلام نے ریاست کے متعلق جو تعلیم دی ہے وہ بھی دیگر ریاستوں کے اصولوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اسلامی ریاست میں اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کے لیے ہے اور وہی تمام احکام و فرامین کا سرچشمہ ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ[1]﴾ "اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔" یعنی اقتدار اعلیٰ صرف اللہ رب العزت کی ذات کا ہے اور انسان اللہ کے نائب کی حیثیت سے اجتماعی امور کو چلاتا ہے۔ اسلامی ریاست میں حکومت کے بجائے خلافت کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اور منتظمن ریاست کو عظیم الشان نمائندگی کرنا ہوتی ہے۔ وہ خود مختار نہیں ہوتے۔ ان کا کام یہ ہے کہ احکامِ خداوندی کو نافذ کریں۔ اس فصل میں ہم پاکستان میں حکومت کے فرائض واختیارات کو زیر بحث لائیں گے۔

اسلامی ریاست کی حیثیت:

اسلامی ریاست کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد علوی رقمطراز ہیں:

> "اسلامی ریاست "معاہدہ ربانی" پر قائم ہے جس کا مطلب ہے کہ انسان نے خدائے واحدہ لاشریک سے معاہدہ اطاعت کیا تھا۔ اسلامی ریاست اس معاہدہ پر مبنی معاشرہ منظم کرتی ہے۔ یہ معاہدہ ایسا ہے جس میں ریاست کا ہر فرد مسؤل ہے۔ کوئی شخص اطاعت سے بالا تر نہیں اور کوئی شخص احکام خداوندی سے بغاوت کر کے اسلامی ریاست کی انتظامیہ میں نہیں رہ سکتا۔[2]

---

[1] یوسف:40

[2] خالد علوی، ڈاکٹر، **اسلام کا معاشرتی نظام، اسلام اور جدید معاشی نظریات**، (الفیصل ناشران وتاجران کتب غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور، 2009ء)، ص285

اس ضمن میں ارشاد ربانی: ﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ۔۔۔[1]﴾ میں سربراہ اور حاکم کے کردار کو اسلام نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور یہ آیت کریمہ اسلامی طرز حکومت کے خدوخال کو بھی واضح کرتی ہے اور حکومت چلانے والوں کے اوصاف کو بھی بیان کرتی ہے۔ یعنی ریاست کا قیام اسلام میں مقصود بالذات نہیں ہے، بلکہ یہ تو ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد اللہ کی زمین پر اللہ کے نظام کا نفاذ ہے۔ اسی لیے اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں باقی ریاستوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ جیسا کہ ایک غیر اسلامی ریاست کی ذمہ داری فوج کے ذریعے سرحدوں کی حفاظت، انتظامیہ کے ذریعے حکومتی نظم ونسق چلانا اور پولیس کے ذریعے امن وامان کی بحالی ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک اسلامی ریاست یہ تمام ذمہ داریاں بھی ثانوی درجہ میں رکھتی ہے، مگر اولین درجہ میں اس کی ذمہ داری احکام اسلام کی تنفیذ ہے۔ "پوری ریاست میں نظام صلوٰۃ وزکوٰۃ کو قائم کرنا، معروفات کی اشاعت کرنا اور منکرات کا سدباب کرنا، اس کام کے لیے محکمے قائم کرنا، عدل وانصاف کے نظام کو رائج کرنا اور اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنا یہ سب ایک اسلامی ریاست کے قیام کے اولین مقاصد میں شامل ہے۔"[2]

قرآن کریم کی رو سے انسانی حکومت کی صرف وہ صورت درست ہے جس میں ریاست خدا اور رسول کی قانونی بالادستی تسلیم کرکے اپنی حاکمیت سے دستبردار ہو جائے اور حاکم حقیقی کے تحت خلافت (نیابت) کی حیثیت قبول کرے۔ اس کے اختیارات تشریعی ہوں یا عدالتی، انتظامی ہوں یا معاشی، لازماً اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے تابع ہوں گے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ[3]﴾ اور اتاری ہے ہم نے آپ پر کتاب سچی، تصدیق کرنے والی ہے پہلی کتابوں کی اور ان پر نگہبان ہے، سو آپ ان میں اس کے مطابق فیصلہ کریں جو آپ پر اتارا گیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی مت کریں اس لیے کے آپ کے پاس حق آچکا ہے۔ اور ﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ۔۔۔[4]﴾ اے داؤد! آپ کو خلیفہ بنایا ہے ہم نے زمین میں۔ پس آپ لوگوں میں حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ کریں اور خواہشات کی پیروی مت کریں۔ وہ خواہشات کی پیروی آپ کو اللہ تعالیٰ کے راستہ سے ہٹادیں گی۔

---

[1] الحج: 41

[2] اعوان، امیر افضل، **مسلم معاشرہ میں حکمران کا کردار اور دور حاضر کے تقاضے**، (رنگ ونور، 10 رمضان المبارک، 1440ھ)

[3] المائدہ: 48

[4] ص: 40

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اختیار دیئے ہیں انہیں وہ منشائے الٰہی کے مطابق استعمال کرے۔اسی خصوصیت کی بناپر اسے خلیفہ کہا گیا اوراس کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَآئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً[1]﴾اورجب کہا تیرے پروردگار نے فرشتوں سے بے شک میں بناتاہوں زمین میں ایک خلیفہ۔﴿وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ[2]﴾ اور ہم نے زمین میں تمہیں تمکن دیاہےاوراس میں تمہاری روزی رکھی ہے۔

یہ آیات کریمہ اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ رب کائنات کے پیش نظر محض فرد کی تخلیق نہیں بلکہ انسانیت کااجتماعی نظام بھی تھا۔ اس لیے اسلامی ریاست دراصل خدائی انتظام کی امین ہے،کیوں کہ وہ چاہتاہے کہ انسان منظم اجتماعی زندگی گزارے۔اسلام اس نظریہ کو نہیں مانتا کہ انسان کااجتماعی شعور بعد کی پیداوار ہے۔بلکہ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ احساس اول روز ہی سے انسان کو عطا کیا گیا تھا پھر جس طرح کے حالات میسر آتے گئے اس کا شعور کام کرتا گیا۔انبیاء علیہم السلام نے صالح معاشروں کے قیام اور عادلانہ ریاستوں کے وجود کے لیے جو کوششیں کی ہیں انہیں انسانی تاریخ سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے جس کا نصب العین عوام کی انفرادی واجتماعی بہبود ہے اور یہ بہبود محض دنیاوی ساز وسامان کی حد تک ہی نہیں بلکہ اخروی زندگی کی فلاح بھی شامل ہے۔[3]﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ[4]﴾اے ایمان والو! اللہ اوراس کے رسول کی پیروی کرواور جو صاحب اقتدار لوگ ہیں ان کی بھی۔پھر اگر تم کسی معاملہ میں جھگڑو تو اس کو اللہ اوراس کے رسول کی طرف لوٹاو اگر تم اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائے ہو یہ بات بہت بہتر ہے اور اچھی تاویل ہے۔

اس آیت مبارکہ میں ایک اسلامی ریاست کی بنیادوں اور اصولوں کو ذکر کیا گیا ہے۔جن کی رو سے اصل قابل اطاعت وہ اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہے کیوں کہ وہ تنہا سارے جہاں کا خالق ومالک ہے اور قانون سازی کا سارا اختیار اسی کے پاس ہے وہ جس چیز کو جائز قرار دے وہ جائز ہے، جس کو ناجائز قرار دے وہ ناجائز ہے۔جس چیز کو حلال قرار دے وہ حلال ہے اور جس چیز کو حرام قرار دے وہ حرام ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اللہ کے رسول کی اطاعت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اپنا خلیفہ بنا کر دنیا میں مبعوث فرماتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کے درمیان عدل وانصاف کو قائم کریں۔چناچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿یَا دَاوٗدُ اِنَّا

---

[1] البقرہ:30

[2] الاعراف:10

[3] خالد علوی،ڈاکٹر،**اسلام کا معاشرتی نظام،اسلام اور جدید معاشی نظریات**،ص286

[4] النساء:59

جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ۔۔۔[1]﴾اے داؤد! ہم نے تمہیں اپنا خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا ہے پس آپ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور ان کی خواہشات کی پیروی مت کریں پس وہ آپ کو اللہ کے راستے سے ہٹادیں گی۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کے درجات میں جو فرق رکھا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے خود اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلَآئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتَاكُمْ ۗ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّه لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ[2]﴾ وہی ذات ہے جس نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے اور بلند کیا ہے تم میں سے بعض کو بعض پر درجات میں تاکہ تمہارا امتحان لے اس میں جو تمہیں دیا ہے بے شک تمہارا رب بہت جلد حساب لینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ اس نے تمام انسانوں کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ نے لوگوں کو بہت سی چیزیں امانتاً دی ہیں اور ان کی آزمائش کے لیے انھیں اس میں تصرف کا اختیار بھی دیا ہے۔

خلیفہ کی ضرورت واہمیت:

قرآن پاک جو ہدایت کا منبع، نجات و کامرانی کا سرچشمہ ہے۔ احادیث مبارکہ جو کتاب ہدایت کی تشریحات و توضیحات ہیں وہ راست طور پر اس بات کی رہنمائی کرتے ہیں کہ رعایا کا ایک حاکم اور امیر ہو۔ امیر و حاکم کا انتخاب انسانی سماج و معاشرہ کی ایک اہم اور بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر ایک کامیاب معاشرہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ نظام امارت کے بغیر وجود میں آنے والا یا چلنے والا معاشرہ کوئی صحراء یا جنگل تو ہو سکتا ہے انسانوں کا سماج و معاشرہ نہیں۔ اس ضمن میں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ امیر کہتے کسے ہیں؟ اس کی ذمہ داریاں اور فرائض آخر ہوتے کیا ہیں؟ امارت کا مطلب کیا ہے؟ امیر کہتے ہیں سردار اور حکمران کو۔ اور امارت سرداری اور حکمرانی کو۔ امیر و حاکم دراصل مملکت کا سربراہ ہوتا ہے۔ موجودہ احوال کے تناظر میں جہاں اسلامی حکومت ہو خواہ جمہوری ہو کہ بادشاہی، اسلام کے بنیادی قوانین کی حفاظت اور دستوری واساسی بنیادوں پر اسلامی احکام و قوانین کی نمائندگی اور اس کی محافظت، حکومت کے کارپردازوں اور رعایا کا اس پر عمل، حکومت و سلطنت کا عمدہ نظم وانتظام، مملکت میں امن وامان کا قیام، عدل وانصاف کا استحکام، معاشرہ میں معروف کا چلن، فواحش و منکرات سے معاشرہ کی تطہیر، رعایا میں غیر مسلم باشندے ہوں تو دستور و قانون کے مطابق ان کا اور ان کی مذہبی آزادی کا تحفظ، ان کو دیئے گئے دستوری حقوق کے مطابق ان کا اکرام

---

[1] ص:26

[2] الانعام:165

واحترام، ان کی پوری برادری کی عزت وناموس اور جان ومال کی حفاظت کی کامل ضمانت اور ان کے ساتھ بھی بلا تفریق عدل و انصاف وغیرہ جیسے اہم اور بنیادی امور کی سختی سے نگرانی اور ان پر عمل درآمد اسلامی مملکت کے سربراہ وامیر کا فرضِ منصبی ہے۔[1] حکومت اگر انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کی جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام بھی ہے اور روئے زمین پر اس کے نائب کی علامت بھی ہے۔ اسلام فطرت کے تقاضہ کے مطابق اجتماعی زندگی چاہتا ہے۔ اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا اجتماعی نظام ہو جس کے تحت ہر شخص اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے۔ حکمران اپنی رعایا پر نگہبان ہوتا ہے۔ گویا راعی کے جو فرائض ہیں وہ حاکم کے بھی ہیں۔ جس طرح راعی یعنی چرواہا اپنے جانوروں کے چارہ اور حفاظت کا ذمہ دار ہوتا ہے کہ ان کو وقت پر چراگاہوں میں لے جاکر چرائے اور درندوں اور چوروں سے ان کی حفاظت کرے اور ان کی پوری طرح دیکھ بھال اور نگرانی کرے بلکل اسی طرح ایک حاکم بھی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی رعایا کا محافظ اور نگہبان ہو اور ان کی جملہ ضروریات کو پورا کرنے کی فکر کرئے اور عدل وانصاف کو قائم کرے اور دوسروں کے لیے بھی وہ بات پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند نہیں کرتا اور اپنی رعایا کے ساتھ خیانت اور دغابازی کا مرتکب نہ ہو۔ قناعت اور سادگی کو اپنا شعار بنائے۔ حاجت مندوں کی حاجات کو پورا کرے اور حاجت راوئی کو نفلی عبادات سے افضل جانے، عمدہ غذا اور لباس سے اجتناب کرے اور خواہشات کی پیروی نہ کرے، قناعت اور سادگی کو اپنا شعار بنائے۔ حتی الوسع معاملات میں نرمی اختیار کرئے اور سختی سے اجتناب کرئے اس لیے کہ حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ جو حکمران اپنی عوام کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرئے گا تو اللہ رب العزت قیامت کے دن اس سے نرمی فرمائے گا اور پھر آپ ﷺ نے دعا دی: ((اَللّٰهُمَّ مَن وَّلِيَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِيْ شَيْئًا، فَشَقَّ عَلَيهِمْ فَاشْقق عَلَيْهِ، وَمَن وَّلِي مِنْ اَمْرِ اُمَتِي شَيْئًا فَرَفَقَ بِهِم فَارْفُق بِهِ[2])) اے اللہ جس شخص کو میری امت کے کسی معاملہ میں ولی بنایا جائے اور وہ ان پر سختی کرئے تو بھی اس پر سختی فرما اور جو نرمی کرئے تو بھی اس پر نرمی فرما۔

حاکم شرعی دستور کے مطابق ساری رعایا کو خوش رکھنے کی کوشش کرئے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ((خِيَارُ أَئِمَتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُوْنَهُمْ وَيُحِبُوْنَكُمْ[3])) تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جو تم سے محبت کریں اور تم ان سے محبت کرو۔ حکمرانوں لوگوں کی تعریفوں سے مغرور نہ ہوں، ممکن ہے وہ اس کے خوف کی وجہ سے اس کی تعریفیں کر رہے ہوں۔

---

[1] محی الدین، مولانا، سید صادق، **سربراہان مملکت کے فرائض**، روزنامہ سیاست، 2 جنوری، 2014

[2] مسلم، **صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب الفضیلۃ الامام العادل وعقوبۃ الجائر والحث علی الرفق بالرعیۃ والنہی عن ادخال المشقۃ علیہم**، ح1828

[3] ایضاً، **کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا واہلہا، باب الصفات التی یعرف بہا فی الدنیا اہل الجنۃ اہل النار** 2197/4، ح2865

حکمران کے لیے ضروری ہے کہ دین و شریعت کی مخالفت مول لے کر کسی کو راضی کرنے کی کوشش نہ کرے۔ حاکم اس بات کو ذہن نشین کرلے کے حکمرانی مشکل کام ہے۔ مخلوق کا کفیل بننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جس کو اس حق کے ادا کرنے کی توفیق مل جائے اس کے حصہ میں بڑی خوش بختی آتی ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی سعادت نہیں ہو سکتی۔ علماء کی صحبت کو لازم پکڑے، ظلم سے اجتناب کرے اور اپنے متعلقین اور نائبین کو بھی انصاف کرنے کا پابند بنائے، ظلم کرنے والوں کو کڑی سزا دے، اور انصاف پر مبنی معاشرے کی تشکیل کے لیے کوشاں رہے۔ تکبر سے بچے اور غصہ کو کنٹرول کرے اس لیے کے غصہ عقل سے محروم کر دیتا ہے۔[1]

جمہوری طرزِ انتخاب:

بلا لحاظ مذہب و ملت و بلا لحاظ فکر و تہذیب سارے باشندگان وطن مل کر اپنے نمائندہ منتخب کر کے ایوان حکومت میں بھیجتے ہیں۔ اکثریت کی بنیاد پر ایک جماعت حکومت کی تشکیل کر سکتی ہے۔ دستوری اعتبار سے اکثریت حاصل نہ ہو تو کسی اور جماعت کی تائید سے یا پھر بعض دفعہ حسب ضرورت کئی ایک جماعتوں کی تائید سے حکومت تشکیل پاتی ہے۔ اس طرح کے جمہوری نظام کے سارے سربراہان صدر و نائب صدر، وزیر اعظم گورنرز و دیگر متفرق قلمدانوں کے وزراء و اہم ذمہ داران و نگران سب کے سب حکومت کے نظم و انتظام میں درجہ بدرجہ اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ہر ایک اپنے منصب و عہدہ کے مطابق آئین حکومت کی پاسداری کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور اس حکومت کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ملک کے قانون و دستور کی سختی سے حفاظت کرے۔

اسلامی طرز انتخاب:

اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ چونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور احکام بھی اسی کے نافذ العمل ہوتے ہیں اس لیے مجلس منتظمہ (شوریٰ) کی ذمہ داری ہے کہ وہ نفاذِ احکام اور تعبیراتِ امور میں لوگوں سے مشورہ لے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ منتظمین حاکمیت کے نشے میں بدمست نہیں ہوتے، دوسرا یہ کہ مشورے سے کام زیادہ بہتر طریق پر ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں نبی اکرم ﷺ کو ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۖ ۔۔۔[2]﴾ پس اللہ تعالیٰ کی جو رحمت ہے اس کے سبب آپ نرم دل ہیں ان کے واسطے اور اگر آپ تند مزاج اور سخت دل ہوتے یہ آپ کے ارد گرد سے چلے جاتے۔ سو آپ انھیں معاف کریں اور ان کے واسطے استغفار کریں اور مشورہ لیں کاموں میں۔ سو جب آپ کسی کام کا عزم کر لیں تو پھر اللہ کی ذات پر

---

[1] عظمی علی، **حکمرانوں کے فرائض**، (ایکسپریس نیوز، 28 دسمبر 2018)

[2] ال عمران: 159

توکل کریں۔ کوئی شک نہیں کہ اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ مومنین کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا:
﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ[1]﴾ اور ان کے آپس کے کام مشورے سے انجام پاتے ہیں۔
اسلامی ریاست کا مقصد ریاست کے تمام افراد کو احکام خداوندی کا پابند بنانا اور ان کی معاشی و معاشرتی بہبود کا خیال رکھنا ہے۔ اسلامی ریاست کے فرائض میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جو جدید ریاست کے فرائض ہیں، بلکہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے ان سے بڑھ کر ذمہ داریوں کی حامل ہوتی ہے جن کو مختصریوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

i. اسلامی شریعت کا نفاذ۔
ii. شورائی نظام کا قیام۔
iii. عدلِ اجتماعی کا قیام۔
iv. تحفظِ حقوقِ انسانی۔
v. مساوات۔
vi. غیر مسلموں سے رواداری۔

اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو۔

شرعی احکام کی تنفیذ میں پاکستانی ریاست کے فرائض واختیارات:

پاکستان کی حیثیت ایک اسلامی ریاست کی ہے اور اس کا یہ بنیادی فرض ہے کہ وہ احکام اسلام کی تنفیذ کرے۔ خلاف اسلام امور کو روکے، اسلامی اقدار کے احیاء و تحفظ کے لیے کوشاں رہے، نظامِ صلوۃ وزکوۃ قائم کرے، معروف و منکر کی تمیز کرے اور معروف کے قیام اور منکر کی روک تھام کے لیے مناسب انتظام کرے۔ اس ذمہ داری کو قرآن پاک نے بڑے احسن انداز میں بیان کیا ہے۔ ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ ---[2]﴾ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کو حکومت عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام اللہ کی طرف ہے
اسلام نے ہمیں جو اجتماعی سیاسی نظام دیا ہے اس میں رعایا کے حقوق واختیارات کا بہت لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کی نظیر ہمیں دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی۔ اسلام نے شخصی ملکیت کو کس قدر تحفظ فراہم کیا ہے، اس کی مثال اس واقعہ سے خوب واضح ہوتی ہے کہ جب

---

[1] الشوریٰ:38
[2] الحج:41

فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں مسجد نبوی میں توسیع کرنا چاہی تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا گھر رکاوٹ بن گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ وہ مکان کو قیمت کے بدلے فروخت کر دیں۔ لیکن حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ معاملہ بڑھ گیا تو فریقین کی رضامندی سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ثالث مقرر ہوئے۔ چناچہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کتاب وسنت کی روشنی میں فیصلہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے حق میں دیا اور بتایا کہ اجتماعی مفاد کی خاطر بھی کسی کی انفرادی ملکیت اور مفاد کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ اس فیصلہ کے بعد یعنی اپنا حق ثابت کروانے کے بعد حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے وہ مکان بلا قیمت مسجد کی توسیع کے لیے دے دیا۔ اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ معاملہ اصل میں حقوق کی تحقیق سے متعلق تھا۔ مکان کی خرید وفروخت سے نہیں تھا۔ جب حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو مکان فروخت کرنے پر مجبور کیا گیا تو انھوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ مکان کا میں مالک ہوں فروخت کرنے یا نہ کرنے کا اختیار صرف مجھے ہے۔ اس لیے اپنے حق کے لیے ڈٹ گئے اور فیصلہ بھی ان کے حق میں ہی آیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے عام عوام کے حقوق کو کس قدر تحفظ فراہم کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا بارعب حکمران بھی اپنا اختیارات سے تجاوز کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ رعایا کے حق کے سامنے بے بس نظر آتا ہے[1]

اسلام میں اقتدار اعلیٰ صرف اللہ رب العزت کی ذات کو حاصل ہے کوئی فرد یا کوئی ادارہ اس کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اس کے مقابلے میں دنیا میں جتنے بھی سیاسی نظام رائج ہیں ان میں مقتدر اعلیٰ کوئی فرد یا ادارہ ہے۔ یہی اسلامی نظام خلافت اور غیر اسلامی نظام جمہوریت میں بنیادی فرق ہے۔ موجودہ زمانے میں دنیا کے بیشتر ممالک میں جمہوری نظام سیاست رائج ہے۔ ان میں مسلم ممالک بھی شامل ہیں اور غیر مسلم ملک بھی۔ اس جمہوری نظام میں اصل طاقت کا سرچشمہ عوام کو مانا جاتا ہے، یعنی وہ مقتدر اعلیٰ ہوتے ہیں اور قانونی حیثیت سے پارلیمنٹ کا ادارہ مقتدر اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس کو قانون سازی کے وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ قوانین کو چیلنج بھی نہیں کیا جاسکتا اور عدالتیں محض پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے کی مجاز ہوتی ہیں۔

مغرب نے قوموں کو وطن، علاقہ اور زبان کے اختلاف کی بنیاد پر تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ موجودہ دور کے بڑے فتنوں میں یہی چیزیں علاقہ پرستی نسل پرستی اور زبان پرستی وغیرہ ہیں، جنھوں نے دنیا کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ انہی باتوں پر آج جنگ وجدل کا بازار گرم ہے۔ اسی فتنے نے امت مسلمہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ بیسیوں مسلم ملکوں میں بٹ کر اپنی قوت کو ریزہ ریزہ کر چکے ہیں۔ تمام اسلامی ممالک غیروں کے زیر تسلط آچکے ہیں۔ یہ صورت حال ساری امت مسلمہ کے لیے لمحہ فکریہ

---

[1] اعوان، امیر افضل، **مسلم معاشرہ میں حکمران کا کردار اور دور حاضر کے تقاضے**، روزنامہ نوائے وقت، 7 جولائی 2017
https://www.nawaiwaqt.com.pk/07-Jul-2017/628835

ہے۔امت مسلمہ کی کامیابی اور فلاح کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ کتاب وسنت کو اپنا دستور حیات بنائیں اور اللہ کی زمین پر اللہ کے قوانین کو نافذ کریں۔اسی سے حقیقی انقلاب دنیا میں برپا ہوگا، جو سارے عالم کے لیے رحمت ثابت ہوگا۔ بلاشبہ مملکتِ خداداد پاکستان اللہ رب العزت کی خصوصی رحمت ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ صالح حکومت ہو۔ حکومت صالح وہی ہوتی ہے جو عوام کی ہر لحاظ سے خیر خواہ ہو ان کی ضروریات کی کفیل ہو اور ان کی عزت آبرو اور جان مال کی محافظ ہو۔

جان ومال کا تحفظ:

اسلامی ریاست کے ہر شہری کا پہلا اور مقدس حق ہے کہ اس کے جان، مال اور عزت وآبرو کی حفاظت ہے۔اس حق کی ضمانت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے دی ہے۔ ریاست اپنے کسی بھی شہری کی جان ومال اور ناموس پر نہ خود تعارض کر سکتی ہے اور نہ کسی دوسرے کو ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ نبی رحمت ﷺ نے اپنے آخری خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا: ((فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا[1]))پس بے شک تمہارے خون اور مال اور عزتیں محترم ہیں جیسا کہ آج کا دن محترم ہے۔

لہذا ایک اسلامی ریاست ہونے کے ناطے پاکستانی ریاست کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی جان ومال کے تحفظ کی ضمانت دے اور ان کی عزت آبرو اور عصمت کی حفاظت کرے۔ آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔((أُمِرْتُ اَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلَهَ اِلَا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّدُ رَّسُوْلُ اللهِ وَيُقِيْمُوْا الصَّلوةَ وَيُوتُوا الزَّكوةَ فَاِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوْا مِنِّى دِمَاءَهُمْ اِلَّا بِحَقِ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ[2]))مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور قائم کریں نماز کو اور ادا کریں زکوۃ کو، پس جب وہ ایسا کر لیں تو مجھ سے اپنے خون محفوظ کر لیں گے، سوائے اسلام کے حق کے اور ان کا حساب تو اللہ کے ذمہ ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے: ((أُمِرْتُ اَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّى يَقُوْلُوْا لَااِلهَ اِلَا اللهُ فَاِذَا قَالُوْا وَصَلُّوْا صَلوتَنَا وَاسْتَقْبَلُوْا قِبْلَتَنَا وَذَبَحُوْا ذَبِيْحَتُنَا فَقَدْ حرمَتْ عَلَيْنَا دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ [3]))مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ کہیں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، پس جب وہ یہ کہہ لیں اور ہماری طرح نماز ادا کریں اور

---

[1] بخاری، **الجامع الصحیح**۔ حدیث:7078

[2] ایضاً، حدیث:2946

[3] ایضاً، **باب: فضل استقبال القبلہ**، ح392

ہمارے قبلے کا رخ کریں اور ہماری طرح ذبح کریں تو ہمارے اوپر حرام ہو گئے ان کے خون اور ان کے مال سوائے اللہ کے حق کے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستانی ریاست اپنے شہریوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہے۔ اگر حکومت شہریوں کے حقوق کا خیال نہیں رکھتی اور حق تلفی کرتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے دی ہوئی ضمانت پر حملہ کر کے گناہ کی مرتکب ہوتی ہے۔((فَذٰلِکَ الْمُسْلِمُ الَّذِیْ لَهٗ ذِمَّةَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ فَلَا تَخْفُرُوْا اللهَ فِیْ ذِمَّتِهٖ[1]))سو یہ وہ مسلمان ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ذمہ داری میں ہے۔ تم اللہ کو اس کی ذمہ داری سے مت نکالو۔

ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ہر شہری کی جان مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے۔ کسی قسم کی حق تلفی یا دست درازی نہ کرے اور نہ کسی دوسرے کو اس بات کی اجازت دے کہ ان پر دست درازی کرے۔ آپ ﷺ کا پاک ارشاد ہے: ((کلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهُ وَمَالُهُ وعِرْضُهُ[2]))ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون اور اس کا مال اور اس کی آبرو حرام ہے۔

امام ابو یوسفؒ کتاب الخراج میں فرماتے ہیں: "وَلَیْسَ لِلْاِمَامِ اَنْ یَّخْرُجَ شَیْاءً مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِحَقٍّ ثَابِتٍ مَعْرُوْفٍ"[3] امام کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر کسی شخص کے قبضہ سے اس کی کوئی چیز نکال لے۔

> "قبیلہ ہوزان کی عورتیں اور بچے مسلمانوں کی قید میں آئے تو آپ ﷺ نے ان کو تقسیم کرنے میں چند روز اس خیال سے توقف فرمایا کہ اگر ان کے اولیاء کی طرف سے درخواست کی گئی تو ان کو واپس کر دیا جائے گا۔ لیکن جب ان کی طرف سے کوئی درخواست نہیں آئی تو آپ ﷺ نے ان کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ بعد میں ان کے اولیاء آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قیدیوں کی رہائی کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے ان کو رہا فرما دینا چاہا، لیکن قیدی حکومت کی اجتماعی ملکیت سے نکل چکے تھے اور تقسیم ہو کر افراد کی ملکیت بن چکے تھے۔ اس وجہ سے آپ ﷺ نے ان قیدیوں کی رہائی کا حکم تو فوراً دے دیا جو حکومت کے قبضے میں تھے۔ لیکن جو قیدی افراد کی شخصی ملک بن چکے تھے ان کی رہائی کے لیے آپ ﷺ نے مسلمانوں کے سامنے تقریر فرمائی کہ تم میں سے جو لوگ اپنے قیدیوں کو بغیر کوئی معاوضہ لیے چھوڑنے پر راضی ہوں وہ تو چھوڑ

---

[1] بخاری، **الجامع الصحیح، کتاب الصلاۃ (نماز کا بیان)**: حدیث 391

[2] مسلم، **صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ**، ح 6541

[3] ابو یوسف، **کتاب الخراج**، ص 37

ددیں۔ لیکن جو لوگ بلا معاوضہ چھوڑنے پر راضی نہ ہوں تو فے کا پہلا مال جو ہمارے قبضہ میں آئے گا اس سے ہم ان کا معاوضہ پورا کر دیں گے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر حکومت کو کسی کی ذاتی ملک پر اجتماعی ضرورت کے لیے قبضہ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ یا تو مالک کی مرضی سے اس پر قبضہ کرے گی یا اس کو اس کی ملکیت کا معقول معاوضہ دے گی۔[1]

بنیادی تعلیم:

اسلامی ریاست کے ہر شہری کا بنیادی حق ہے کہ اسلامی ریاست اسے ضروری اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے یکساں مواقع فراہم کیے جائیں۔ تعلیم کی اہمیت وضرورت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ریاست مدینہ میں سب سے پہلے ایک مسجد بنائی اور اس کے ساتھ ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ تاکہ لوگ علم کے زیور سے آراستہ ہو سکیں۔ ارشاد فرمایا: ((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ[2])) طلب کرنا علم کا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ مزید یہ کہ جب غزوہ بدر میں کچھ لوگ قید ہوئے تو ان کی رہائی کے لیے ایک شرط یہ بھی لگائی کہ وہ کچھ مسلمان بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں تو انھیں آزاد کر دیا جائے گا۔ آپ ﷺ نے عرب کی بگڑی ہوئی معاشرت کو تعلیم کے ذریعہ سے ہی بدلا اور خود ارشاد فرمایا: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا[3])) مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں میں اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے مختلف علاقوں میں مستقل گورنر تعینات کرتے تھے۔ پاکستانی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے اقدامات کرے۔

اسلام دین فطرت ہے اور بنیادی انسانی حقوق کا بہترین علمبردار ہے۔ دین اسلام کی تمام عبادات ہمیں اجتماعیت، محبت، امن اور اتفاق کا درس دیتی ہیں اور ایک خاص نظم کا پابند بناتی ہیں۔ اسلام ہر شخص کو ایک مخصوص دائرہ کے اندر رہتے ہوئے پوری آزادی بھی دیتا ہے اور یہ آزادی اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ وہ آدمی کسی دوسرے شخص کے حقوق یا آزادی میں خلل کا ذریعہ نہ بنے۔ جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ شخص دوسروں کے حقوق اور آزادی کے لیے خطرہ ہے تو اس وقت ریاست اسلام کے مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اس سے باز پرس کر سکتی ہے۔ لیکن بلاوجہ محض شبہ کی بنیاد پر ریاست کسی کی شخصی

---

[1] اصلاحی، امین احسن، مولانا، **اسلامی ریاست**، ص108

[2] ابن ماجہ، **سنن ابن ماجہ: بَابُ: فَضْلِ الْعُلَمَاءِ وَالْحَثِّ عَلَى طَلَبِ الْعِلْمِ**، حدیث:224

[3] ایضاً، **سنن ابن ماجہ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم**۔1/150، حدیث:229

آزادی سے تعارض نہیں کر سکتی۔ حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے: ((اِنَّ الْاَمِیْرَ اِذَا ابْتَغٰی الرِّیْبَۃَ فِیْ النَّاسِ اَفْسَدَھُمْ[1])) امیر جب لوگوں کے اندر شبہات تلاش کرتا ہے تو ان کو بگاڑ دیتا ہے۔ اور حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ "جس حد تک ممکن ہو مسلمانوں کو سزا سے بچاؤ، کوئی گنجائش بھی اگر نکلتی ہو تو ان کو چھوڑ دو۔ یہ بات کہ امام (حکومت) کسی شخص کو معاف کرنے میں غلطی کر جائے اس بات سے بہتر ہے کہ وہ اس کو سزا دینے میں غلطی کر جائے"۔[2]

اسی طرح دوسری حدیث میں ارشاد ہے: ((اِدْفَعُوْا الْحُدُوْدَ مَا وَجَبْتُمْ لَھُمْ مَدْفَعًا[3])) جب تک بچانے کی کوئی راہ مل رہی ہو اس وقت تک لوگوں کو سزا سے بچاؤ۔ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی حفاظت کی ضامن ہوتی ہے۔ وہ شبہ کی بنیاد پر کسی کو سزا دینے کی مجاز نہیں ہے۔ امام ابو یوسفؒ کتاب الخراج میں لکھتے ہیں "نہ یہ بات جائز ہے اور نہ اس کے جائز ہونے کی کوئی گنجائش ہے کہ کسی شخص کو محض اس وجہ سے حوالات میں ڈال دیا جائے کہ کسی شخص نے اس پر الزام لگایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ خالی الزام کی بنا پر کسی شخص کو گرفتار نہیں کرتے تھے۔ اگر ایسی صورت پیش آجائے تو مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو حاضر کیا جائے اور اگر مدعی کے پاس ثبوت موجود ہو تو اس کے حق میں فیصلہ دے دیا جائے ورنہ مدعا علیہ سے ضمانت لے کر اس کو آزاد کر دیا جائے۔ اگر اس کے بعد مدعی کوئی ثبوت فراہم کرتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ مدعا علیہ سے کوئی تعارض نہیں کیا جائے گا۔[4]

اور ریاست کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی شہری کی شخصی آزادی کو حیلوں بہانوں سے ختم کر دے۔ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم فرماتے ہیں:

> "اسلام کی رو سے چونکہ حکومت کوئی مقصود بالذات شئ نہیں بلکہ وہ محض ایک ذریعہ ہے اس بات کا کہ شہریوں کو رائے و عمل کی وہ آزادی بہم پہنچائی جائے جو اسلام نے افراد و معاشرہ کو بخشی ہے۔ تاکہ آزمائش کی وہ غرض کما حقہ پوری ہو سکے جسکی خاطر اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا ہے۔ اس وجہ سے اسلام کسی غیر معمولی حالت میں بھی حکومت کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ انصاف کی شرطیں پوری کیے بغیر کسی شہری کی آزادی کو سلب یا محدود کرے۔"[5]

---

[1] ابو داؤد، **سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی النہی عن التجسس**، 375/4

[2] الترمذی، **جامع الترمذی: کتاب الحدود، باب حد الزنا**، ح2355

[3] ابن ماجہ، **سنن ابن ماجہ: کتاب الحدود، باب الستر علی المؤمن ودفع الحدود بالشبہات**،، ح2545

[4] ابو یوسف: **کتاب الخراج**، ص107

[5] اصلاحی، امین احسن، مولانا، **اسلامی ریاست**، (اشاعت ثانی مطبع، گنج شکر پرنٹرز، دار التذکیر، تاریخ اشاعت 2006 رحمن مارکیٹ، اردو بازار لاہور)، ص118

پاکستانی ریاست کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کو اپنے مذہب اور عقیدہ کے مطابق زندگی گزارنے کے پورے مواقع فراہم کرئے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں احکاماتِ اسلام کی تنفیذ کرئے، اسلام کی دعوت سارے عالم تک پہنچائے، لوگوں کو اپنی زندگیاں اسلامی عقائد اور اسلام کے وضع کردہ طریقہ کے مطابق گزارنے کے لیے سہولیات مہیا کرئے اور اسلام کے منافی جو چیزیں اور طریقے رائج ہیں ان کا سدباب کرئے۔

اسلامی نظام کے اندر مسلک و مذھب اور فکر و رائے کی آزادی کے لیے ہر شہری کو ایک بڑا وسیع میدان ملتا ہے، جس کے اندر ریاست یا تو سرے سے مداخلت کرتی ہی نہیں یا مداخلت کرتی ہے تو صرف تعلیمی اور تبلیغی نوعیت کی مداخلت ہوتی ہے۔ قانون اور طاقت کی مداخلت نہیں ہوتی۔[1]

نظام عدل:

عدل وانصاف قائم کرنا پاکستانی ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ حکومت اور سلطنت کا وجود انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے اور سلطنت و حکومت کا قیام غلبے کے بغیر ناممکن ہے؛ کیونکہ ہر شخص کو دوسرے شخص سے کسی نہ کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور بسا اوقات طاقتور شخص کمزور شخص سے اپنی ضرورت کی اشیاء طاقت سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے ظلم و جور دور کرنے اور عدل وانصاف کے حصول کی خاطر کسی قوت حاکمہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عدل وانصاف کے قیام کے لئے قوانین کا وجود ناگزیر ہے۔ یہ قوانین اگر انسانوں کے بنائے ہوئے ہوں تو یہ سیاست عقلی کہلائے گی اور اگر یہ قوانین شرعی ہوں تو یہ سیاست شرعی ہوگی۔ اللہ تعالی کا پیغمبر زمین پر اللہ تعالی کا نائب اور خلیفہ ہوتا ہے۔ وہ براہ راست احکام اللہ تعالی سے حاصل کرتا ہے اور ان احکامات کی تفصیل اور تشریح کرکے ان احکامات کو اللہ تعالی کے بندوں پر نافذ کرتا ہے اور یہی احکامات شریعت کہلاتے ہیں۔

اس فصل کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام اسلامی ریاست کی حیثیت سے ہوا لہذا پاکستان کے سربراہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے اقدامات کرے۔ جب حکمران اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں گئے تو معاشرہ خود بخود پر سکون ہوتا چلا جائے گا۔ ملک پاکستان کے سربراہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کے دین وایمان، جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کو یقینی بنائے، سماجی انصاف اور معاشرتی عدل کو اولیت دے، قناعت، سادگی اور قانون کی یکساں عملداری کو اپنی زندگی میں عملی

---

[1] اصلاحی، امین احسن، **اسلامی ریاست**، ص122

نمونہ پیش کرے، ناانصافی، رشوت، بدعنوانی اور سرخ فیتہ کی لعنت کے خاتمہ کے لیے سنجیدہ اقدامات کرے۔ وی آئی پی کلچر اور پروٹوکول کے عذاب سے لوگوں کو نجات دلائے۔

خلاصہ باب:

اس باب میں ہم نے اسلامی ریاست کی حیثیت اور شرعی احکام کی تنفیذ میں اس کے کردار کا تجزیاتی مطالعہ کیا کہ اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد ہی زمین پر اللہ کے احکام کی تنفیذ ہے۔ ورنہ ریاست کوئی مقصود بالذات چیز نہیں ہے اور ایسی ریاست جس میں اللہ کے احکام کی تنفیذ نہ ہو وہ حقیقی اسلامی ریاست نہیں کہلا سکتی۔ اسلامی ریاست کی تشکیل فکری بنیادوں پر ہوتی ہے۔ عقائد و نظریات پہلے وجود میں آتے ہیں اور ریاست بعد میں تشکیل پاتی ہے۔ اسی لیے اگر کبھی حالات کے تغیر و تبدل سے ریاست کی ہیت میں تغیر آ جائے تو عقائد و نظریات میں کوئی تغیر نہیں آتا۔ اور مسلم معاشرے میں افراد کے اتحاد و یگانت کی بنیاد دین ہوتی ہے۔ وہ مروجہ سیاسی و معاشرتی اتحاد کی بنیادوں یعنی زبان، رنگ، نسل، وطن اور قومیت کے معیارات اور بنیادوں کو باطل قرار دیتا ہے۔ عام طور پر معاشروں کی بنیاد مادیت بتلائی جاتی ہے اور ساری کوششوں سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کو ان کی بنیادی ضروریات یعنی روٹی، کپڑا اور مکان حاصل ہو جائیں۔ اس کے برعکس اسلامی ریاست کی بنیاد مادیت کے بجائے روحانیت پر ہوتی ہے، جس میں اصل ہدف آخرت کی فلاح کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے انہی بنیادوں پر ریاست مدینہ تشکیل دی اور بلکل اجنبی ماحول میں باہم متضاد و منتشر عناصر کے تعاون سے نہ صرف ریاست بلکہ ایک نظریاتی ریاست کو قائم فرمایا۔ یعنی اسلام نے ریاست کا جو بنیادی تصور پیش کیا کہ اس میں اقامتِ صلٰوۃ ہو اور زکٰوۃ کی ادائیگی کا نظام ہو اور جہاں معروفات (نیکیاں) فروغ پائیں اور منکرات (برائیوں) کا استحصال ہو۔ یعنی پوری زندگی کی اور زندگی کے تمام شعبوں کی اصلاح ہو۔ آپ ﷺ نے اس نہج پر ریاست مدینہ کو قائم فرمایا۔ اسی طرح اسلامی ریاست کی خصوصیات اور امتیازات کو بھی اس باب میں زیر بحث لایا گیا۔ اس باب کی دوسری فصل میں اسلامی ریاست کی حیثیت سے پاکستان کا قیام اور اس کے تاریخی و تہذیبی پس منظر کو ذکر کیا گیا کہ برصغیر میں اسلام کی آمد خلفاء راشدین کے دور سے ہی ہو گئی تھی پھر محمد بن قاسم نے باقاعدہ یہاں حکومت قائم کی۔ پھر محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملے 976ء سے لیکر مغلوں کے دور کے آخیر 1857ء تک اس علاقے میں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد انگریز سامراج کی اس علاقے میں حکومت قائم ہو گی۔ ہندو انگریزوں سے قربتیں حاصل کر کے مختلف اعلٰی عہدوں پر براجمان ہو گئے۔ ہندستان میں جب آزادی کی تحریک چلی تو مسلمانوں نے ایک الگ آزاد ملک کا مطالبہ پیش کیا تاکہ وہ انگریز کے جانے کے بعد ہندوؤں کے محکوم بن کر نہ رہ جاہیں اور اس ملک میں وہ آزادی کے ساتھ اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکیں چناچہ اس کاوش کے نتیجہ میں پاکستان اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا جو مسلمانانِ ہند کی دیرینہ

خواہش تھی کہ ایک ایسی آزاد ریاست ہو جہاں سو فیصد شرعی احکام کی تنفیذ ہو۔اس عنوان سے انھوں نے جدوجہد کر کے پاکستان کو حاصل کیا۔ لیکن کم قسمتی سے جس مقصد کے لیے پاکستان کو حاصل کیا گیا تھا اس پر آج تک عمل درامد نہ ہو سکا۔اس باب کی تیسری فصل میں شرعی احکام کی تنفیذ میں ریاست پاکستان کے فرائض واختیارات کو ذکر کیا گیا ہے۔ پاکستان ایک نظریاتی فلاحی ریاست ہے جس کا نصب العین عوام کی انفرادی واجتماعی بہبود ہے اور یہ بہبود محض دنیاوی ساز وسامان کی حد تک ہی نہیں بلکہ اخروی زندگی کی فلاح بھی شامل ہے اور اخروی زندگی کی فلاح کا دار مدار احکام اسلام پر عمل پیرا ہونے میں ہے اور ان احکامات کی تنفیذ ریاست کی ذمہ داری ہے اور ریاست ان احکامات کی تنفیذ میں وسیع اختیارات کی حامل ہے۔ لہذا ریاست پاکستان کی یہ اولین ذمہ داری ہے وہ ملک میں شرعی احکام کی تنفیذ کرے تاکہ دنیا میں بھی کامیابی ہو اور آخرت میں بھی سرخروئی حاصل ہو۔

باب دوم: عبادات سے متعلق اسلامی احکام کی تنفیذ

فصل اول: نماز اور زکوٰۃ سے متعلق امور

فصل دوم: روزہ اور حج کے معاملات

فصل اول: نماز اور زکوٰۃ سے متعلق امور

فصل اوّل: نماز اور زکوٰۃ سے متعلق امور

عبادت ایک ایسا لفظ ہے جو ان سارے افعال و اعمال کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ ہیں۔ ایک انسان کی یہ خواہش ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں اپنے رب کا بندہ بن کر اس دنیا میں زندگی بسر کرے۔ اس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے اور مختلف عبادات کو بجالاتا ہے۔ اس لیے دنیا میں جتنے مذاہب ہیں وہ سب عقیدہ کی بنیاد پر ہی قائم ہیں۔ عقائد کے بعد زیادہ اہمیت عبادات کی ہے؛ کیوں کہ عبادات عقائد کے ثمرات ہوتے ہیں۔ عقیدہ کمزور ہو جائے تو عبادات میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ عبادات کے بغیر دین کو صحیح معنی میں باقی رکھنا ممکن نہیں ہے۔ اسلام دین فطرت ہے۔ اس نے انسانی زندگی کے دیگر شعبوں میں راہنمائی کی طرح عبادات کے طریقوں کے متعلق بھی ایک ایسا جامع اور واضح نظام دیا ہے جو ہر اعتبار سے بے مثال ہے۔ ان میں بنیادی بات یہ کہ مسلمان کی عبادات کا مرجع وہ صرف خدائے وحدہ لاشریک کی ذات ہے۔ وہ عبادات میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ عبادت کا اصل مقصد انسان کا اپنے رب کے حضور بے چارگی اور بندگی کا اظہار کرنا ہے۔ یہ عبادات انسان کی اپنی دینی و دنیاوی ترقی، پاکیزگی، بلندئ درجات اور قرب خداوندی کا ذریعہ ہیں۔ عبادت کے صحیح طریقوں کے متعلق انسان اللہ کی طرف سے وحی کا محتاج ہے۔ وہ اپنی عقل و سمجھ اور حواس کے ذریعے خود اس بات کا تعین کرنے کا مجاز نہیں ہے کہ کون سا عمل اللہ کے قرب کا ذریعہ بن سکتا ہے اور کون سا نہیں۔ دین کے تمام احکام کی پیروی اللہ کی رضا کی خاطر کرنا عبادت ہے۔ لیکن ان عبادتوں میں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج ہیں۔ جن کی اللہ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے میں ایک خاص مناسبت ہے اور انسان کی روحانی ترقی کا خاص سامان ہے۔ اس لیے ان کی اہمیت بھی زیادہ ہے اور ان پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ حضور پاک ﷺ نے بھی اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قرار دی ہے:

((بُنِيَ الإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ، وَإِقَامَ الصَّلَاةَ، وَإِيْتَاءَ الزَّكَاةِ، وَالْحَجُ، وَصَوْمَ رَمَضَانَ[1])) اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج کرنا اور ماہ رمضان کے روزے رکھنا۔"

یہ بنیادی عبادات ہیں لیکن ان کا دائرہ بے حد وسیع ہے اور یہ بات بھی واضح رہے کہ عبادات کو انہی پانچ چیزوں میں منحصر کر لینا غلط تصور ہے۔ بقول ڈاکٹر اسرار احمد:

> "یہ عقیدہ بنا لینا کہ بس ان عبادتوں کی ادائیگی سے عبادت کا اور بندگی کا حق ادا ہو جاتا ہے تو یہ دین کے تصور کو محدود کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو مسخ کرنے کے زمرہ میں بھی آئے گا۔"[2]

---

[1] بخاری، **الجامع الصحیح**، ج 1/ص 11، حدیث نمبر: 8۔

[2] ڈاکٹر اسرار احمد، **مطالبات دین**، (مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶/کے ماڈل ٹاؤن لاہور)، ص 29

لہذا اس باب میں ہم اسلام کی بنیادی عبادات نماز اور زکوٰۃ سے متعلق امور اور روزہ اور حج کے معاملات میں شرعی احکام کی تنفیذ کے بارہ میں اسلامی ریاست کے فرائض واختیارت سے بحث کریں گے۔

الصلٰوۃ:

ایمان لانے کے بعد سب سے اہم اور ضروری بات وہ نماز کی پابندی ہے اور حدیثِ ارکان میں بھی ایمان کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے جو مسلمان مرد و عورت، عاقل اور بالغ پر دن میں پانچ مرتبہ فرض ہے اور یہ نماز اسلام اور کفر کے درمیان تفریق کا معیار ہے۔

نماز/صلوۃ کی لغوی تعریف:

نماز فارسی کا لفظ ہے اور عربی میں اسے صلوۃ کہتے ہیں، لفظ صلوۃ کا معنی دعاء کرنا، نماز پڑھنا اور برکت دینا، اچھی تعریف کرنا وغیرہ کے ہیں۔[1]

لسان العرب میں صلوۃ کا معنی ہے "الدعا والاستغفار "یعنی لفظ صلوۃ کا لغوی معنی دعا اور استغفار ہے۔والصلاۃ من اللہ تعالی "الرحمۃ"۔[2] اور جب اللہ تعالی کی طرف لفظ صلوۃ کی نسبت ہو تو صلوۃ کے معنی رحمت کے ہوں گئے۔اور صلوۃ بمعنٰی دعا بھی ہے۔ چناچہ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ[3]﴾ لیں آپ ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ اور انھیں پاک کریں اور اس کے ذریعہ ان کا تزکیہ کریں اور ان کے لیے دعا کریں بے شک آپ کا ان کے لیے دعا کرنا سکون کا باعث ہوتا ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔اس آیت کریمہ میں لفظ "وَصَلِّ عَلَيْهِمْ" کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ کے رسول ﷺ آپ ان کے لیے دُعا فرمائیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد:

((إِذَا دُعِيَ أَحَدكُمْ فَلْيَجِبْ، فَإِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ، وَإِنْ كَانَ مُفْطِرًا فَلْيُطْعُمْ[4]))جب تم میں سے کسی کو دعوت دی جائے تو وہ اس کو قبول کرلے۔ پس اگر وہ روزے کی حالت میں ہے تو دعا کرئے اور اگر افطار کیا ہوا ہے یعنی روزہ دار نہیں ہے تو کھالے۔

---

[1] مصباح اللغات، ص457

[2] ابن منظور، لسان العرب، 464/14

[3] التوبہ:103

[4] مسلم، صحیح مسلم، کتاب: النکاح، باب: دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کرنے کا حکم، ص1431

اور جب لفظ صلٰوۃ کا اطلاق حضور ﷺ کی طرف ہو تو معنٰی ہو گا آپ ﷺ پر درود بھیجنا جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:
"هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ[1]" وہی ذات ہے جو تم پر درود بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی درود بھیجتے ہیں۔
صلٰوۃ عربی زبان کا لفظ ہے جب کہ اردو زبان میں اور فارسی زبان میں اس کا ترجمہ نماز سے کیا جاتا ہے۔

نماز/صلٰوۃ کا شرعی مفہوم:

اصطلاح شرع میں صلٰوۃ کا معنی ہے: "مخوص و معلوم افعال و اقوال پر مشتمل وہ عبادت جو صرف اللہ کے لیے کی جائے۔ جس کی ابتدا تکبیر تحریمہ سے اور انتہاء سلام پر ہو۔ اور اس کا نام صلٰوۃ/ نماز بھی اسی لیے رکھا گیا ہے؛ کیونکہ یہ عبادت دُعا پر مشتمل ہوتی ہے۔"[2]

نماز/صلٰوۃ کی فرضیت:

جہاں تک نماز کی فرضیت کا تعلق ہے تو پچھلی امتوں اور انبیاء اکرام کے حالات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نماز ہر دور میں ہر امت پر اور ہر نبی پر فرض رہی ہے۔ لیکن آج جو ہم دن میں پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں تو اس کی فرضیت معراج کے موقع پر ہوئی۔

حدیث پاک میں ارشاد ہے: ((عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: فُرِضَتْ عَلَى النَّبِيِّ صَلى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ أُسْرِي بِهِ الصَّلَوَاتُ خَمْسِيْنَ، ثُمَّ نَقَصَتْ حَتّٰى جُعِلَتْ خَمْساً، ثُمَّ نُوْدِيَ:"يَا مُحَمَّد إِنَّهُ لَا يُبَدَّلَ الْقَوْلَ لَدِيَّ، وَإِنَّ لَكَ بِهٰذِهِ الْخَمْسِ خَمْسِيْنَ".))[3] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر معراج کی رات پچاس نمازیں فرض کی گئیں، پھر کم کی گئیں، یہاں تک کہ (کم کرتے کرتے) پانچ کر دی گئیں۔ پھر پکار کر کہا گیا: اے محمد! میری بات اٹل ہے۔ تمہیں ان پانچ نمازوں کا ثواب پچاس کے برابر ملے گا۔

معراج کے واقعہ سے پہلے صرف دو نمازیں فرض تھیں۔ ایک طلوع شمس سے قبل ادا کی جاتی تھی اور ایک غروب شمس سے قبل ادا کی جاتی تھی۔ "وَذَهَبَ الْحَرْبِيُّ إِلَى أَنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ مَفْرُوْضَةً رَكْعَتَيْنِ بِالْغَدَاةِ وَرَكْعَتَيْنِ بِالْعَشِيِّ، وَذَكَرَ الشَّافِعِيُّ عَنْ بَعْضِ أَهْلِ الْعِلْمِ أَنَّ صَلَاةَ اللَّيْلِ كَانَتْ مَفْرُوْضَةً ثُمَّ نُسِخَتْ بِقَوْلِهِ تَعَالَى:فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ فَصَارَ الْفَرْضُ قِيَامُ بَعْضُ اللَّيْلِ ثُمَّ نُسِخَ ذَلِكَ بِالصَّلواتِ الْخَمْسِ"۔[4] امام ذہبی فرماتے ہیں کہ نمازیں دو رکعت صبح اور دو رکعت شام کو

---

[1] الاحزاب: 43

[2] ابن قدامۃ، المغنی، ۵۳۔ الشرح الکبیر، 53۔ الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف، 53۔ التعریفات الجرجانی، ص: 174

[3] ترمذی، سنن ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء کم فرض اللہ علی عبادہ من الصلوات، ح213۔

[4] العسقلانی، ابن حجر، فتح الباري: 1/ 465

فرض تھیں اور امام شافعی بعض اہل علم کے حوالہ سے ذکر کرتے ہیں کہ بے شک رات کی نماز فرض تھی۔ پھر اللہ کے اس قول: (فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ)"سو پڑھو اس میں سے جو آسان ہو" سے منسوخ ہو گئی۔ یعنی رات کے کچھ حصہ میں قیام کرنا فرض تھا پھر پانچ نمازوں کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔

یوں معراج کی رات کو پانچ نمازیں اس امت پر فرض ہو گئیں اور واقعہ معراج کی بانسبت علماء میں اختلاف ہے کہ یہ کب پیش آیا۔ لیکن اتنی بات پر سب متفق ہیں کہ یہ واقعہ نبوت ملنے کے بعد اور ہجرت مدینہ سے ایک سال قبل پیش آیا۔ چنانچہ صحیح قول کے مطابق واقعہ معراج رجب 12 نبوی کو پیش آیا۔

احمد بن محمد الطحطاوی فرماتے ہیں: "وَفُرِضَتْ لَيْلَةُ الْمِعْرَاجِ" وَهِيَ لَيْلَةُ الإِسْرَاءِ عَلى مَا عَلَيْهِ جَمْهُوْرُ الْمُحَدِّثِيْنَ وَالمفسرين والفقهاء والمتكلمين[1] "یعنی نماز معراج کی رات کو فرض ہوئی اور معراج کی رات جمہور محدثین، مفسرین، فقہاء اور متکلمین کے نزدیک اسراء کی رات ہے۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں نماز کی فرضیت کے دلائل:

قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں واضح طور پر نماز کے فرض ہونے کا کہا گیا ہے اور نماز پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے حتی کہ تمام برائیوں سے بچنے کا ذریعہ نماز کو بتایا گیا گیا۔ چنانچہ سورت العنکبوت میں اللہ کریم ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ[2]﴾ بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ پر انسان کی زندگی کا مقصد بتاتے ہوئے رب کریم نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ[3]﴾ اور انہیں کوئی حکم نہیں دیا گیا سوائے اس کے کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں۔ اسی کے لیے بندگی خالص کرتے ہوئے اور یکسو ہو کر نماز کو قائم کریں اور زکاۃ دیں اور یہی ہے دین سیدھی ملت کا۔ ایک اور جگہ نماز کے اوقات کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا[4]﴾ یقیناً نماز مومنین پر مقررہ اوقات پر فرض ہے۔

سنت مطہرہ میں نماز کی فرضیت کی دلیل حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی وہ معروف حدیث ہے کہ جب انہیں نبی ﷺ نے یمن کی طرف داعی، مبلغ دین اور حاکم بنا کر بھیجتے وقت ارشاد فرمایا تھا:

---

[1] الطحطاوی، احمد بن محمد، **حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح** (ص: 172) الناشر: دار الكتب العلمية بيروت، لبنان، الطبعة الأولى 1418ھ-1997م

[2] العنکبوت: 45۔

[3] البینۃ: 5

[4] النساء: 103

((عَنْ ابنُ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلُ اللهِ بَعَثَ مُعَاذًا اِلَی الْیَمَنِ فَقَالَ:اِنَّكَ تَأْتِیْ قَوْماًاَهْلِ كِتَابٍ فَادْعُوْهُمْ اِلی شَهَادَةِ اَن لَّا إِلَهَ اِلَّا اللهِ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللهِ.....))[1]

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن کی طرف بھیجا اور ارشاد فرمایا: آپ اہل کتاب کے ایک گروہ کی طرف جارہے ہیں ان کو اس بات کی دعوت دینا کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور الہ نہیں ہے اور میں اللہ کا رسول برحق ہوں۔ اگر وہ تمہاری بات مان لیں اس معاملہ میں تو پھر ان کو آگاہ کرنا کہ ان پر ہر دن رات میں اللہ تعالیٰ نے پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے۔ اگر اس معاملہ میں بھی اطاعت کرنے لگیں تو ان کو بتلانا کہ اللہ نے ان کے مالوں پر زکوٰۃ فرض کی ہے۔ جو ان کے مالداروں سے لے کر ان کے غرباء پر تقسیم کی جائے گی۔ پھر اگر وہ اس بات میں بھی اطاعت کریں تو ان کے بہترین مال لینے سے گریز کرنا اور مظلوموں کی بدعا سے بچنا۔ اس لیے کہ اس کے اس کی دعا اور اللہ رب العزت کے درمیان کوئی آڑ نہیں ہوتی۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

((بُنِیَ الإِسْلاَمُ عَلَی خَمْسٍ شَهَادَةِ أَنْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلاَةِ وَإِیتَاءِ الزَّكَاةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ[2]))اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ سب سے پہلے اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بیشک محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

ایک دوسری روایت میں حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، کہ میں نے حضور اقدس ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

((خَمسُ صَلَواتٍ كَتَبهنَّ اللهُ عَلَی العِبَادِ، فَمَنْ جَاءَ بهنَّ لَم یُضَیِّعْ مِنْهُنَّ شَیئًا اِستِخْفَافًا بحَقِّهِنَّ، كَانَ لَهُ عِنْدَ اللهِ عَهدٌ أن یُدخِلَه الجَنَّةَ، وَمَن لَّم یَأتِ بِهِنَّ فَلَیْسَ لَهُ عِنْدَ اللهِ عَهدٌ؛ إِنْ شَاءَ عَذَّبَه، وَإِنْ شَاءَ أَدْخَلَه الجَنَّةَ[3])) میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے: "پانچ نمازیں ہیں جو اللہ نے بندوں پر فرض کی ہیں، پس جس شخص نے ان کو اس طرح ادا کیا ہوگا کہ ان کو ہلکا سمجھ کر ان میں کچھ بھی کمی نہ کی ہوگی تو اس کے لیے اللہ کے پاس جنت میں داخل کرنے کا عہد ہوگا اور جو شخص ان کو ادا نہ کرے گا تو اس کے لیے اللہ کے پاس کوئی عہد نہیں۔ اللہ چاہے تو اسے عذاب دے اور چاہے تو اسے جنت میں داخل کرے"۔

---

[1] ابوداؤد، سنن ابی داؤد، زکوٰۃ کے احکام ومسائل، باب: چرنے والے جانوروں کی زکوٰۃ کا بیان، ح11584

[2] بخاری، الجامع الصحیح، کتاب ایمان کے بیان میں، باب اس بات کا بیان کہ تمہاری دعائیں تمہارے ایمان کی علامت ہیں، ح8

[3] ابوداؤد، سنن ابی داؤد، وتر کے فروعی احکام ومسائل، جو شخص وتر نہ پڑھے وہ کیسا ہے؟ ح:1420،

پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ آدمی پر پانچ نمازیں دن رات میں پڑھنا فرض ہے [1]۔قرآن مجید کی بہت سی آیات میں نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا ذکر آیا ہے۔ ایمان ایک حقیقت ہے وہ کسی تصور یا وہم کا نام نہیں ہے۔ یہی ایمان ہے جو آدمی سے بہت سے کام کرواتا ہے اور بہت سے کاموں سے روکتا ہے۔ یہی بات بقول امین احسن اصلاحی اس آیت اَلَّذِیْنَ اِن مَّکَّنّٰھُمْ میں ذکر فرمائی گئی ہے کہ دو کام کرنے کے ہیں ایک اقامت الصلوٰۃ اور دوسرا راہ خدا میں خرچ کرنا تو پتہ چلتا ہے کہ یہی دو کام تمام بھلائیوں کی جڑ اور تمام نیکیوں کی اصل ہیں [2]"۔

اس آیت کریمہ پر غور و فکر کرنے سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ نماز اور زکوٰۃ ان نیکیوں میں سے ہیں جن کو اسلام میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ باقی تمام نیکیاں انھی دو نیکیوں کے زیر اثر ہیں، بلکہ انھیں سے پیدا ہونے والی ہیں۔ اسی لیے قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر ان کا ذکر اس انداز میں آیا ہے کہ گویا ان دو کا ذکر آ گیا تو سب کا ذکر آ گیا۔ مثلاً: ﴿فانْ تَابُوْا واقامُوا الصَّلاۃَ وآتوا الزکوٰۃ فاخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ [3]﴾ پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی بن گئے۔

اقامت صلوۃ اور ریاست کی ذمہ داریاں:

ریاست کا وجود تنفیذ احکام سے تعلق رکھتا ہے۔ تنفیذ کی بنیاد میں دو امور مرکزی کردار رکھتے ہیں۔ پہلی چیز تو طاقت اور قوت حاکم ہے اور دوسری چیز اخلاقی اقدار ہیں۔ [4] اس کی مثال دور فاروقی رضی اللہ عنہ میں حکام بالا کو یہ اعلان بھجوایا جانا ہے۔

> "میرے نزدیک سب سے مہتم بالشان چیز نماز ہے۔ جو اس کی پوری حفاظت کرلے گا تو وہ دین کے باقی اجزاء اوامر واحکام اور ان کی تابعداری و تنفیذ کا بھی اہتمام کرئے گا اور جو اس کی حفاظت اور اہتمام نہ کرئے وہ دین کے دوسرے اجزاء کو بھی ضائع کردے گا۔" [5]

گویا حاکم کی صفات میں ایک بنیادی صفت اہتمام صلوۃ بتایا گیا ہے۔ دوسری نظیر غلام کو جب امیر بنایا گیا تو گورنر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جواب دیتے ہیں: "قرآن زیادہ جاننے والا ہے" اور احادیث کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ((انَّ اللہَ یَرْفَعُ بھذَاالْکِتَابِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بہ اٰخَرِیْنَ [6]))۔

---

[1] ابن قدامہ، **المغنی**، ص63

[2] اصلاحی: امین احسن، **تدبر قرآن**، ص50

[3] توبہ:11

[4] محمد اسد، **اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول**، (مکتبہ رحمانیہ، ماڈل ٹاؤن لاہور، طبع2006ء)

[5] امام مالک، **موطاامام مالک: باب وقوت الصلوٰۃ**، ص6

[6] مسلم، **صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمہ، وفضل من تعلم حکمۃ من فقہ أوغیرہ فعمل بھاو علمھا**:41، حدیث:1351۔

تنفیذ امور کی رعایت احکام قرآنی کے سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے اور واضح انداز میں مسلم حکومت کو یہ بات سمجھادی گئی ہے۔ مسلمانوں کو اقتدار اور زمین کی حکومت ملنا، اس کی غرض وغایت کے بارے میں فرمان باری تعالی ہے: ﴿ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ أَقَامُوا ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا ٱلزَّكَوٰةَ وَأَمَرُوا بِٱلْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ ٱلْمُنكَرِ[1]﴾ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوے مفسرین نے لکھا ہے:

> "اللہ ضرور مدد کرے گا ان لوگوں کی جنھیں اقتدار عطاء کرے تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوۃ دیں گے اور اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ تعالی نے یہ وعدہ پورا کر دیا۔ خلفاء راشدین کی مدد کی اور عرب کے جبّاروں عجم کے شہنشاہوں اور روم کے پر حیرت جراروں پہ فتح عطاء فرمائی۔ کافروں کے ملک ان کو عطاء فرمادیئے۔"[2]

اور یہ نصرت خداوندی بنیادی عنصر قرار دیا گیا اسلامی سلطنت کے قیام کا جس کی تصریح یوں کی گئی ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ[3]﴾ "اور اللہ وعدہ کرتا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے کہ ضرور ان کو زمین میں خلافت عطا کی جائے گی جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو عطا کی گئی۔ اور وہ اعمال صالحہ کیا تھے جن کی وجہ سے خلافت فی الارض کی ذمہ داری سپرد کیے گے کہ زمین پر نیکی اور خداپرستی اور عدل وانصاف ہو اور بطور پیشن گوئی فرمایا کہ وہ ضرور ایسا کریں گے[4]۔

تفسیر ماجدی میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

> "اور یہ حقیقت ہے کہ اگر کسی جگہ سچے مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے تو مسجدیں آباد و پر رونق ہو جائیں۔ ہر طرف سے تکبیر و تہلیل کی صدائیں گونجا کریں اور جب بیت المال کا نظام قائم ہو جائے تو کوئی ننگا بھوکا نہ رہے۔ عدالتوں میں انصاف بکنے کے بجائے ملنے لگے۔ جعل سازی دروغ گوہی اور رشوت کا بازار سرد پڑ جائے۔ امیر کو غریب کی تحقیر کا کوئی موقع اور کوئی حق نہ رہے۔ غیبتیں، بدکاریاں، چوریاں، ڈاکے خواب وخیال ہو جاہیں۔ سود خور ساہوکاروں اور سود کار بینکوں کے ٹاٹ الٹ جائیں۔ گویئے، نچیئے اگر تائب نہ ہوں تو شہر بدر کر دیئے جائیں۔ سینما، تھیٹر تمام شہوانی تماشہ گاہوں کے پردوں کو آگ لگادی جائے۔ گندہ، فحش افسانہ اور شاعری کی جگہ صالح و پاکیزہ ادبیات لے لیں۔ غرض یہ کہ دنیا رہ کہ بھی نمونہ جنت بن جائے"[5]

---

[1] الحج: 45

[2] قاضی ثناءاللہ، **تفسیر مظہری مترجم**، (ضیاءالقرآن پبلی کیشنز، لاہور، 2002ء)، 418/6

[3] النور: 55

[4] حقانی: **تفسیر حقانی، پارہ 18**، (میر محمد کتب خانہ مرکز علم وادب، آرام باغ کراچی)، 396/3

[5] دریاآبادی، مولانا عبدالماجد، **تفسیر ماجدی**، (پاک کمپنی اردو بازار، لاہور) ص 707

غرض مسلمانوں کی حکومت کا وجود ہی اوامر الٰہی کی تعمیل اور خاص اقامت صلوۃ اور ایتاءزکوۃ اور معاشرہ میں ان احکامات کی ترویج واشاعت کے لیے ہے۔ "اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ" یہ آیت کریمہ اس زمانہ میں نازل ہوئی کہ جس وقت مسلمانوں کے پاس کسی قسم کی کوئی حکومت نہ تھی اور ابھی تک ریاست مدینہ کی بنیاد بھی نہیں رکھی گئی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی خوشخبری سنادی کہ اگر مسلمانوں کو حکومت مل گئی تو وہ دین کی مذکورہ خدمات سرانجام دیں گے۔ اسی بناپر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: "ثَنَاءٌ قَبْلَ بَلَاءٍ" کہ یہ آزمائش کے آنے سے قبل ان کی تعریف بیان ہورہی ہے کہ اگران کو یہ ذمہ داری سپرد کی جائے تو وہ یہ اقدامات سرانجام دیں گے۔ پھر دنیا نے ان کے کارناموں کو دیکھا کہ جب انھیں اقتدار حاصل ہوا تو انھوں نے اپنے زیر تسلط علاقوں میں نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کیا اچھے کاموں کو رواج دیا اور برے کاموں کا راستہ بند کردیا۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "آیت کریمہ میں ان لوگوں کے لیے ہدایت بھی ہے جن کو رب تعالیٰ ملک وسلطنت عطاء کرے، وہ اپنے اقتدار میں یہ کام انجام دیں جو خلفائے راشدین نے اپنے وقت میں انجام دیئے تھے[1]"۔

اقامت صلوۃ میں ریاست کا کردار روز اول سے ہی عیاں ہے کہ جب مدینہ میں اولین اسلامی ریاست کا سنگ بنیاد پڑا تو جو پہلا کام حضرت محمد ﷺ نے کیا وہ قباء میں مسجد کی تعمیر تھی۔ پھر مدینہ میں قدم رنجہ فرمائے تو یہاں بھی سب سے پہلا کام مسجد کی تعمیر فرمائی اور اس تعمیر کے عمل میں خود بنفس نفیس شریک رہے۔ تعمیر مسجد کے دوران وہ مشہور شعر جو اسلامی تعلیمات کے بنیادی نظریہ کو واضح کرتا ہے اور آخرت ہی کو مقصود و منتہا بتلاتا ہے۔ "اللّٰھُمَّ لَاعَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَۃَ فَاغْفِرِ الْمُھَاجِرَ وَالْاَنْصَارَ[2]" جب مٹی گارے کا کام تعمیر مسجد میں ہورہا تھا تو ان اشعار کا زبان اقدس ﷺ پر آنا ایک خاص اور لطیف اشارہ ہے کہ آخرت کی زندگی بنانے کا مرکزی محور مسجد ہے۔ اسی سے جہاں اور تعلیمات و تشریحات اسلام کے چشمے پھوٹیں گے وہیں یہ مسجد بنیادی اسلامی عبادت، نماز کا اصلی مرکز و محور بھی ہوگی۔ چونکہ اقامت صلوۃ کی ایک بنیادی شرط مسجد ہے اور اس میں نماز کی ادائیگی ہر فردِ مسلم کا وظیفہ تھا۔ اس لیے جہاں (("لَا صَلٰوۃَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ[3])) مسجد کے پڑوسی کی نماز مسجد کے سوا نہیں ہوتی۔ اس بات کا حکم دیا گیا وہاں مسجد کو ہر متقی کا گھر بھی قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح مچھلی کے پانی میں رہنے کی مثال مومن کے مسجد میں قیام کرنے کے ساتھ دی گئی ہے۔ اسلامی حکومت ہر دور میں مسجد کی تعمیر کو اپنی بنیادی ذمہ داری سمجھتی رہی ہے۔ اس لیے جہاں اسلامی ادوار اور خلفائے راشدین کے زمانے کو تاریخ میں قلمبند کیا گیا ہے تو مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر اور توسیعِ حرمِ مکی ایک مستقل عنوان رہا ہے۔ حتیٰ کہ توسیع کے دوران ہونے والی معمولی باتیں بھی تاریخ میں قلمبند کی گئی ہیں۔ جیسے سیدنا

---

[1] محمد شفیع، مفتی، **معارف القرآن**، (مکتبہ معارف القرآن، کراچی، طبع جدید، 2008ء) 271/6

[2] بخاری، الجامع الصحیح، **کتاب الرقاق، باب سکرات الموت**۔ 107/8، ح: 6514

[3] الدار قطنی، علی بن عمر بن احمد، **سنن الدار قطنی**، 420/1 ح 1538

حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مکان لینے کی بات کرنا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا حق نہ چھوڑنا اور بالا خر رضا مندی سے دے دینا۔ یہ واقعہ ایک طرف اسلامی حکومت کی مساجد سے دلچسپی کو واضح کرتا ہے تو ساتھ ہی حق والے سے زبردستی کرنے پر ریاست کو بے بس بھی قرار دیتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بڑے کارناموں میں ایک کارنامہ مسجد نبوی کی توسیع کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ جب شام و دمشق تک پہنچا تو جامع دمشق ایک مثال بن گئی۔ ہر زمانے کے مسلمان حکمران اس بات کا اپنی حد بساط میں بھرپور التزام کرتے رہے ہیں۔ جس کا مظہر غرب اقصی میں غرناطہ کی مسجد ہے۔ اسی طرح ماورائے نہر کی کتنی مساجد مسلمانوں کی طرز حکومت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں مسلم حکمرانوں کی بڑی نشانیاں وہ مساجد ہی ہیں۔ جیسے پاکستان میں بادشاہی مسجد لاہور اور جامع مسجد ٹھٹھہ وغیرہ۔ شاید ہی کوئی معروف و مشہور علاقہ ہو جس میں مسلم حکمرانوں کی مساجد کی تعمیر کے شاہکار نہ ہوں۔ جو ان کی عظمت رفتہ و فنِ تعمیر کی بہترین مثالیں پیش کرنے کے ساتھ اسلامی حکومت کے مقاصد اصلیہ میں سے اقامت صلوۃ میں مساجد کے کردار اور اس میں ارباب حکومت کے ذوق کی بھی نشاندہی کرتی ہیں۔ جس کا ایک مظہر آج بھی اسلام آباد کے دامن میں بنی مسجد فیصل ہے۔ چونکہ مسجد میں امامت کا فریضہ اصطلاح شریعت میں امامت صغری کہلاتا ہے اور یہ مسئلہ بھی شریعت میں واضح کیا جا چکا ہے کہ امامت صغری کا حقدار بھی وہی ٹھہرتا ہے جو امامت کبری کا حقدار ہوتا ہے۔ یا اسی کو بدلیں کہ امامت کبری کا حقدار ہی امامت صغری کا حقدار کہلاتا ہے۔ اسی کے ضمن میں کتبِ فقہ میں ایک مسئلہ تحریر کیا گیا ہے کہ اگر حاکم وقت خود کسی جگہ امامت نہ کروا سکے اور اس نے دو اماموں کو مقرر کر لیا ہو، مختلف نمازوں کے لیے تو حاکم وقت کی بتلائی ہوئی ترتیب امامت سے وہ تجاوز نہ کریں گے۔ لہذا نماز کو قائم کروانے کی مکمل ذمہ داری حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کا اہتمام کریں۔

ریاست پاکستان میں اقامت الصلٰوۃ کے لیے کوئی خاص اقدامات نہیں کئے گے۔ حکومتی سطح پر مساجد کے نظام کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں گیا اور شاید اسے زندگی کا اہم شعبہ سمجھا ہی نہیں گیا۔ عملاً حکومت مساجد کے نظام سے دور رہی ہے۔ پاکستان کی تقریباً تمام ہی مساجد کا انتظام علماء کے کنٹرول میں رہا ہے اور علماء عوام الناس کے تعاون سے اس نظام کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اوقاف کی چند مساجد چلا کر حکومت نے خود کو بری الذمہ سمجھ لیا۔ اگرچہ مسلمان ملکوں میں مساجد کے نظم و نسق کو مکمل طور پر ریاستی کنٹرول کے ذریعے چلانے کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں تاہم پاکستان جیسے متنوع اور جمہوری معاشرے میں عملاً ایسا ممکن نہیں ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں یہ چیز بالکل اجنبی ہو گی اور یہاں کے مخصوص مزاج اور حالات کے اعتبار سے ناقابل عمل بھی۔ ویسے بھی ریاست ہر شعبے کو اپنے کنٹرول میں لینے کی بجائے اسے مانیٹر اور ریگولیٹ کرنے کی راہ اپنائے تو یہ زیادہ بہتر پالیسی ہوتی ہے۔ اس لئے مساجد کے نظم و نسق کو کسی ڈھب پر اور اصلاحات کے کسی مجموعے پر لانے کے لئے ترغیبی پہلو کی خاصی اہمیت ہے، جس میں یقیناً ریاست کا کردار سب سے اہم اور مرکزی ہے۔

پاکستان میں نظام صلوٰۃ کی بہتری کے لیے 2015ء میں نظام صلٰوۃ قائم کیا گیا جس میں یہ طے کیا گیا کہ اسلام آباد شہر میں تمام مسالک کی مساجد میں اذانیں ایک ہی وقت پر ہوں گی اور باجماعت نمازیں بھی ایک ہی وقت پر پڑھائی جائیں گی۔ وفاقی حکومت نے اس سلسلے میں اسلام آباد کے تاجروں سے اوقات نماز کے دوران 20 سے 25 منٹ تک اپنے کاروبار بند رکھنے کی اپیل بھی کی۔ اس کے ساتھ نمازوں کے اوقات میں سرکاری دفاتر میں وقفہ بھی ہو گا۔ نظام صلوۃ کے نفاذ کا اعلان مذہبی امور اور بین المذاہبی ہم آہنگی کے وفاقی وزیر سردار محمد یوسف نے یکم مئی 2015ء کے روز اسلام آباد شہر کی شاہ فیصل مسجد میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس کے تین سال بعد جون 2018ء میں وفاقی وزارتِ مذہبی امور نے نظامِ اوقاتِ نماز کا کیلنڈر جاری کیا جسے بعض مسالک کے علماء نے دین و شریعت کے منافی قرار دے کر سختی سے رد کر دیا یوں کچھ عرصہ بعد یہ معاملہ بھی پس منظر میں چلا گیا۔ اسی طرح حکومت پاکستان نے اوقاف ایکٹ کے تحت مساجد کی رجسٹریشن کے عنوان سے مساجد کو اپنے کنٹرول میں لینے کی کوشش کی لیکن اس میں بہتری اور خیر کے پہلو کو نظر انداز کر کے اپنے مقاصد کے حصول کو پیش نظر رکھا جسے علماء نے احکامِ شریعت اور شہری حقوق کے منافی قرار دے کر مسترد کر دیا۔

زکوٰۃ:

زکوٰۃ ایک ایسا نظام ہے جس کے ذریعے غریب اور مسکین ترقی اور خوشحالی کی راہوں پر آجاتے ہیں اور ان کی معاشی مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔ اسلام میں زکوٰۃ کی بہت اہمیت ہے۔ اسلام کے بنیادی پانچ اراکین میں دوسرا رکن زکوٰۃ ہے۔ قرآن حکیم میں تقریباً بیاسی (82) مقامات پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نماز کے بعد اسلام میں سب سے اہم ترین چیز زکوٰۃ ہے اور بعض ایسے مواقع بھی ہیں جہاں زکوٰۃ نماز سے بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہے؛ کیونکہ نماز حقوق اللہ میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق العباد میں سے ہے اور اللہ کریم اپنا حق تو معاف کر دیتا ہے، لیکن اپنے بندوں کا حق کبھی معاف نہیں کرتا۔ یہ نظامِ زکوٰۃ ہی ہے جس کے ذریعہ سے امیر و غریب کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اور پسے ہوئے لوگوں کو ابھرنے کا سہارہ ملتا ہے۔ اسی وجہ سے جب آپ ﷺ کا وصال ہوا تو مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا۔ جن کو شریعتِ اسلامی میں منکرین زکوٰۃ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس وقت خلیفہ اول سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے زکوٰۃ وصول کرنے میں سختی کی اور فرمایا: آپ ﷺ کے زمانے میں جو بھی زکوٰۃ ادا کرتا تھا اور اب نہیں کرتا تو اس کے ذمہ اگر ایک رسی بھی ہے تو میں اس سے وہ بھی لیکر مسلمانوں کے بیت المال میں جمع کراؤں گا۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی بھی نماز اور زکوٰۃ کے درمیان کسی قسم کا فرق کرنے کی کوشش کرے گا تو میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خلیفہ اول سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد اول اول کاموں میں سے ایک کام یہ کیا کہ انہوں نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا اور اس وقت تک یہ جہاد جاری رہا جب تک کہ اس مسئلہ کو حل نہ کر دیا اور منکرینِ زکوٰۃ کا برپا کیا ہوا فتنہ جڑ سے اکھاڑ نہ دیا۔

قرآنِ پاک نے اسلامی ریاست کے حکمرانوں کی ذمہ داریوں اور فرائض کو ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ﴿الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ[1]﴾ یہ (حق والے) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دے دیں تو وہ نماز کا نظام قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیکی اور بھلائی کا حکم کریں اور لوگوں کو برائی سے روک دیں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ مذکورہ بالا آیت کی رو سے اسلامی ریاست کے اور حکومتِ اسلامیہ کے قیام کے چار بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں:

1. اقامت الصّلوٰۃ
2. ایتائے زکوٰۃ
3. امر بالمعروف

---

[1] الحج: 41

4. نہی عن المنکر

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جب مسلمان حکمران نظام حکومت کو سنبھال لے تو اس کے بعد سب سے پہلی ذمہ داری اس پر یہ عائد ہوتی ہے کہ وہ نماز کے قیام کو یقینی بنائے اور زکوۃ کی وصولی کر کے مسلمانوں کے بیت المال میں جمع کروائے۔ زکوۃ کے حکم کے پیچھے یہ راز ہے کہ اسلامی حکومت معاشرے کو ایسا اقتصادی نظام، سماجی ڈھانچہ اور طرز زندگی عطاء کرے جس کی وجہ سے حرام مال سے بچا جاسکے اور حلال کی طرف عوام الناس کی رغبت بڑھے۔

زکوۃ کی تعریف:

زکوۃ عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا معنی طہارت و پاکی، نشو و نما اور بڑھوتری واضافہ کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں زکوۃ "مخصوص مال میں سے مخصوص مقدار کا شریعت کے بیان کیے ہوئے مصارف میں خرچ کرنا ہے"[1]۔ علامہ احمد بن فارس اپنی شہرہ آفاق کتاب مقاییس اللغۃ کے اندر فرماتے ہیں:

"زَكَى الزَّاءُ وَالْكَافُ وَالْحَرْفُ الْمُعْتَل أَصْل يَدُّلُ عَلَى نِمَاءٍ وَزِيَادَةٍ وَيُقَالُ الطَّهَارَةُ زَكَاةُ الْمَالِ قَالَ بَعْضُهُمْ:سُمِيَتْ بِذَلِكَ لِأَنَّهَا مِمَّا يُرجَى بِه زَكَاءُ الْمَالِ، وَهُوَ زِيَادَتِهِ وَنِمَاؤُهُ وَقَالَ بَعْضُهُمْ: سُمِيَتْ زَكَاةٌ لِأَنَّهَا طَهَارَةٌ قَالُوْا: وَحُجَّةُ ذَلِكَ قَوْلُه جَلَّ ثَنَاؤُهُ:"خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا[2]"وَالْأَصْلُ فِيْ ذَلِكَ كُلُّهُ رَاجِعٌ إِلَى هَذَيْنِ الْمَعْنَيَيْنِ، وَهُمَا النَّمَاءُ وَالطَّهَارَةُ"[3]. زاء، کاف اور حرف علت اصل میں زیادتی اور بڑھوتری پر دلالت کرتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی مال کو پاکیزہ کرنے کے ہیں۔ اس کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اس سے مال میں بڑھوتری اور زیادتی ہوتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ زکوۃ کو زکوۃ اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ مال کو پاک کرنے والی ہے اور اس کی دلیل فرمان باری تعالی کا قول ہے: "اپنے مالوں سے صدقہ نکال کر انہیں پاک کریں" اس سب کی اصل ان دو معنوں یعنی پاکیزگی اور بڑھوتری کی طرف جاتی ہے۔

کمال بن سید زکوۃ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "تُعرَّفُ الزَّكَاة فِيْ اللُّغَةِ بِأَنَّهَا البَرَكَةُ، وَالطَّهَارَةُ، وَالنِّمَاءُ، وَهِيَ مِنْ الفِعْل زَكَا، وَزَكَا الشَّيْءُ أَيْ زَادَ وَنَمَا[4]"۔ لغت میں زکوۃ کا معنی برکت اور پاکیزگی اور بڑھوتری کے ہیں اور یہ فعل زکا سے نکلا ہے یعنی "زکا الشیئ" زیادتی اور بڑھوتری۔

علامہ زین الدین بن نجیم کنز الدقائق کی شرح بحر الرائق میں زکوۃ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] رحمانی، مولانا خالد سیف اللہ، **قاموس الفقہ، فقہی اصطلاحات**، زمزم پبلیشرز، کراچی، 2007ء: ج:1 ص:280۔

[2] التوبۃ:103

[3] القزوینی، احمد بن فارس، **مقاییس اللغۃ**، الناشر: دار الفکر عام النشر: 1399ھ-1979م.، 18/3

[4] کمال بن السید سالم، **صحیح فقہ السنۃ وأدلتہ وتوضیح مذاہب الأئمۃ**، القاھرۃ: المکتبۃ التوفیقیۃ. 5/2

"وَهِيَ لُغَةً الطَّهَارَةُ سُمِّيَتْ زَكَاةُ الْمَالِ زَكَاةً؛ لِأَنَّهَا تُزَكِّي الْمَالَ أَيْ تُطَهِّرُهُ وَقَالَ تَعَالَى:"خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً[1]" وَقِيلَ سُمِّيَتْ زَكَاةً لِأَنَّ الْمَالَ يَزْكُو بِهَا أَيْ يَنْمُو وَيَكْثُرُ ثُمَّ ذَكَرَ فَعَلَ بِالْفَتْحِ يُقَالُ زَكَاءُ الْمَالِ زِيَادَتُهُ وَنَمَاؤُهُ، وَزَكَا أَيْضًا إذَا طَهُرَ ثُمَّ ذَكَرَ فِي بَابِ التَّفْعِيلِ زَكَّى الْمَالَ أَدَّى زَكَاتَهُ وَزَكَّاهُ أَخَذَ زَكَاتَهُ.وَفِي الْغَايَةِ أَنَّهَا فِي اللُّغَةِ بِمَعْنَى النَّمَاءِ، وَبِمَعْنَى الطَّهَارَةِ وَبِمَعْنَى الْبَرَكَةِ يُقَالُ زُكَّتْ الْبُقْعَةُ أَيْ بُورِكَ فِيهَا وَبِمَعْنَى الْمَدْحِ يُقَالُ زَكَّى نَفْسَهُ وَبِمَعْنَى الثَّنَاءِ الْجَمِيلِ يُقَالُ زَكَّى الشَّاهِدَ"[2]۔لغت میں اس کا معنی ہے پاکیزگی اور مال کی زکوۃ کو اس لئے زکوۃ کہا جاتا ہے؛ کیونکہ اس کی وجہ سے مال پاک ہو جاتا ہے۔یعنی مال میں بڑھوتری اور زیادتی ہوتی ہے۔ پھر انہوں نے فعل کے باب سے اس کا معنی زیادتی اور بڑھوتری کیا ہے اور باب تفعیل سے اس کا معنی بیان کیا ہے کہ زکوۃ وصول کرنے والے کے ہیں۔اور غایہ میں ہے کہ لغت میں اس کے معنی بڑھوتری، طہارت اور برکت کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس حصہ کی زکوۃ ہو گئی یعنی اس میں برکت ہو گئی۔اور یہ مدح کے معنی میں بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نفس زکی ہو گیا یعنی اچھی مدح کی جاتی ہے۔اور کہا جاتا ہے گواہ زکی ہے۔

خلاصۃ الکلام یہ ہے کہ لغت میں زکوۃ کا معنی بڑھوتری، پاکیزگی، برکت اور تعریف کے ہیں

زکوۃ کا اصطلاحی معنی:

زکوۃ شریعت کی اصطلاح میں ایسے مال کو کہا جاتا ہے جو کوئی مسلمان اپنا ہر قسم کا نفع ختم کر کے کسی ایسے مسلمان فقیر کو دے جو نہ خود ہاشمی ہو اور نہ کسی ہاشمی کا آزاد کردہ ہو اور معین مال کے مخصوص حصہ کو نکال کر معین افراد کو اللہ تعالی کی بندگی اور رضامندی کی خاطر ادا کرے۔ زکوۃ ایسا حق ہے جو فقیر یا ایسے لوگوں کو دیا جاتا ہے جن کو شریعت نے مستحقین کہا ہے اور جو مال میں واجب کا درجہ رکھتا ہے۔

کمال بن سید فرماتے ہیں:"وفِي الاِصْطَلَاحِ هِيَ مِقْدَارٌ مُحدّدٌ مِنْ أَمْوَالٍ مُحدَّدَةٍ، يُخْرِجُ فِي أَوْقَاتٍ مُحدَّدَةٍ، وَيُصْرَفُ لِأَصْنَافٍ مُحدّدَةٍ"[3]اصطلاح میں زکوۃ سے مراد خاص مال میں سے ایک مخصوص مقدار کو مخصوص وقت میں مخصوص اوصاف کے ساتھ نکالنا ہے۔

جب مخصوص مال کہا گیا تو اس کے اندر وہ تمام چیزیں ہیں جن کو زکوۃ کے لئے گنا جاتا ہے اور مخصوص مقدار سے مراد جیسے سونے، چاندی نقدی وغیرہ میں آڑھائی فیصد اور مویشیوں میں مختلف طریقوں سے جن کی تفصیل آگے آئے گی۔اسی طرح زمین سے عشر وغیرہ نکالنا زکوۃ کے زمرے میں آتا ہے اور مخصوص وقت سے مراد یہ ہے کہ اس مال نصاب پر سال گزر چکا ہو۔

---

[1] الکھف:81

[2] ابن نجیم، زین الدین، **البحر الرائق شرح کنز الدقائق ومنحۃ الخالق وتکملۃ الطوري**، المحقق: زکریا عمیرات، دار الکتب العلمیۃ، 1997ء، 216/2

[3] کمال بن السید سالم، **صحیح فقہ السنۃ وأدلتہ وتوضیح مذاہب الأئمۃ**، القاھرۃ: المکتبۃ التوفیقیۃ. 5/2

الشیخ حافظ الدین النسفی زکوۃ کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "الزَّكَاةُ تَمْلِيْكُ الْمَالِ مِنْ فَقِيْرٍ مُسْلِمٍ غَيْرَ هَاشِمِيٍّ وَلَا مَوْلَاهُ، بِشَرْطِ قَطْعِ الْمَنْفِعَةِ عَنِ الْمَالِكِ مِنْ كُلِّ وَجْهٍ لله تَعَالى-"[1] زکوۃ مسلمان فقیر جو کہ ہاشمی یا اس کا آزاد کردہ نہ ہو کو مال کا مالک بنانا اس شرط کے ساتھ کے مالک اللہ کی خاطر اس سے اپنے ہر قسم کی فائدے کو ختم کر دے۔

زکوۃ کی وجہ تسمیہ:

زکوۃ کو اس لیے زکوۃ کہا جاتا ہے؛ کیونکہ زکوۃ کی وجہ سے صاحب مال کے مال کے اندر اللہ تعالی کی قدرت اور برکت کی وجہ سے زیادتی ہوتی ہے۔ ویسے دیکھنے میں تو جب مال میں سے کچھ حصہ نکال لیا جاتا ہے تو وہ مال کم ہو جاتا ہے، لیکن اللہ تعالی نے فرمایا کہ اس سے مال زیادہ ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے مال کے اندر برکت پیدا ہو جاتی ہے اور جہاں عام حالت میں زیادہ اخراجات ہوتے تھے اب وہ اخراجات ہونا بند ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی کی بیماری یا کسی اور مصیبت کی وجہ سے مال خرچ ہونا تھا تو جب اس سے اپنے مال سے زکوۃ نکال لی تو ایسی تمام مصیبتوں سے اللہ اسے محفوظ رکھے گا اور اس کے مال سے کچھ خرچ نہیں ہو گا۔ اسی طرح جو اخراجات ایک مہینہ کے اندر ہوتے تھے اللہ اس کے مال کے اندر برکت ڈال دے گا۔ اس کے اخراجات کم سے کم تر ہو کر وہی مال اب زیادہ عرصہ تک چلتا رہے گا۔ جبکہ اگر کوئی شخص اپنے مال سے زکوۃ نہیں نکالتا تو اللہ اس کے اوپر ایسی مصیبتیں ڈال دیتا ہے کہ ان سے نمٹتے نمٹتے اس کا بہت سا مال خرچ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح زکوۃ کی ایک وجہ تسمیہ یہ بھی ہے کہ اس سے زکوۃ نکالنے والے کا نفس پاک ہو جاتا ہے اور اس کے اندر مال کی جو محبت ہوتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے اللہ تعالی اسی صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا[2]﴾ آپ ان کے اموال میں سے زکوۃ لیں اور ان کو پاک کریں اور اس سے ان کا تزکیہ کریں۔

زکوۃ کی فرضیت:

زکوۃ کی فرضیت کے بارے علماء کا اختلاف ہے کہ یہ کس سن کو ہوئی؟ مگر جمہور کے نزدیک زکوۃ ہجرت کے بعد فرض ہوئی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ علماء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت کا حکم ہجرت مدینہ کے بعد آیا اور روزے ہجرت کے بعد فرض ہوئے؛ کیونکہ جو آیت روزوں کے فرضیت کے لیے نازل کی گئی ہے اس کے مدنی ہونے میں کسی قسم کا کوئی اختلاف موجود نہیں ہے۔

---

[1] بدر الدین العینی، ابو محمد محمود بن احمد، **البنایۃ شرح الھدایۃ**، (دار الکتب العلمیۃ، 2012ء)، 288/3

[2] التوبۃ: 103

حضرت قیس بن سعد سے روایت ہے:

((أَمَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِصَدَقَةِ الْفِطْرِ قَبْلَ أَنْ تَنْزِلَ الزَّكَاةُ، فَلَمَّا نَزَلَتِ الزَّكَاةُ لَمْ يَأْمُرْنَا وَلَمْ يَنْهَنَا وَنَحْنُ نَفْعَلُهُ))[1] رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم صدقہ فطر ادا کریں، اس حال میں کہ ابھی زکوۃ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور جب زکوۃ فرض کی گئی تو اس کے بعد آپ ﷺ نے ہمیں صدقہ دینے کا نہ حکم دیا اور نا ہی منع فرمایا، لیکن ہم لوگ صدقہ دیا کرتے تھے۔[2]

بعض علماء کے نزدیک اللہ تعالی نے زکوۃ کو ہجرت سے قبل مکہ مکرمہ میں ہی فرض کر لیا تھا، لیکن اس میں مال کی کوئی تحدید نہیں تھی اور وقت اور مقدار کی تفاصیل بھی نہیں تھی، بلکہ مطلقا اللہ کا حکم تھا اور باقی سب کچھ اللہ نے مسلمانوں کے حق پر چھوڑ دیا تھا تاکہ حاجتمندوں کی مدد کی جاسکے۔ اسی پر فرمان باری تعالی ہے: ﴿وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ[3]﴾ اور جب مسلمانوں کے دلوں میں ایمان نے صحیح گھر کر لیا اور ایمان پختہ ہو گئے تو اللہ تعالی نے ہجرت کے دوسرے سال زکوۃ کے تفصیلی احکامات، جیسے کون سے مال پر زکوۃ واجب ہے، زکوۃ کی مقدار اور دیگر امور کو بیان فرمایا۔ ہجرت کے نویں سال آپ ﷺ نے باقاعدہ زکوۃ وصول کرنے والوں کی کمیٹیاں بنائیں اور ان کو مختلف مقامات پر زکوۃ جمع کرنے کے لئے بھیجا۔[4]

علماء کرام کے ایک گروہ کے نزدیک زکوۃ کی فرضیت کا زمانہ بھی وہی ہے جب ریاست مدینہ کا وجود ہوا اور پھر جب بھی کسی جگہ حکومتی و ریاستی اختیارات کو اہل حکومت کے سپرد کیا گیا تو انہیں باقی احکامات کے ساتھ زکوۃ لینے اس میں مال کے اختیار کرنے اور اس کے خرچ کرنے کے مصارف کو تفصیل سے بتایا گیا۔ جس کی نظیر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے ملتی ہے۔ جب ان کو اہل یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو صراحتاً فرمایا: "ان کے امیروں سے زکوۃ کی وصولی ہو اور ان کے فقراء کی طرف لوٹائی جائے۔

((عن ابن عباسٍ رضي الله عنهما: أنَّ النبي ﷺ بَعَثَ مُعَاذًا إلى اليَمَنِ. فَذَكَرَ الحَدِيْثَ، وَفِيْهِ: أنَّ اللهَ قَد افتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ، تُؤْخَذُ مِن أَغْنِيَائِهِمْ، فتُرَدُّ فِي فُقَرَائِهِم، وَعَنْ أَنَسٍ: أنَّ أَبَا بَكْرٍ الصِّدِيْق كَتَبَ لَهُ هَذِهِ فَرِيْضَة الصَّدَقَة الّتِي فَرَضَهَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَلى الْمُسْلِمِينَ، وَالّتِي أَمَرَ اللهُ بِهَا رَسُوْلَهُ[5])). ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت

---

[1] احمد بن شعیب النسائی، **سنن النسائی**، (مکتبہ رحمانیہ، لاہور، 2010)، ح: 2507

[2] **موسوعہ فقہیہ**: 280/23

[3] المعارج: 24، 25

[4] محمد بن إبراهيم بن عبد الله التويجري، **موسوعة الفقه الإسلامي** (الطبعة الأولى، بيت الأفكار الدولية)، 14/3

[55] بخاري، الجامع الصحیح، **کتاب الزکاۃ، کتاب: زکوۃ کے مسائل کا بیان، باب وُجُوبِ الزَّكَاةِ**، ح 1395

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا۔ انہوں نے حدیث ذکر کی، جس میں اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں پر صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے کہ ان کے امیروں سے لے کر ان کے غریبوں کو دیا جائے۔ انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے لکھا صدقہ یہ وہ فرض ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر عائد کیا تھا اور جس کا حکم خدا نے اپنے رسول کو دیا تھا۔

قرآن پاک میں سورۃ توبہ کی جن آیات سے زکوۃ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے، وہاں فقہاء کرام نے تصریحاً لکھا ہے کہ حاکم کا اختیار اور تعین اس حد تک معتبر ہے کہ بحثیت حاکم رسول انور ﷺ نے حکم فرمایا: ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا[1]﴾ ادائیگی زکوۃ جہاں تطھیر ذنوب کا باعث ہے وہاں اعمال کی پاکیزگی کا بھی ذریعہ ہے اور حکم بھی حاکم مدینہ کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ آپ عمّال کو بھیج کر مال زکوۃ وصول کریں، بلکہ حاکم و محکوم کے رشتہ میں حاکم کی شفقت کو بھی واضح کر فرمایا! ان کے لیے استغفار بھی کیجیے۔ آپ کا استغفار ان کے لیے اللہ کی رحمت سے قرب اور چین کا باعث بنے گا گویا زکوۃ کی فرضیت کی بنیاد ہی حکومت کے قیام اور حاکم کی طرف سے عمال کی تعین سے شروع ہوتی ہے۔

زکوۃ کن لوگوں پر فرض ہے:

زکوۃ واجب ہونے کی چند شرائط ہیں اگر یہ شرائط کسی شخص میں پوری نہ ہوتی ہوں تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی اور وہ شرائط درج ذیل ہیں:

1. **مسلمان ہونا:** زکوۃ واجب ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ زکوۃ دینے والا مسلمان ہو؛ کیونکہ تمام عبادات میں اسلام ایک بنیادی شرط ہے۔ اگر اسلام ہی نہیں تو کوئی بھی عبادت واجب نہیں ہوتی۔ اسی طرح بغیر اسلام کے زکوۃ بھی واجب نہیں ہوتی، لیکن شوافع کے نزدیک مرتد کے مال پر اس کے ارتداد سے پہلے زکوۃ واجب ہے۔

2. **عاقل ہونا:** زکوۃ کے واجب ہونے کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ زکوۃ دینے والا عاقل ہو یعنی وہ پاگل اور مجنون نہ ہو؛ کیونکہ پاگل شریعت کا مکلف نہیں ہے اور جب وہ مکلف ہی نہیں تو باوجود مال کثیر کے اس پر زکوۃ واجب نہ ہو گی۔ یہ شرط صرف حنفیہ کے نزدیک ہے جبکہ جمہور کے نزدیک مجنون کی زکوۃ اس کے مال سے اس کا وکیل ادا کرے گا۔

3. **آزاد ہونا:** زکوۃ واجب ہونے کی تیسری شرط یہ ہے کہ زکوۃ دینے والا آزاد ہو۔ اس لئے کہ زکوۃ دینے والے کا مال کا مالک ہونا ضروری ہے۔ جب ایک شخص خود کسی مال کا مالک نہیں ہو سکتا تو وہ دوسرے کو کیسے مالک بنائے گا اور غلام خود کسی مال کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اس کا مالک ہی اس کے مال کا بھی مالک ہوتا ہے تو وہ کسی اور کو کیسے مال کا مالک بنا سکتا ہے۔ غلام پر زکوۃ کے عدم وجوب پر

---

[1] التوبہ: 103

جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ غلام پر تو زکوٰۃ نہیں لیکن اگر غلام امیر ہے تو اس کے مالک اور سید پر اس کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ جبکہ مالکیہ کے نزدیک نہ غلام پر زکوٰۃ ہے اور نہ اس کے مالک کے ذمہ اس کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

4.**بالغ ہونا:** زکوٰۃ واجب ہونے کی چوتھی شرط یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والا بالغ ہو؛ کیوں کہ نابالغ شریعت کا مکلف نہیں ہے۔ اس لیے اگر کسی نابالغ بچے کے پاس اتنا مال ہے جس کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب ہو سکتی ہے تو اس کے بچپنے کی وجہ سے اس سے زکوٰۃ نہیں لی جائے گی، لیکن یہ شرط صرف حنفیہ کے نزدیک ہے۔ جمہور ائمہ کے نزدیک نابالغ کی زکوٰۃ اس کا ولی اس کے مال سے ادا کرے گا۔

5.**مال کا نامی ہونا:** زکوٰۃ واجب ہونے کی پانچویں شرط یہ ہے کہ زکوٰۃ ایسے مال پر واجب ہوتی ہے جو مال نامی ہو یعنی بڑھتا ہو یا نامی ہونے کے قابل ہو۔ جیسے سونا چاندی وغیرہ۔ اگر کسی کے پاس ایسا مال ہے جو نامی نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

6.**صاحب نصاب ہونا:** زکوٰۃ کے فرض یا واجب ہونے کی چھٹی شرط یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والا شخص صاحب نصاب ہو۔ اگر کوئی شخص صاحب نصاب نہیں یا اس کا مال مقررہ نصاب کی حد تک نہیں پہنچا تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ نصاب کے بارے میں مزید تفصیلات ان شاء آگے ذکر کی جائیں گی۔

7.**مال کا مکمل مالک ہونا:** یعنی زکوٰۃ ادا کرنے والا مقررہ مال کا مکمل طور پر مالک ہو اور اس میں ہر قسم کا تصرف کرنے کا اختیار رکھتا ہو۔

8.**سال کا گزر جانا:** اس کا مطلب یہ ہے کہ قمری اعتبار سے نصاب کے پورے ہونے کے بعد اس کا ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہو اور وہ دوران سال کبھی بھی مقدار نصاب سے نیچے نہ آیا ہو۔

9.**قرض سے پاک ہونا:** اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحب نصاب قرض دار نہ ہو۔ اگر وہ قرض دار ہے تو اسے چاہیے کہ پہلے قرضہ ادا کرے۔ اگر قرضہ ادا کرنے کے بعد اس کے پاس نصاب کی مقدار کا مال موجود ہے اور اس پر سال گزر چکا ہے تو زکوٰۃ ادا کرے گا اور اگر قرض ادا کرنے کے بعد اس کا مال کم ہو جاتا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی[1]۔

درج بالا چند شرائط ہیں اگر ان شرائط پر کوئی شخص پورا اترتا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی اور اگر کسی میں ایک بھی شرط کم ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی۔ جس شخص میں یہ تمام شرائط پائی جائیں اس پر زکوٰۃ ادا کرنا فرض عین ہے اور زکوٰۃ کا منکر کافر ہے۔

بعض علماء نے ان شروط کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے:

پہلی قسم: ایسی شروط جن کا تعلق مالک یعنی مکلف کے ساتھ ہے۔

دوسری قسم: ایسی شروط جن کا تعلق ملک یعنی مال سے ہے۔

---

[1] محمد بن فرامرز بن علی، **درر الحکام شرح غرر الأحکام**، (الناشر: دار إحیاء الکتب العربیۃ)، 171/1

دونوں کی تفصیل درج ذیل ہے

پہلی قسم: وہ شروط جن کا تعلق مالک یعنی مکلف سے ہے وہ درج ذیل ہیں:

1. مسلمان ہونا۔

2- عاقل ہونا۔

3. بالغ ہونا۔

4. آزاد ہونا۔

5. نصاب کا مالک ہونا۔

دوسری قسم: ان شرائط کی جن کا تعلق ملک یعنی مال سے ہے وہ درج ذیل ہیں:

1. مکمل ملکیت کا ہونا: یعنی مال کا مکمل طور پر مالک کے ہاتھ اور تصرف میں ہونا۔ پس جس کا مال غائب ہے یا کسی اور کے قبضہ میں ہے یا کسی ایسی جگہ مدفون ہے جس کا علم نہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہو گی۔ یا اس کا مال کسی امیر آدمی نے زبردستی اپنے قبضہ میں لے لیا ہو تو اس پر بھی زکوٰۃ نہیں۔ فرمان نبوی ﷺ ہے: ((لَا زَكَاةَ فِيْ مَالِ الضِّمَارِ[1])) یعنی اس مال پر زکوٰۃ نہیں جس سے فائدہ نہ اٹھایا جا سکتا ہو۔ اسی طرح جب حضرت عمر بن عبد العزیز نے منصب حکومت کو سنبھالا اور تمام مال جو عمال نے لوگوں کے زبردستی اپنے قبضہ میں کیے ہوئے تھے وہ واپس کروادئے اور حکم دیا کہ گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ ان سے وصول کی جائے۔ پھر جب مسئلے سے صحیح واقفیت ہوئی تو دوبارہ اپنے عمال کے لئے حکم نامہ جاری فرمایا کہ تمال سالوں کی زکوٰۃ نہ لی جائے بلکہ صرف ایک سال کی زکوٰۃ لی جائے اس لیے کہ اس سے پہلے ان کا مال مال ضمار تھا۔

قرض بھی اسی زمرے میں آتا ہے چنانچہ علماء کرام نے قرض کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

- **الدین الضعیف:** یعنی کمزور قرضہ۔ اس زمرے میں عورت کا مہر آتا ہے، جب تک کہ اس پر قبضہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس طرح کے قرضہ کا یہ حکم ہے کہ قرضہ لینے والا جب تک قرض وصول نہ کر لے اور اس پر سال نہ گزر جائے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔
- **الدین المتوسط:** درمیادنہ قرضہ۔ جیسا کہ حاجات اصلیہ کے علاوہ جو مال کسی نے بیچا تو اس کی قیمت۔ پس زکوٰۃ دہندہ اس طرح کے مال میں ان سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرے گا جن سالوں میں مال اس کے قبضہ میں نہیں تھا۔
- **الدین القوی:** جیسا کہ قرض کا بدل یا بیچی جانے والی چیز کی قیمت اس شرط پر کہ وہ چیز مال تجارت ہے۔ ایسی صورت میں قرض دہندہ پر اس وقت زکوٰۃ واجب ہو گی جب اس نے مال قبضہ میں کر لیا اور اس پر سال گزر گیا۔

---

[1] ترمذی، سنن ترمذی۔ ح: 631

2.اس کامال حاجات اصلیہ سے زیادہ ہو۔

3.اس کا نصاب ان اموال میں سے ہو جن کے بارے میں قرآنی نص وارد ہوئی ہے کہ ان پر زکوۃ واجب ہے۔

4.تمام اقسام مال پر ایک سال کا گزر ہوا ہو۔

5.مال نامی ہو یعنی بڑھنے والا ہو۔

زکوۃ کی ادائیگی کے صحیح ہونے کی شرائط:

ایک شخص جس پر زکوۃ فرض ہے۔ وہ صاحب نصاب ہے اور اس میں مذکورہ بالا تمام شرائط پائی جاتی ہیں۔ وہ زکوۃ دینا چاہتا ہے تو اس کی زکوۃ اس وقت تک صحیح نہ ہو گی جب تک کہ اس میں درج ذیل شرائط نہ پائی جاتی ہوں۔

1-نیت کا درست ہونا: فرمان نبوی ﷺ ہے: ((إِنَّمَاالْأَعْمَالُ بِالنِّيَاتِ[1])) تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔اس لئے زکوۃ ادا کرنے سے پہلے نیت کا ہونا ضروری ہے۔اگر ایک شخص نے کسی کو مال دیا لیکن زکوۃ کی نیت نہیں کی تو اس کی زکوۃ ادا نہیں ہو گی۔

2- مسلمان ہونا: اس لئے کہ غیر مسلم کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

3-زکوۃ فوراادا کرنا: ہمارے ہاں جو رمضان میں زکوۃ ادا کرنے کا رواج ہے بالکل غلط ہے۔ جب کسی کے مال پر سال گزر جائے اور مذکورہ بالا تمام شرائط پوری ہو جائیں تو اسے فوراًزکوۃ ادا کر دینی چاہیے۔

4- صحیح مستحق کو زکوۃ دینا یعنی جن آٹھ لوگوں کے بارے میں قرآن نے بتایا ہے ان کو زکوۃ دینا۔

5-زکوۃ کا کسی کو مالک بنانا۔

6اپنے شہر کے لوگوں میں سے کسی مستحق کو زکوۃ دینا۔ چنانچہ اپنے شہر کے اندر مستحق زکوۃ کی موجودگی کے باوجود کسی دوسرے شہر میں اپنی زکوۃ بیجنا یا دینا مکروہ ہے۔

7-زکوۃ ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے درمیانہ مال سے زکوۃ ادا کرے اس لئے کہ اچھے مال سے زکوۃ ادا کرنے سے مالک کے نقصان کا اندیشہ ہے اور خراب مال سے زکوۃ دینے سے فقیر کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ لہذا اپنے درمیانہ مال سے زکوۃ ادا کرنی چاہیے اسی وجہ سے جب آپ ﷺ جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو فرمایا: ((فَإِيَّاكَ وَكَرَائِمَ أَمْوَالِهِمْ[2]))لوگوں کے عمدہ مال لینے سے بچنا۔

8-زکوۃ حلال مال سے نکالنا۔ حرام مال سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی۔[3]

---

[1]بخاری، الجامع الصحیح،6/1،رقم الحدیث:1.

[2]ایضاً،129/2،رقم الحدیث:1496.

[3]الحاجة نجاح الحلبي، فقه العبادات على المذهب الحنفي ص:146

کن کن چیزوں میں زکوٰۃ دی جائے گی:

درج ذیل پانچ قسم کے مال پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

1.جانوروں یعنی چوپایوں پر۔

2.سونے چاندی پر۔

3.تجارتی مال پر۔

4.خزانے اور معدنیات پر۔

5.کھیتی باڑی اور پھلوں پر۔

پاکستان میں نظام زکوٰۃ:

پاکستان میں نظام زکوٰۃ کے حوالہ سے 6 مئی 2020ء کو شہزاد ملک نے بی بی سی اردو میں ایک آرٹیکل شائع کیا جس کے مندرجات حسبِ ذیل ہیں۔ "پاکستان میں ہر سال زکوٰۃ کی مد میں اربوں روپے لیے جاتے ہیں اور اس ترمیم کے بعد اب زکوٰۃ اکٹھی کرنے کا واحد طریقہ حکومت کی طرف سے زکوٰۃ کے نصاب کے اعلان کے بعد بینکوں میں سیونگز اکاؤنٹس میں جمع کروائی گئی رقم سے ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ کی رقم کو منہا کیا جاتا ہے۔ پہلے اس معاملے کو دیکھنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان میں یہ نظام کب رائج ہوا[1]"

پاکستان میں زکوٰۃ کا قانون کب رائج ہوا؟:

پاکستان میں زکوٰۃ اور عُشر کا قانون سابق فوجی صدر جنرل ضیاالحق کے دور میں 1980ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی روشنی میں نافذ کیا گیا۔ جب یہ قانون عمل میں لایا گیا تو خدشات پہلے سے ہی موجود تھے کہ پاکستان کے نظام میں اس قانون پر عملدرآمد میں مشکلات پیش آئیں گی، جبکہ اس کے ساتھ ساتھ اس میں بے ضابطگیوں کے خدشات بھی موجود تھے۔ اس نظام کے تحت کوشش کی گئی کہ فیڈرل زکوٰۃ کونسل اس قانون پر عملدرآمد کی نگرانی کرے۔ جس کی سربراہی سپریم کورٹ کا جج کرے۔ جبکہ اس کونسل کے دیگر ارکان بھی اچھی شہرت کے حامل ہوں۔ اسی طرح صوبائی سطح پر بھی ہائی کورٹ کا جج اس کونسل کی نگرانی کرے، جبکہ بالکل بنیادی سطح پر بالغ مسلمان اساتذہ اور علما ایک مسجد میں بیٹھ کر زکوٰۃ کونسل کے چیئرمین اور دیگر ارکان کو منتخب کریں۔

---

[1] شہزاد ملک، بی بی سی اردو ڈاٹ کام اسلام آباد، 6 مئی 2020ء۔ https://www.bbc.com/urdu/pakistan-52562569

"سنہ 1983ء میں جو گزٹ شائع ہوا تھا اس کے مطابق ملک بھر میں 32 ہزار زکوٰۃ کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں۔ مرکزی سطح پر بنائی گئی کونسل کے اخراجات وفاقی حکومت جبکہ صوبائی سطح پر بنائی گئی زکوٰۃ کونسل کے اخراجات صوبائی حکومتیں برداشت کرتی تھیں۔ زکوٰۃ کے مستحق افراد کے ناموں کی فہرست مؤکل کونسل تیار کرتی تھی، جبکہ زکوۃ کونسل کے ارکان پر مجموعی زکوٰۃ کا دو سے دس فیصد تک اخراجات کی مد میں خرچہ کیا جاتا تھا۔ جسٹس عمر عطا بندیال نے کہا کہ رپورٹ کے مطابق وفاق نے زکوٰۃ کی مد میں نو ارب روپے سے زیادہ جمع کیے، لیکن یہ رقم مستحقین تک کیسے جاتی ہے، اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ بینکوں سے جو رقم زکوٰۃ کی مد میں کاٹی جاتی اور مستحق افراد کو تقسیم کی جاتی تو ان خدمات کے عوض بینکوں کو کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا۔[1]"

زکوٰۃ کا یہ نظام تقریباً 30 سال تک ملک میں رائج رہا اور پھر سنہ 2010 میں 18 ویں آئینی ترمیم کے بعد یہ معاملہ صوبوں کو چلا گیا اور سنہ 1980 کا زکوٰۃ کا قانون ختم کر دیا گیا اگرچہ زکوٰۃ کی رقم جو بینکوں سے کاٹی جاتی ہے وہ رقم فیڈرل زکوٰۃ کونسل کے اکاؤنٹ میں ہی جاتی ہے تاہم وہاں سے یہ رقم آبادی کے تناسب سے صوبوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔

موجودہ قانون:

18 ویں آئینی ترمیم کے بعد زکوٰۃ کا محکمہ صوبوں کے پاس چلا گیا۔ جس کے مطابق آبادی کے لحاظ سے ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں زکوٰۃ اور عشر کونسل کا چیئرمین کوئی سرکاری ملازم یا ہائی کورٹ کا ریٹائرڈ جج ہوگا۔ عدالت عالیہ کے ریٹائرڈ جج کی عدم دستیابی کی صورت میں کوئی بھی شخص جس کی عمر 40 سال سے زیادہ ہے وہ اس کونسل کا چیئرمین بننے کا اہل ہے۔ صوبہ سندھ میں ہائی کورٹ کا ریٹائرڈ جج اس کونسل کا سربراہ ہوگا جس کی تعیناتی کا اختیار صوبائی حکومت کے پاس ہوگا۔[2] ضلعی سطح پر اس کونسل کا انتخاب صوبائی زکوٰۃ اور عشر کونسل کی منظوری سے ہوگا اور اس کونسل کے چیئرمین کا تعلق نجی شعبے سے ہوگا۔ جبکہ لوکل سطح پر کونسل کے ممبران کا انتخاب ضلعی کونسل کی سفارشات کی روشنی میں ہوگا۔

موجودہ نظام پر لوگوں کے خدشات:

زکوٰۃ کاٹنے کے موجودہ نظام پر پاکستان میں کئی لوگوں کو اعتماد نہیں ہے اور ایسے لوگوں کی اس ضمن میں یہ رائے ہے کہ ان کے کھاتوں سے زکوٰۃ کی مد میں کاٹی گئی رقم مستحقین کو نہیں ملتی۔ اہل تشیع اس بات پر متفق ہیں کہ زکوٰۃ صرف اسی کو کہتے ہیں کہ جو اپنے ہاتھ سے دی جائے۔ بینکوں کے کھاتوں سے نکالی گئی رقم کہاں خرچ کی گئی اس کے بارے میں کبھی بھی کھاتے داروں کو نہیں بتایا گیا۔ جس شخص پر زکوٰۃ واجب ہے اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خود مستحقین کا سراغ لگا کر اپنے ہاتھ سے زکوٰۃ ادا کرے۔ اگر قریبی رشتے داروں میں کوئی مستحق ہے تو اس کو زکواۃ کی ادائیگی سب سے بڑا ثواب ہے۔

---

[1] شہزاد ملک، بی بی سی اردو ڈاٹ کام۔ اسلام آباد، 6 مئی 2020ء۔ https://www.bbc.com/urdu/pakistan-52562569

[2] ایضاً

نجی بینک میں ملازمت کرنے والے افسر سہیل لطیف کا کہنا ہے کہ فقہ جعفریہ سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص کا جب سیونگز اکاؤنٹ کھولا جاتا ہے تو وہ بینک میں بیان حلفی بھی جمع کرواتے ہیں کہ بینک ان کی زکوٰۃ نہ کاٹے۔ بلکہ وہ خود ہی زکوٰۃ ادا کریں گے۔اُنھوں نے کہا کہ اس بیان حلفی کے بعد بینک ایسے شخص کے اکاؤنٹ سے زکوٰۃ کی رقم نہیں کاٹتا۔اُنھوں نے کہا کہ اب تو دیگر مسالک سے تعلق رکھنے والے افراد بھی بینکوں میں ایک بیان حلفی جمع کروادیتے ہیں کہ ان کے اکاؤنٹس سے بھی زکواۃ کی رقم نہ کاٹی جائے۔ مفتی تقی عثمانی نے سپریم کورٹ میں جمع کروائی گئی اپنی رائے میں کہا ہے کہ رمضان سے پہلے لوگوں کا بینکوں سے رقم نکلوانا اس نظام پر عدم اعتماد کا عکاس ہے۔ وفاق المدارس کے سیکرٹری جنرل محمد حنیف جالندھری کا کہنا ہے کہ حکومت کو زکوٰۃ کی کٹوتی کے معاملے پر نظرثانی کرنی چاہیے اور اس ضمن میں علماء سے مشاورت کرنی چاہیے۔اُنھوں نے کہا کہ اگر وزیراعظم ریاست مدینہ کی بات کرتے ہیں تو پھر سب سے پہلے زکوٰۃ کے نظام کو بہتر بتایا جائے اور اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے کہ زکوٰۃ کی رقم مستحقین تک پہنچائی جائے۔[1]

زکوۃ میں ریاست کے اختیارات/عمال حکومت کا دائرہ اختیار:

حضور پاک ﷺ جب کسی عامل کو زکوۃ لینے بھیجتے تو درمیانہ مال لینے کا حکم فرماتے نہ تو بہت اعلی ہو اور نہ ہی ادنی ہو۔اسی طرح ایک موقع پر جب ایک صحابی زکوۃ وصول کر کے لائے اور دو طرح کا مال پیش کیا کہ ایک تو مال زکوۃ ہے اور دوسرا مجھے ہدیہ ملا ہے۔ نبی پاک ﷺ کی طرف سے سخت سرزنش ہوئی کہ ماں باپ کے گھر بیٹھو پھر دیکھو لوگ کتنا ہدیہ دیتے ہیں اور اسے بھی رشوت کے زمرہ میں ڈال کر بیت المال کے سپرد کیا گیا۔

رعایا کے لیے اخذ زکوۃ کی حدود:

فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ اگر کوئی شخص عامل زکوۃ سے اپنے مال کو چھپالے اور زکوۃ ادا نہ کرے اور بعد میں معلوم ہو تو اس مال کی زکوۃ بھی لی جائے گی۔

> "حاکم مال زکوۃ کو چھپانے کے سبب کو دیکھے اگر اپنی کسی انفرادی مجبوری وعذر کی وجہ سے ایسا کیا تو اس کی فروگشت معاف سمجھی جائے اور بناعذر اس حرکت کا مرتکب ہو تو سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا اور حاکم وقت اس سے تعزیرا مال بھی لے گا، مزید سزا کی تعیین بھی کرے گا تاکہ مسلم معاشرہ میں یہ بات جڑ نہ پکڑے"[2]

اسی طرح ثعلبہ نے جب دور نبوی ﷺ میں محض اتنا سا لفظ بولا کہ یہ زکوۃ تو ٹیکس ہے تو نہ صرف تعزیراً نبی علیہ السلام نے منہ موڑ لیا بلکہ خلفاء راشدین نے بھی ان کے مال سے کچھ نہ لیا۔ جس کا باعث محض تعزیر تھی۔اس سے معلوم ہوا کہ ایسی قانون

---

[1] شہزاد ملک، بی بی سی اردو ڈاٹ کام اسلام آباد، 6 مئی 2020ء۔https://www.bbc.com/urdu/pakistan-52562569

[2] الماوردی، **الاحکام السلطانیہ**، من غل صدقۃ فان اخذھا وشطر مالہ ص 194۔

سازی کہ زکوۃ روکنے والوں کو تنبیہ ہو، یہ بھی اہل حکومت کے دائرہ عمل میں داخل ہے۔ منکرین زکوۃ کے لیے ریاست مدینہ دور صدیقی میں ارتداد اور ان سے اعلان جنگ، اسلامی تاریخ میں ارباب حکومت کے تنفیذ احکام الٰہی کے لیے ہر سطح پہ جد وجہد کی روشن مثال ہے۔

خلاصہ:

اس فصل میں ہم نے اقامت الصلٰوۃ اور نظام زکٰوۃ کے قیام کے بارے میں ریاستی ذمہ داریوں کو ذکر کیا ہے۔ یہ وہ بنیادی احکامات ہیں جو ایک اسلامی ریاست کے اساسی عناصر شمار ہوتے ہیں۔ ان کے قیام کے بغیر ریاست کا ڈھانچہ اسلامی اصولوں پر قائم نہیں رہ سکتا۔ نماز اسلامی حکامات میں سے پہلا حکم ہے اور اس کا درجہ اسلام میں ایسا ہے جیسے کہ جسم میں سر کا درجہ ہوتا ہے۔ نماز اسلام اور کفر میں فرق کرنے والی ہے۔ اس لیے ایک ریاست جو اسلام کے نام پر قائم ہو وہاں سب سے پہلی اور اہم چیز وہ اقامت الصلوٰۃ ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گے تو سب سے پہلا کام آپ ﷺ نے جو کیا وہ مسجد کی تعمیر ہے۔ آپ ﷺ نے قبا میں مسجد تعمیر کی پھر مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی، جسے ریاست مدینہ کا صدر دفتر بھی شمار کیا جاسکتا ہے کہ جہاں سے امور سلطلنت سرانجام دیے جاتے تھے۔ اس لیے ریاست پاکستان جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی ہے اس کی یہ پہلی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں نماز کے قیام کے لیے اقدامات کرئے، مساجد کے انتظامات کو بہتر کرئے، سرکاری اداروں میں اور پبلک مقامات میں لوگوں کو نماز کی ادائیگی کے لیے سہولیات فراہم کی جائیں۔ نماز کی طرح زکٰوۃ بھی اسلام کا اہم رکن ہے جس کی ادائیگی کے لیے نظام قائم کرنا ریاست کی اولین ذمہ داری ہے۔ زکٰوۃ کا حکم بھی قرآن پاک میں بہت تاکید کے ساتھ دیا گیا ہے۔ اگر کسی کو اللہ تعالٰی نے مال سے نوازا ہے تو اس کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس مال میں سے ضرورت مندوں، فقیروں اور مسکینوں کو بھی دے اور اس دینے پر اللہ تعالٰی سے اجر کی امید رکھے۔ احسان یا بدلے کا متمنی نہ ہو۔ ریاست اس کا اہتمام کرے کے مال داروں سے زکٰوۃ وصول کر کے ناداروں میں تقسیم کرئے۔ زکٰوۃ کی وصولی اور ادائیگی کے لیے عمال مقرر کرے اور زکٰوۃ نہ دینے والوں کے ساتھ خلفاء راشدین کے دور کو سامنے رکھ کر معاملہ کرئے۔

فصل دوم: روزہ اور حج کے معاملات

روزہ کے مسائل میں ریاست کے اختیارات وحدود

روزہ فارسی زبان کا لفظ ہے اور عربی میں اسے صوم کہا جاتا ہے، صوم کا لغوی معنی بیان کرتے ہوئے علامہ احمد بن فارس مقاییس اللغۃ میں فرماتے ہیں:

"صَوْمُ الصَّادُ وَالْوَاو وَالْمِيْمُ أَصْلٌ يَدُلُّ عَلَى إِمْسَاكٍ مِّنْ ذَلِكَ صَوْمُ الصَّائِمِ، هُوَ إِمْسَاكُهُ عَنْ مَطْعَمِهِ وَمَشْرَبِهِ وَسَائِرِ مَا مَنَعَهُ. وَيَكُوْنُ الْإِمْسَاكُ عَنِ الْكَلَامِ صَوْماً، قَالُوْا فِيْ قَوْلِهِ تُعَالَى "إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَنِ صَوْماً[1]"، إِنَّهُ الْإِمْسَاكُ عَنِ الْكَلَامِ وَالصُّمْتُ[2]"

صوم صاد، واواور میم، رکنے پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی سے روزے دار کا روزہ ہے۔ اور وہ یعنی روزے کا معنیٰ کھانے پینے اور ہر وہ چیز جس سے منع کیا گیا ہے اس سے رکنا ہے۔ اسی طرح بولنے سے رکنے کو بھی صوم کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: بے شک میں نے رحمن کیلئے روزہ رکھا ہے۔ یعنی کہ کلام اور بات کرنے سے رکنے اور خاموش رہنے کا روزہ رکھا ہے۔

اصحاب معجم اللغۃ العربیہ فرماتے ہیں: "الصَّوْم الْإِمْسَاك عَن أَي فعل أَو قَول كَانَ"[3] یعنی صوم کا معنی کسی بھی قول یا فعل سے رکنے کے ہیں۔ علامہ بدرالدین عینی ھدایہ کی شرح بنایہ میں فرماتے ہیں: "وَالصَّوْمُ فِي اللُّغَةِ عِبَارَةٌ عَنِ الإِمْسَاكِ أَيْ إِمْسَاكٌ كَانَ۔"[4] اور لغت میں روزے سے مراد رکنا ہے، خواہ کسی طرح کا رکنا ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی مطلقاً رکنے کو روزہ کہا جاتا ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب اس کے معنی یوں بیان کرتے ہیں: "صوم کے لفظی معنی امساک یعنی رکنے اور بچنے کے ہیں[7]" اور علامہ غلام رسول سعیدی تبیان القرآن میں فرماتے ہیں: "روزہ کا لغوی معنی ہے کسی چیز سے رکنا اور اس کو ترک کرنا[9]"۔

روزہ کا اصطلاحی معنی:

اصطلاح شرع میں روزے سے مراد کسی مخصوص شئ سے مخصوص صفت کے ساتھ کسی مخصوص شخص کی جانب سے ایک مخصوص زمانہ میں اور مخصوص شرائط کے ساتھ رک جانے کو صوم یا روزہ کہا جاتا ہے۔

---

[1] مریم:26

[2] ابی الحسین، احمد بن فارس بن زکریا، **مقاییس اللغۃ**، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، 1989ء (323/3)

[3] ابراہیم انیس، **المعجم الوسیط**، مجمع اللغۃ العربیۃ، مکتبہ الشروق الدولیۃ، طبع 4، 2004ء، (529/1)

[4] العینی، بدرالدین، محمود بن احمد، **البنایۃ شرح الھدایۃ**، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، طبع اولی: 2000ء (3/4)

[7] مفتی محمد شفیع صاحب، **معارف القرآن**، (مکتبہ معارف القرآن کراچی، طبع: اپریل 2008)، 442/1

[9] غلام رسول سعیدی، **تبیان القرآن**، (فرید بک سٹال اردو بازار لاہور، الطبع الثالث: جون 1999)، 667/1

علامہ عبداللہ بن محمود الحنفی روزہ کا شرعی معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَفِي الشَّرْعِ: عِبَارَةٌ عَنْ إِمْسَاكٍ مَخْصُوصٍ، وَهُوَ الْإِمْسَاكُ عَنِ الْمُفْطِرَاتِ الثَّلَاثِ بِصِفَةٍ مَخْصُوصَةٍ، وَهُوَ قَصْدُ التَّقَرُّبِ مِنْ شَخْصٍ مَخْصُوصٍ وَهُوَ الْمُسْلِمُ، بِصِفَةٍ مَخْصُوصَةٍ وَهِيَ الطَّهَارَةُ عَنِ الْحَيْضِ وَالنِّفَاسِ فِي زَمَانٍ مَخْصُوصٍ، وَهُوَ بَيَاضُ النَّهَارِ مِنْ طُلُوعِ الْفَجْرِ الثَّانِي إِلَى غُرُوبِ الشَّمْسِ-"[1] اور شرع میں روزہ مخصوص رک جانے سے عبارت ہے اور مخصوص رک جانے سے مراد ایسی تین چیزوں سے رک جانا ہے جن کی وجہ سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں: کھانا، پینا اور جماع۔ مخصوص صفات کے ساتھ۔ اور وہ یہ ہیں کہ کسی مخصوص مسلمان شخص کا قرب الٰہی حاصل کرنے کا قصد و ارادہ کرنا۔ اور مخصوص صفت سے مراد مخصوص دنوں میں عورتوں کا حیض و نفاس سے پاک ہونا ہے۔ اور مخصوص زمانے سے صبح صادق سے لیکر غروب آفتاب تک کی روشنی مراد ہے۔

علامہ بدرالدین عینی اس کی یوں تعریف فرماتے ہیں:

"وَفِيْ الشَّرْعِ الصَّوْمُ هُوَ الإِمْسَاكُ عَنِ الْمُفْطِرَاتِ الثَّلاثَةِ نَهَاراً مَعَ النِّيَّةِ-"[2]

اور شرع میں روزے سے مراد دن میں تین مفطرات سے رکنا ہے نیت کے ساتھ۔

ابو بکر بن علی الحنفی فرماتے ہیں:

"وَفِي الشَّرْعِ عِبَارَةٌ عَنْ إِمْسَاكٍ مَخْصُوصٍ وَهُوَ الْكَفُّ عَنْ قَضَاءِ الشَّهْوَتَيْنِ شَهْوَةِ الْبَطْنِ وَشَهْوَةِ الْفَرْجِ مِنْ شَخْصٍ مَخْصُوصٍ وَهُوَ أَنْ يَكُونَ طَاهِرًا مِنَ الْحَيْضِ وَالنِّفَاسِ فِي وَقْتٍ مَخْصُوصٍ وَهُوَ مَا بَعْدَ طُلُوعِ الْفَجْرِ إِلَى الْغُرُوبِ بِصِفَةٍ مَخْصُوصَةٍ وَهِيَ أَنْ تَكُونَ عَلَى قَصْدِ التَّقَرُّبِ-"[3]

اور اصطلاح شرع میں روزہ مخصوص رکنے سے عبارت ہے اور وہ دو شہوات سے، شہوتِ بطن اور مخصوص شخص کی شہوتِ فرج سے رکنا ہے اور خاص وقت میں حیض و نفاس سے پاک ہونا ہے اور صبح صادق سے طلوع آفتاب تک مخصوص صفت کے ساتھ رکنا ہے اور قرب الٰہی کا ارادہ کرنا ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی روزے کا شرعی معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مکلف اور بالغ شخص کا ثواب کی نیت سے طلوع فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک کھانے، پینے اور جماع کو ترک کرنا اور اپنے نفس کو تقویٰ کے حصول کے لیے تیار کرنا۔"[4]

---

[1] الموصلی، عبداللہ بن محمود، **الاختیار لتعلیل المختار**، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، 1937ء (125/1)

[2] العینی، بدرالدین، **البنایۃ شرح الھدایۃ** (3/4)

[3] الزبیدی، الحداد، ابو بکر بن علی، **الجوھرۃ النیرۃ علی مختصر القدوری**، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، طبع اولی: 2006ء (136/1)

[4] غلام رسول سعیدی، **تبیان القرآن**، (فرید بک سٹال اردو بازار لاہور، الطبع الثالث: جون 1999ء) 667/1

درج بالا تعریفات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ روزہ کا معنی لغت میں مطلقاً رکنا ہے۔ خواہ وہ کسی بھی چیز سے رکا جائے۔ اصطلاح شرع میں روزہ کے صحیح ہونے کے لئے چند چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

پہلی چیز اسلام کا ہونا۔ اس لئے کہ روزہ تو باقی لوگ بھی رکھ سکتے ہیں، لیکن باقیوں کا روزہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ صرف مسلمان کا روزہ ہی قابل قبول ہے۔

دوسری چیز قرب الٰہی کے حصول کی نیت کرنا یعنی جس کسی شخص نے کھانے پینے اور جماع سے اپنے آپ کو روکے رکھا ہے اس سے غرض حکم الٰہی کو پورا کرنا اور اللہ رب العزت کی رضا ہو۔

تیسری چیز کھانے پینے اور جماع وغیرہ سے مخصوص وقت کے اندر رکنا ہے، لیکن اگر کسی نے بھولے سے کچھ کھا پی لیا تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

چوتھی چیز وقت کا مخصوص ہونا یعنی صبح صادق سے لیکر طلوع آفتاب تک کھانے پینے اور جماع سے رکنے کا نام روزہ ہے۔

روزہ کی قسمیں:

روزہ کی مختلف اقسام ہیں مثلاً فرض روزہ، واجب روزہ، مستحب روزہ، نفلی روزہ، مکروہ روزہ، حرام روزہ۔

فرض روزہ رمضان کا روزہ ہے اور اس کی قضاء لازمی ہے۔ اور کفارے کے روزے فرض روزوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ جبکہ نذر وغیرہ کے روزے واجب ہوتے ہیں۔ نواور دس محرم کے روزے یعنی عاشوراء کے روزے مسنون ہیں۔ ایام بیض وغیرہ کے روزہ رکھنا مستحب ہے اور صرف دس محرم کا روزہ رکھنا بغیر نو محرم کے روزے کو ساتھ ملائے مکروہ تنزیہی ہے اور عیدین کا روزہ رکھنا حرام ہے۔

اسی بات کو علامہ زین الدین بن ابراہیم المصری نے اپنی کتاب البحر الرائق شرح کنز الدقائق میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے:

"وَأَقْسَامُهُ فَرْضٌ وَوَاجِبٌ وَمَسْنُونٌ وَمَنْدُوبٌ وَنَفْلٌ وَمَكْرُوهٌ تَنْزِيهًا وَتَحْرِيمًا فَالْأَوَّلُ رَمَضَانُ وَقَضَاؤُهُ وَالْكَفَّارَاتُ وَالْوَاجِبُ الْمَنْذُورُ وَالْمَسْنُونُ عَاشُورَاءُ مَعَ التَّاسِعِ، وَالْمَنْدُوبُ صَوْمُ ثَلَاثَةٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ وَيَنْدُبُ فِيهَا كَوْنُهَا الْأَيَّامَ الْبِيضَ وَكُلُّ صَوْمٍ ثَبَتَ بِالسُّنَّةِ طَلَبُهُ وَالْوَعْدُ عَلَيْهِ كَصَوْمِ دَاوُد – عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ – وَعَلَى سَائِرِ الْأَنْبِيَاءِ وَالنَّفَلُ مَا سِوَى ذَلِكَ مِمَّا لَمْ يَثْبُتْ كَرَاهَتُهُ وَالْمَكْرُوهُ تَنْزِيهًا عَاشُورَاءُ مُفْرَدًا عَنْ التَّاسِعِ، وَنَحْوُ يَوْمِ الْمِهْرَجَانِ وَتَحْرِيمًا أَيَّامُ التَّشْرِيقِ وَالْعِيدَيْنِ-"[1]

اس کی اقسام فرض، واجب، مسنون، مستحب، نفل اور مکروہ تنزیہی اور تحریمی ہیں۔ پہلا رمضان ہے۔ اس کی قضا اور کفارہ کے روزے ہیں اور نذر کے واجب ہیں۔ عاشورہ اور نو تاریخ کے مسنون ہیں۔ ہر ماہ میں تین روزے مستحب ہیں اور ان کا ایام بیض

---

[1] النسفی، عبداللہ بن احمد، **البحر الرائق شرح کنز الدقائق ومنحۃ الخالق وتکملۃ الطوري**، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، 277/2

میں ہونا مندوب ہے۔ ہر وہ روزہ جو سنت سے مطلوب ہو اور اس پر اجر کا وعدہ ہو جیسا کہ داود عالیہ السلام السلام کے اور تمام انبیاء علیہم السلام کے روزے۔ اور اس کے علاوہ جن کی کراہت ثابت نہیں ہے مکروہ ہیں۔ نو تاریخ کے سوا صرف عاشورہ کا روزہ رکھنا مکروہ تنزیہی ہے۔ اسی طرح مہرجان کے دن کا روزہ اور ایام تشریق اور عیدین کا روزہ حرام ہے۔

علامہ ابو بکر حنفی نے اس کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے چنانچہ فرمایا: "الصَّوْمُ ثَلَاثَةُ أَضْرُبٍ صَوْمٌ مُسْتَحَقُّ الْعَيْنِ كَصَوْمِ رَمَضَانَ وَالنَّذْرِ الْمُعَيَّنِ وَصَوْمٌ فِي الذِّمَّةِ كَالنُّذُورِ الْمُطْلَقَةِ وَالْكَفَّارَاتِ وَقَضَاءِ رَمَضَانَ وَصَوْمٌ هُوَ نَفْل[1]"

روزہ کی تین اقسام ہیں: صوم مستحق العین جیسا کی رمضان اور معین نذر وغیرہ کا روزہ، اور صوم فی الذمہ: جیسے مطلق نذر کا روزہ اور کفارات کے روزے اور رمضان کے روزوں کی قضاء وغیرہ، اور نفلی روزے۔

روزہ کی مشروعیت:

روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو صرف اسی امت کے لئے ہی ضروری نہیں ہے بلکہ یہ پہلی امتوں میں بھی رائج تھی اور ان لوگوں پر بھی روزے ایسے ہی فرض تھے جیسے ہمارے اوپر فرض ہیں۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ[2]﴾ اے ایمان والو تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلی امتوں پر فرض کیے گئے تھے۔

روزے کا حکم اور پاکستانی ریاست:

روزہ رکھنا دین کا ایک ایجابی تقاضا اور ایک شرعی امر ہے۔ اسلامی حکومت جو ہر معروف کا حکم دے سکتی ہے، روزے کے معروف کا بھی حکم دے گی۔ وہ پہلے نصیحت اور ترغیب کے انداز میں مسلمانوں کو اس معروف کی تلقین کرے گی اور اگر لوگ اُس کی اس اخلاقی تبلیغ ہی سے روزے کی پابندی کر لیں گے تو وہ قانون کو حرکت میں نہیں لائے گی۔ لیکن جو لوگ اُس کی اس نصیحت اور تلقین پر عمل نہیں کریں گے اور رمضان المبارک میں سر عام روزہ خوری کریں گے تو اسلامی حکومت اُن کو قانون کی طاقت سے روزہ رکھنے پر مجبور کرے گی اور بعض حالات میں مناسب سزا بھی دے گی۔

خلیفۂ وقت روزے کے شرعی حکم سمیت اللہ تعالیٰ کے تمام منصوص احکام و مسائل کو طاقت کے زور سے نافذ کر سکتا ہے۔ چنانچہ امین احسن اصلاحی اپنی کتاب اسلامی ریاست میں لکھتے ہیں:

> "حضور ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے جو قبائل مرتد ہو گئے تھے ان میں ایک گروہ اُن لوگوں کا بھی تھا جو کہتے تھے کہ ہم نماز تو پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں ادا کریں گے۔ حضرت ابو بکرؓ نے اُن کو بزورِ شمشیر ادائیگی زکوٰۃ پر مجبور

---

[1] الزبیدی، ابو بکر بن علی، **الجوهرة النيرة على مختصر القدوري**، دار لکتب العلمیۃ، بیروت طبعۃ الاولی: 2006ء 136/1

[2] البقرۃ: 183

کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ معاملہ اُن کے نزدیک شریعت کے اُن واضح اور منصوص مسائل میں سے تھا جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس وجہ سے اس میں اُنہوں نے شوریٰ سے مشورہ حاصل کرنے کا اپنے کو پابند نہیں سمجھا، بلکہ روزہ، نماز، حدود، تعزیرات اور اس قسم کے دوسرے مسائل کی طرح اس میں بحیثیت خلیفہ کے اپنی ذمہ داری خدا کے قانون کی تنفیذ سمجھی۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کے مطابق یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر یہ اسلامی بیت المال کو زکوٰۃ ادا نہ کریں تو ان کو طاقت کے زور سے اطاعت پر مجبور کیا جائے۔"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ پاکستانی ریاست مسلمانوں کو نہ صرف روزہ رکھنے کا حکم دے سکتی ہے بلکہ وہ شریعت کے تمام واضح اور منصوص اوامر و مسائل، جن میں نماز، زکوٰۃ، حج، قربانی اور جہاد وغیرہ شامل ہیں، کے نفاذ کے لیے قانون کی طاقت استعمال کر سکتی ہے۔

---

[1] اصلاحی، امین احسن، **اسلامی ریاست**، ((طبع ۲۰۰۶ء دار التذکیر، لاہور)، ص 40

حج کے مسائل میں ریاست کے اختیارات وحدود

شعائر اسلام میں سے بنیادی رکن جسے اسلامی شان وشوکت کا مظہر سمجھا جاتا ہے اور کامل طاعت وسپردگی سے بھرپور عشق وفریفتگی کی ایک یکتا داستان، جسے ایک اسلامی عبادت حج کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ کہتے تو اسے قصد وارادہ ہیں لیکن حقیقت اس کی بس رب تعالیٰ کے پانے کی جستجو ہے۔ جس طرح ہر عبادات کی ایک راہ اور طریقہ متعین ہے اسی طرح حج کے بھی فرائض، واجبات، سنن اور پورا طریقہ وضع کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد جب پہلے سال مسلمانوں کو حج کے لیے بھیجا تو ایک اصطلاح امیرِ حج کے نام سے مقرر کی گئی۔ اس سال حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالی عنہ کو امیرِ حج مقرر کیا گیا اور انہی کی اقتداء میں حج کی ادئیگی کا فریضہ سرانجام پایا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کے امیرِ حج کا تقرر خود صاحب شرع ﷺ کی طرف سے کیا گیا۔ اسی امیر کے ذریعے حج کے سبھی انتظامات کروائے گئے، جس میں خطبہ حج جیسی اہم عبادت بھی شامل ہے۔ پھر آئندہ سال آپ ﷺ جب خود حج کے لیے تشریف لے گئے تو امیر حج کی حیثیت خود آپ ﷺ کو حاصل رہی۔ نیز حج کا یہ موقع اسلامی قبائل کے آپس میں ملنے اور اسلامی حکومتوں کو اصلاحات بہتری اور نفیس کردار ادا کرنے کے لیے مرکزی حثیت فراہم کرتا رہا اور اسی موقع پر حکمِ حاکم کی اصطلاح بھی وضع کی گئی۔ اس فصل میں حج کے امور میں ریاست کی ذمہ داریوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

حج کا لغوی معنی:

لغت میں حج سے مراد کسی چیز کا قصد وارادہ کرنا، غالب آنا وغیرہ کے ہیں۔ ابن عابدین رد المختار کے اندر حج کے لغوی معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "هُوَ الْقَصْدُ إِلَى مُعَظَّمٍ لَا مُطْلَقُ الْقَصْدِ كَمَا ظَنَّهُ بَعْضُهُمْ۔"[1] یعنی حَج حاء کے زبر اور حِج حاء کی زیر دونوں طریقوں سے پڑھا جاتا ہے جیسے سورۃ البقرہ میں ہے: ﴿الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ[2]﴾ اور سورۃ آل عمران میں حاء کی زیر کے ساتھ استعمال ہوا ہے، جیسے: ﴿وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا[3]﴾ اور اس کے لغوی معنی ہیں عظمت والی جگہ کا ارادہ کرنا، نہ کہ مطلق ارادہ کرنے کو حج کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔

عمر بن محمد نجم الدین النسفی حج کا لغوی معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"الْحَجُّ بِفَتْحِ الْحَاءِ وَكَسْرِهَا لُغَتَانِ وَهُوَ الْقَصْدُ وَهُوَ مِنْ بَابِ دَخَلَ وَقِيلَ هُوَ الزِّيَارَةُ وَقِيلَ هُوَ إِطَالَةُ الِاخْتِلَافِ إِلَى الشَّيْءِ وَقِيلَ هُوَ الْعَوْدُ إِلَى الشَّيْءِ مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ[4]۔"

---

[1] ابن عابدین، **الدر المختار وحاشیۃ ابن عابدین (رد المحتار)** 454/2

[2] البقرۃ: 197

[3] آل عمران: 97

[4] النسفی، عمر بن محمد، **طلبۃ الطلبۃ فی الاصطلاحات الفقہیۃ**، مکتبہ المثنیٰ بغداد، 1311ھ ص: 27

حج حاء کی فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور اس کا معنی ہے ارادہ کرنا اور حج دخل باب سے ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی زیارت کرنے کے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنی کسی چیز میں بہت زیادہ اختلاف کرنے کے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی کسی چیز کی طرف بار بار لوٹ کر آنے کے ہیں۔

حج کی شرعی تعریف:

حج کی شرعی تعریف یوں کی جاتی ہے: "زَيَارَةُ مَكَانٍ مَخْصُوْصٍ فِيْ زَمَنٍ مَخْصُوْصٍ بِفِعْلِ الْمَخْصُوْصِ" یعنی مخصوص جگہ یعنی مکہ مکرمہ اور عرفہ کی زیارت کرنا یعنی طواف اور وقوف کرنا، مخصوص زمانے میں یعنی ایام حج میں۔ بفعل مخصوص یعنی حج کے ارادے سے احرام باندھنا اور افعال حج ادا کرنا۔

علامہ ابن العابدین اس کی تعریف یوں فرماتے ہیں:

"(زِيَارَةُ) أَيْ طَوَافٌ وَوُقُوفٌ (مَكَان مَخْصُوصٍ) أَيْ الْكَعْبَةِ وَعَرَفَةَ (فِي زَمَنٍ مَخْصُوصٍ) فِي الطَّوَافِ مِنْ فَجْرِ النَّحْرِ إلَى آخِرِ الْعُمُرِ وَفِي الْوُقُوفِ مِنْ زَوَالِ شَمْسِ عَرَفَةَ لِفَجْرِ النَّحْرِ (بِفِعْلٍ مَخْصُوصٍ) بِأَنْ يَكُونَ مُحْرِمًا بِنِيَّةِ الْحَجِّ سَابِقًا كَمَا سَيَجِيءُ لَمْ يَقُلْ لِأَدَاءِ رُكْنٍ مِنْ أَرْكَانِ الدِّينِ لِيَعُمَّ حَجَّ النَّفْلِ.[1]-"زیارت کرنا ہے۔ یعنی طواف اور وقوف، مخصوص جگہ کی۔ یعنی کعبہ کی اور عرفات کی۔ مخصوص وقت میں (اور وہ وقت) طواف کے لیے یوم النحر کی فجر سے آخری عمر تک ہے اور وقوف کے لیے عرفہ کے دن زوال شمس سے لیکر یوم النحر کی فجر تک ہے۔ مخصوص عمل کے ساتھ وہ اس طرح کہ پہلے حج کی نیت سے احرام باندھے جیسا کہ آگے آئے گا، اسے دین کے ارکان میں سے کسی ایک رکن کو ادا کرنے کے لیے نہیں کہا گیا تاکہ نفلی حج عام رہے۔

علامہ عبداللہ بن محمود حنفی اس کی شرعی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "قَصْدُ مَوْضِعٍ مَخْصُوصٍ، وَهُوَ الْبَيْتُ بِصِفَةٍ مَخْصُوصَةٍ فِي وَقْتٍ مَخْصُوصٍ بِشَرَائِطَ مَخْصُوصَةٍ[2]" خاص جگہ کا ارادہ کرنا اور وہ خاص جگہ بیت اللہ شریف ہے۔ خاص صفات کے ساتھ۔ خاص اوقات میں اور مخصوص شرائط کے سات۔

درج بالا تعریفات کو مد نظر رکھتے ہوئے حق کی اصلاحی تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ نو (9) ذوالحجہ کو زوال آفتاب کے بعد سے دس (10) ذوالحجہ کی فجر تک حج کی نیت سے احرام باندھے ہوئے میدان عرفات میں وقوف کرنا اور دس ذوالحجہ سے آخر عمر تک کسی وقت بھی کعبہ کا طواف زیارت کرنا حج ہے۔ حج کی تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ وقوف عرفات اور کعبہ کے طواف زیارت کا قصد کرنا حج ہے۔

---

[1] الدر المختار وحاشیۃ ابن عابدین (رد المحتار) 454/2

[2] الموصلی، عبداللہ بن محمود، الاختیار لتعلیل المختار 139/1

حج کی مشروعیت:

حج قرآن وسنت سے ثابت اور یہ ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے۔حج ہر عاقل و بالغ صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک دفعہ ادا کرنا فرض ہے۔ چنانچہ فرمان باری تعالی ہے:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِين[1]﴾اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا فرض ہے جو اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہے اور جو انکار کرے تو اللہ سارے جہاں سے بے پرواہ ہے۔

اور حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ ارشاد گرامی ہے:((قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "بُنِيَ الإِسْلَامُ علَى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وأَنَّ مُحَمَّدًا رَسولُ اللَّهِ، وإِقَامِ الصَّلَاةِ، وإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، والحَجِّ، وصَوْمِ رَمَضَانَ.[2]))

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس چیز کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

اور امام طبرانی رحمہ اللہ مسند الشامیین میں حضرت ابوامامہ کے حوالے سے حدیث نقل کرتے ہیں:

((عَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ: كُنْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمْ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ، فَخَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ فِي مَوْعِظَتِهِ:"أَلَا لَعَلَّكُمْ لَا تَرَوْنِي بَعْدَ عَامِكُمْ هَذَا "ثَلَاثَ مَرَّاتٍ" فَقَامَ رَجُلٌ طَوِيلٌ أَشْعَثُ كَأَنَّهُ مِنْ رِجَالِ شَنُوءَةَ، فَقَالَ:فَمَا الَّذِي نَفْعَلُ يَا رَسُولَ اللهِ؟ فَقَالَ:"اعْبُدُوا رَبَّكُمْ، وَصَلُّوا خَمْسَكُمْ، وَصُومُوا شَهْرَكُمْ، وَأَدُّوا زَكَاةَ أَمْوَالِكُمْ طَيِّبَةً بِهَا أَنْفُسُكُمْ تَدْخُلُوا جَنَّةَ رَبِّكُمْ-[3]))کہ انہوں نے فرمایا: "میں حج الواع کے موقع پر آپ ﷺ کے ساتھ تھا تو ایک موقع پر آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا: سن لو اے لوگو! ہو سکتا ہے کہ اس سال کے بعد آپ مجھے نہ دیکھ پاؤ، تو ایک لمبا چوڑا آدمی کھڑا ہوا اور اس نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے رب کی عبادت کرو، پانچ وقت کی نماز پڑھو، رمضان کے مہینے کے روزے رکھو اور اپنے پاک مال سے خوشی سے زکوۃ ادا کرو اور اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ"۔

اور اسی طرح ترمذی شریف کی ایک روایت ہے:

((قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ إِلَى بَيْتِ اللَّهِ وَلَمْ يَحُجَّ ، فَلَا عَلَيْهِ أَنْ يَمُوتَ يَهُودِيًّا، أَوْ نَصْرَانِيًّا، وَذَلِكَ أَنَّ اللَّهَ يَقُولُ فِي كِتَابِهِ: وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا -[4]))

---

[1] آل عمران:97

[2] بخاری، **صحیح البخاري، کتاب الایمان، باب دعاکم ایمانکم**،11/1ح:8

[3] الطبرانی، سلیمان بن احمد، **مسند الشامیین**،401/2رقم الحدیث:1581(علامہ ناصر الدین البانی نے اس حدیث کو سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ میں ذکر کیا ہے)

[4] ترمذی، **سنن الترمذي**،168/2رقم الحدیث:812

حضرت علی رضی اللہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس حج کے سفر کا سامان ہو اور وہ حج نہ کرے تو وہ یہودی مرے یا نصرانی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہی مراد ہے اس آیت سے: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيهِ سَبِيلًا۔[1]﴾

ان آیات اور احادیث سے معلوم ہوا کہ حج ہر صاحب استطاعت پر فرض ہے اور جو باوجود استطاعت کے حج نہ کرے اور حج کا انکار کرے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ عبداللہ بن محمود فرماتے ہیں: "وَهُوَ فَرِيضَةٌ مُحْكَمَةٌ يَكْفُرُ جَاحِدُهَا[2]" یعنی حج فرض اور اس کا منکر کافر ہے۔

حج کی شرائط:

حج کے صحیح ہونے کیلئے چند شرائط کا ہونا ضروری ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

1. مسلمان ہونا۔ اس لیے کہ کافر عبادات اسلام کرنے کے اہل نہیں ہیں۔

2. آزاد ہونا، غلام کا حج نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابن عباس مرفوعا روایت کرتے ہیں: ((أَيُّمَا صَبِيٍّ حَجَّ ثُمَّ بَلَغَ الْحِنْثَ فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرَى، وَأَيُّمَا أَعْرَابِيٍّ حَجَّ ثُمَّ هَاجَرَ فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرَى، وَأَيُّمَا عَبْدٍ حَجَّ ثُمَّ أُعْتِقَ فَعَلَيْهِ حَجَّةٌ أُخْرَى[3]))

جو بچہ بچپن میں حج کرے اور وہ بالغ ہو جائے تو اس پر دوسرا حج فرض ہے، اور جو اعرابی حج کرے اور پھر ہجرت کرے تو اس پر بھی دوسرا حج ہے اور جو غلام حالت غلامی میں حج کرے پھر آزاد کر دیا جائے تو اس پر پھر حج فرض ہے۔

3. مکلف ہو، پاگل یا بچے کا حج صحیح نہیں ہو گا۔

4. صحیح البدن ہونا۔ یعنی بدن کا تندرست ہونا۔

5. بصیر ہونا۔ یعنی بینا ہونا نابینا شخص کا حج صحیح نہیں ہو گا۔

6. اس کے پاس حج کے لئے جانے سفر حج تک قیام کرنے، حج سے واپس آنے اور اس دوران جن کے خرچ کا وہ ذمہ دار ہے ان سب کا خرچ ہو۔ نیز اس کے پاس سواری ہو یا سواری کا خرچ ہو اور راستہ مامون ہو۔

7. عورت کے ساتھ خاوند یا عاقل و بالغ محرم کا ہونا۔

---

[1] ال عمران: 97

[2] الموصلی، عبداللہ بن محمود، **الاختیار لتعلیل المختار** 139/1

[3] البیھقی، احمد بن الحسین، **السنن الکبری**، 291/5 رقم الحدیث: 9849۔ (یہ حدیث موقوف ہے، البتہ یزید بن زریع نے شعبہ (وہ ثقہ ہے) سے مرفوع نقل کیا ہے اور اس کو بیھقی کے علاوہ طبرانی نے معجم الاوسط میں، ضیاء نے احادیثِ مختارہ میں ذکر کیا ہے۔)

عبداللہ بن محمود حنفی فرماتے ہیں:

"وَهُوَ فَرِيضَةُ الْعُمْرِ، وَلَا يَجِبُ إِلَّا مَرَّةً وَاحِدَةً عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ حُرٍّ عَاقِلٍ بَالِغٍ صَحِيحٍ قَادِرٍ عَلَى الزَّادِ وَالرَّاحِلَةِ، وَنَفَقَةِ ذَهَابِهِ وَإِيَابِهِ فَاضِلًا عَنْ حَوَائِجِهِ الْأَصْلِيَّةِ وَنَفَقَةِ عِيَالِهِ إِلَى حِينِ يَعُودُ وَيَكُونُ الطَّرِيقُ أَمْنًا، وَلَا تَحُجُّ الْمَرْأَةُ إِلَّا بِزَوْجٍ أَوْ مَحْرَمٍ إِذَا كَانَ سَفَرًا[1]."اور وہ زندگی میں ایک دفعہ ہر آزاد، عاقل، بالغ، صحیح البدن، زاد سفر پر قادر، مسلمان پر فرض ہے۔اور جس کے پاس جانے اور آنے کا سامان ہو۔اپنی حاجتوں کے علاوہ اپنے اہل وعیال کے لیے واپس آنے تک کا سامان ہو، راستہ پرامن ہو اور عورت بغیر خاند یا محرم کے حج نہیں کر سکتی۔

میقاتیں:

مواقیت میقات کی جمع ہے۔جس سے مراد ہے حج کی جہتیں۔یعنی وہ جگہیں جہاں سے آگے حاجی بغیر احرام کے نہیں جا سکتے۔ایسی جگہیں پانچ ہیں۔علامہ عبداللہ بن محمود حنفی فرماتے ہیں:

"وَالْمَوَاقِيتُ: لِلْعِرَاقِيِّينَ ذَاتُ عِرْقٍ، وَلِلشَّامِيِّينَ الْجُحْفَةُ، وَلِلْمَدَنِيِّينَ ذُو الْحُلَيْفَةِ، وَلِلنَّجْدِيِّينَ قَرْنٌ، وَلِلْيَمَنِيِّينَ يَلَمْلَمُ[2]-"

عراق سے آنے والوں کی میقات ذات عرق ہے۔شام سے آنے والوں کی میقات جحفہ، مدینہ سے آنے والوں کی میقات ذو الحلیفہ، نجد سے آنے والوں کی میقات قرن اور یمن سے آنے والوں کی میقات یلملم ہے۔

حج کی تین قسمیں ہیں: حج قرام، حج تمتع، حج افراد۔

قران (ق کی زیر کے ساتھ) کے لغوی معنی ہیں دو چیزوں کو باہم ملا دینا۔دو چیزوں کو اکٹھا کرنا۔علامہ احمد بن فارس فرماتے ہیں:"(قرن) القَافُ وَالرَّاءُ وَالنُونُ أَصْلَانِ صَحِيْحَانِ، أَحَدُهُمَا يَدُلُّ عَلى جَمْعِ شَيءٍ إِلَى شَيءٍ، وَالآخَرُ شَيءٍ يَتَأَّ بِقُوةٍ وَشِدَّةٍ[3]."(قرن) قاف، رااور نون دو مستند اصل ہیں۔ان میں سے ایک کسی چیز کو جمع کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہے، دوسری وہ چیز ہے جو طاقت اور شدت کے ساتھ نکلتی ہے۔

حج قران کے شرعی معنی:

قران کے شرعی معنی ہیں عمرہ اور حج دونوں کی نیت سے احرام باندھنا اور ایک ہی احرام کے ساتھ پہلے عمرہ ادا کرنا اور پھر حج ادا کرنا۔دونوں کے درمیان میں احرام نہ کھولنا۔حج قران کرنے والے کو قارن کہا جاتا ہے۔

---

[1] الموصلی، عبداللہ بن محمود، **الاختیار لتعلیل المختار** 141/1

[2] ایضاً: 141/1

[3] الرازی، احمد بن فارس، **مقاییس اللغۃ**، دار الفکر، 1399ھ، 76/5

علامہ عبداللہ بن محمود فرماتے ہیں "وَهُوَ الْجَمْعُ بَيْنَ الْعُمْرَةِ وَالْحَجِّ بِإِحْرَامٍ وَاحِدٍ فِي سَفْرَةٍ وَاحِدَةٍ[1]."اور حج قران سے مراد حج اور عمرہ کو ایک ہی احرام کے ساتھ ایک ہی سفر میں ادا کرنا ہے۔

حج تمتع:

تمتع کے لغوی معنی ہیں نفع اٹھانا۔علامہ احمد بن فارس فرماتے ہیں:"(متع) الْمِيْمُ وَالتَّاءُ وَالْعَيْنُ أَصْلٌ صَحِيْحٌ يَدُلُّ عَلَى مَنْفِعَةٍ وَامْتَدَادِ مُدَّةٍ فِي خَيْرٍ. مِنْهُ اسْتَمْتَعَتْ بِالشَّيءِ[2]." متع میم اور تا اور عین سے اصل صحیح کے ساتھ ہے جو دلالت کرتا ہے منفعت پر اور خیر کی مدد میں اضافہ ہے اور اسی سے ہے کسی چیز سے فائدہ اٹھانا۔

حج تمتع کے شرعی معنی:

شریعت کی اصطلاح میں تمتع اس حج کو کہا جاتا ہے جس میں حج کرنے والا میقات سے پہلے عمرہ کی نیت سے احرام باندھے اور مناسک عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام کھول دے اور پھر اسی سال حج کے دنوں میں حج کی نیت سے دوبارہ احرام باندھے اور مناسک حج ادا کرے۔حج تمتع ادا کرنے والے کو متمتع کہا جاتا ہے۔

عبداللہ بن محمود حج تمتع کی تعریف یوں فرماتے ہیں:

"وَهُوَ الْجَمْعُ بَيْنَ أَفْعَالِ الْعُمْرَةِ وَالْحَجِّ فِي أَشْهُرِ الْحَجِّ فِي سَنَةٍ وَاحِدَةٍ بِإِحْرَامَيْنِ بِتَقْدِيمِ أَفْعَالِ الْعُمْرَةِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُلِمَّ بِأَهْلِهِ إِلْمَامًا صَحِيحًا، حَتَّى لَوْ أَحْرَمَ قَبْلَ أَشْهُرِ الْحَجِّ وَأَتَى بِأَفْعَالِ الْعُمْرَةِ فِي أَشْهُرِ الْحَجِّ كَانَ مَتَمَتِّعًا، وَلَوْ طَافَ طَوَافَ الْعُمْرَةِ قَبْلَ أَشْهُرِ الْحَجِّ أَوْ أَكْثَرَهُ لَمْ يَكُنْ مُتَمَتِّعًا، وَالْإِلْمَامُ الصَّحِيحُ أَنْ يَعُودَ إِلَى أَهْلِهِ بَعْدَ أَفْعَالِ الْعُمْرَةِ حَلَالًا[3]."حج تمتع سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی سال میں حج اور عمرہ کو حج کے مہینوں میں جمع کرنا دو احراموں کے ساتھ۔ایسے کہ پہلے عمرہ کے افعال کو پورا کرے اور اپنے گھر والوں سے ملنے سے پہلے حج کا احرام باندھ کر حج کے افعال ادا کرے اور اگر اس نے حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھ لیا اور حج کے مہینے میں عمرہ ادا کیا تو بھی ایسے شخص کو متمتع ہی کہا جائے گا۔اگر اس نے حج کے مہینے سے پہلے عمرہ کا طواف کر لیا تو اس کو متمتع نہیں کہا جائے گا اور درست بات یہ ہے کہ حلال ہونے کے بعد اپنے گھر چلا جائے۔

---

[1] الموصلی، عبداللہ بن محمود، **الاختیار لتعلیل المختار** 160/1

[2] ابی الحسین، احمد بن فارس، **مقاییس اللغۃ** 293/5

[3] الموصلی، عبداللہ بن محمود، **الاختیار لتعلیل المختار** 158/1

حج افراد:

اِفراد کے لغوی معنی ہیں اکیلا اور تنہا۔ علامہ احمد بن فارس فرماتے ہیں: (فرد) الفاء والراء والدال أصل صحيح يدل على وحدة. من ذلك الفرد وهو الوتر. والفارد والفرد: الثور المنفرد[1]. (فرد) فاء اور راء اور دال اس کی صحیح اصل ہے جو وحدت پر دلالت کرتی ہے۔ اسی سے فرد ہے اور وہ وتر ہے۔ اور فادر اور فرد یعنی منفرد بیل۔

حج اِفراد کے شرعی معنی:

اسلامی اصطلاح میں حج افراد سے مراد ایسا حج ہے جس میں حاجی صرف حج کی نیت سے احرام باندھے اور حج کے مناسک ادا کرے اور عمرہ کو ساتھ نہ ملائے۔ حج افراد کے ادا کرنے والے کو مفرِد کہا جاتا ہے۔

حج کا حکم اور اسلامی ریاست:

حج بھی دین کا ایک ایجابی تقاضا اور شرعی امر ہے۔ اسلامی حکومت اپنے عمال سمیت تمام صاحبِ استطاعت لوگوں کو حج کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ یہ معاملہ بھی پہلے تعلیم و ترغیب اور وعظ و نصیحت سے شروع ہو گا اور جو لوگ استطاعت کے باوجود حج کرنے میں کوتاہی کریں گے، اسلامی ریاست اُن کو اس فریضے کی ادائیگی کے لیے قانون کی طاقت استعمال کرے گی۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں اس کی نظیر موجود ہے۔ چنانچہ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کا قول ہے:

"لَوْ تَرَكَ النَّاسُ الْحَجَّ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلَيْهِ كَمَا نُقَاتِلُهُمْ عَلَى الصَّلَاةِ وَالزَّكَوٰةِ۔"[2] اگر لوگ (استطاعت کے باوجود) حج کرنا چھوڑ دیں تو میں ان سے جنگ کروں گا جیسے ہم نماز اور زکوۃ چھوڑنے والوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ اسی طرح امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کا یہ قول بھی ہے: "لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَبْعَثَ رِجَالًا إِلى هَذِهِ الأَمْصَارُ، فَلْيَنْظُرُوْا كُلَّ مَنْ كَانَ لَهُ جدَة وَلَمْ يَحُجَّ فَيَضْرِبُوْا عَلَيْهِمْ الْجِزْيَةَ مَا هُمْ بِمُسْلِمِيْنَ مَا هُمْ بِمُسْلِمِيْنَ."[3] میں چاہتا ہوں کہ تمام شہروں اور علاقوں میں کچھ آدمی بھیجوں جو ان لوگوں کا پتہ چلائیں جو استطاعت کے باوجود حج نہیں کرتے، تاکہ وہ ان پر جزیہ عائد کریں؛ کیونکہ ایسے لوگ مسلمان نہیں ہیں۔ ایسے لوگ مسلمان نہیں ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی ریاست صاحبِ استطاعت مسلمانوں کو حج کرنے کے لیے قانونی طاقت بھی استعمال کر سکتی ہے۔

---

[1] ابی الحسین، احمد بن فارس، **مقاییس اللغۃ** 500/4

[2] سیوطی، جلال الدین، **درِّ منثور**: دراسات العربیہ والاسلامیہ، قاہرہ، 2003ء 393/2

[3] فتح القدیر: ۲۔ ۲، **ابن کثیر**: 85/2، کنز العمال، رقم الحدیث: 12400

باب سوم: تعلیمی امور میں اسلامی احکام کی تنفیذ

فصل اول: اختلاف رائے کے احترام سے متعلق معاملات

فصل دوم: مخلوط تعلیم

فصل ثالث: غیر نصابی سرگرمیاں

فصل اول: اختلاف رائے کے احترام سے متعلق معاملات

فصل اول: اختلاف رائے کے احترام سے متعلق معاملات

انسانی معاشرے میں اختلاف کا پایا جانا ایک فطری عمل ہے جس سے کسی بھی صورت بچنا ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ[1]۔﴾ اور وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔ اگر کائنات میں غور و فکر کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو دوسرے سے مختلف بنایا ہے۔ اسی طرح انسانوں کے کھانوں میں، لباس میں، سوچ میں، رنگ و نسل اور زبانوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِلْعَالِمِينَ[2]﴾ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ بے شک اس میں جہان والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

تمام انسان ایک آدم کی اولاد ہیں اور عموماً اولاد کا رنگ و زبان اپنے والد کی جیسی ہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم کوئی سانچا تیار کرتے ہیں اور اس سانچے سے ایک ہی قسم کی چیز تیار کرتے ہیں، لیکن اللہ کی قدرت کی کار گری ہے کہ ایک ہی سانچے سے تیار شدہ مخلوق کے اندر کتنا اختلاف رکھ دیا۔

جب کائنات کی ہر چیز کے اندر اختلاف ہے اور انسان بھی رنگ، زبان، سوچ و فکر کے لحاظ سے مختلف ہیں تو اس کا لازماً نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک گھر، بستی، معاشرہ، ملک و قوم کے اندر بھی اختلاف پایا جائے گا، لیکن اختلاف کرنے کی چند حدود ہیں، ضوابط ہیں جن کے اوپر عمل کرنا ضروری ہے اور اگر نہ کیا جائے تو اختلافات جنگ و جدل میں بدل جاتے ہیں۔ ہم اس فصل میں انہی پر بات کریں گئے۔

اختلافِ رائے:

اختلافِ رائے دو الفاظ کا مرکب ہے۔ ایک اختلاف اور دوسرا رائے۔ سب سے پہلے ان دونوں الفاظ کی وضاحت کی جائے گی۔

---

[1] ہود: 118

[2] الروم: 22

اختلاف کا لغوی معنٰی:

لفظ اختلاف کا مادہ (خ،ل،ف) ہے جس کے معانی: خلاف ہونا، فرق، تفاوت[1]، ناموافقت کرنا عداوت، بگاڑ، دشمنی ضد، تغیر و تبدل کے آتے ہیں۔[2] احمد بن فارس القزوینی فرماتے ہیں:

(خَلَفَ) الْخَاءُ وَالْلَامُ وَالْفَاءُ أُصُوْلٌ ثَلَاثَةٌ: أَحَدُهَا أَن يَّجِيْءَ شَيءٍ بَعْدَ شَيْءٍ يَقُوْمُ مَقَامَهُ، وَالثَّانِيْ خِلَافُ قُدَامٍ، وَالثَّالِثُ التَّغَيُرُ[3]- (خلف) خاءلام اور فاء تین اصول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی چیز کے بعد کوئی چیز آتی ہے جو اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ دوسرا آگے کا اختلاف ہے اور تیسری تبدیلی ہے۔

اختلاف کا اصطلاحی معنٰی:

امام راغب الاصفہانی اختلاف کا معنٰی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَالِاخْتِلَافُ وَالْمُخَالَفَةُ: أَن يَّأْخُذَ كُلَّ وَاحِدٍ طَرِيْقًا غَيْرَ طَرِيْقِ الآخَرَ فِي حَالِهِ أَوْ قَوْلِهِ، وَالخِلَافُ أَعمّ مِّنَ الضِّدِّ، لِأَنَّ كُلّ ضِدَّيْنِ مُخْتَلِفَانِ، وَلَيْسَ كُلُّ مُخْتَلِفِيْنَ ضِدَّيْنِ، وَلَمَّا كَانَ الْاِخْتِلَافُ بَيْنَ النَّاسِ فِيْ الْقَوْلِ قَدْ يَقْتَضِي التَّنَازع اسْتُعِيْرَ ذَلِكَ لِلْمَنَازِعَةِ وَالْمَجَادَلَةِ[4]-"اختلاف اور رمخالفت: کہ ہر ایک اپنی حالت یا قول میں دوسرے کے راستے کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کرتا ہے۔ اور خلاف اپنی ضد سے عام ہے اس لیے کہ ہر ضد دوسری سے مختلف ہے اور ہر دو مختلف ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔ چونکہ لوگوں کے کہنے میں فرق ہے، جو تنازعہ کا تقاضہ کرتا ہے۔ یہ ادھار لیا گیا ہے تنازع اور جھگڑے کے لیے۔

علامہ جرجانی فرماتے ہیں: "مَنَازِعَةٌ تَجْرِيْ بَيْنَ الْمُتَعَارِضَيْنِ لِتَحْقِيْقِ حَقٍّ أَوْ لِإِبْطَالِ بَاطِلٍ[5]" یعنی اختلاف وہ آویزش ہے جو فریقین کے درمیان اثباتِ حق اور ابطالِ باطل کے لئے ہو۔

---

[1] **فروز اللغات**، (فروز سنز لاہور)، ص52

[2] انظر: مولوی سید احمد دھلوی، **فرھنگ آصفیہ**، (مطبع رفاع عامہ پریس لاہور، 1326ھ، 1908ء)، 45/1

[3] القزوینی، احمد بن فارس، **مقاییس اللغۃ**، 210/2

[4] راغب الاصفہانی، **المفردات في غريب القرآن**، (دار القلم بیروت)، ص294

[5] الجرجانی، علی بن محمد، **التعریفات** (دار الکتب العلمیہ، بیروت لبنان، 1403ھ، 1983ء)، ص101

علامہ طہ جابر فیاض العلوانی فرماتے ہیں: کسی کے احوال یا اس کی باتوں سے کوئی الگ راستہ اختیار کرنے کو اختلاف اور مخالفت کہتے ہیں[1]۔ چنانچہ اختلاف کا معنی ہوا: "أَنْ يَّذْهَبَ كُلُّ وَاحِدٍ إِلَى خِلَافِ مَّا ذَهَبَ إِلَيْهِ الآخَرَ "یعنی ہر ایک کا رائے کے اعتبار سے دوسرے کے برعکس ہونا۔

رائے کا لغوی معنی:

رائے کا مادہ (ر،ء،ی) ہے جس کے معانی: دیکھنا، سوچنا، خیال کرنا، دانست، عقل، تجویز، فہم، دانائی، خیال، مشورہ کے آتے ہیں، لہذا رائے یعنی نظریہ ہے[2]۔

رائے کا اصطلاحی مفہوم:

امام راغب اصفہانی رائے کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "وَالرَّأي: اعْتِقَادُ النَّفْسِ أَحَدُ النَّقِيْضَيْنِ عَنْ غَلَبِ الظَّنِّ[3]" دو مختلف چیزوں میں سے ایک کے اوپر ظن غالب کے ساتھ اعتقاد رکھنا۔

ابن قیم الجوزی فرماتے ہیں: "مَا يَرَاهُ الْقَلْبُ بَعْدَ فِكْرٍ وَتَأَمُّلٍ وَطِب لِمَعْرِفَة وَجْهِ الصَّوَابِ مِمَّا تَتَعَارَضَ فِيْه الأَمَارَاتُ"[44] دو مخالف چیزوں میں صحیح کو جاننے کی خاطر غور و فکر کے بعد جس پر دل مطمئن ہو۔

علامہ الباجی فرماتے ہیں: "إِدْرَاكُ صَوَابُ حُكْمٍ لَمْ يَنُصَّ عَلَيْهِ[45]" جس حکم کے بارے میں نص نہ آئی ہو اس میں صحیح کو پہچاننا رائے کہلاتا ہے۔

اختلافِ رائے کا مفہوم:

علامہ عبد الفتاح ابو غدہ فرماتے ہیں: "هُوَ صَوَابُ الْحُكْمِ وَرُجْحَانِهِ فِيْمَا لَمْ يَنُصَّ عَلَيْهِ[46]" ایسی چیزیں جن میں نص نہ وارد ہوئی ہو ان میں صحیح کی پہچان کرنا اور حکم لگانا اختلافِ رائے کہلاتا ہے۔

---

[1] العلوانی، طہ جابر، **اسلام میں اختلاف کے اصول و آداب** (مکتبہ الکتاب اردو بازار لاہور)، ص 23

[2] مولوی سید احمد دھلوی، **فرہنگ آصفیہ**، 449/2

[3] راغب الاصفہانی، حسین بن محمد، **المفردات في غريب القرآن**، دار القلم، دمشق، طبع اولی: 1412ھ، ص: 374

[44] ابن القیم الجوزیہ، محمد بن ابی بکر، **إعلام الموقعين**، دار الکتب العلمیہ، بیروت، طبع اولی: 1411ھ۔ 124/2

[45] الباجي، ابو الولید، **المنهاج في ترتيب الحجاج**، دار الغرب الاسلامی، لبنان، طبع اولی: 2001ء، 13/1

[46] محمد عوامہ، **أدب الخلاف في مسائل العلم والدين**، دار البشائر الاسلامیہ، بیروت، طبع دوم: 1997ء، 15/1

ادارہ دائرۃ معارفِ اسلامیہ میں اختلافِ رائے کی حقیقت کو یوں واضح کیا گیا ہے: اختلافِ رائے کا تفاوت اجماع کے مقابلے میں بولا جاتا ہے اور اس سے مراد علماءِ شرح واصول کی آراء کا وہ اختلاف ہے جو فقہی احکام وکلیات کی عملی تفصیلات میں ہو اور اس کی ضد میں ہو۔ خصوصاً اول الذکر (یعنی فقہی معاملات) میں اس اختلاف سے مراد مذاہبِ اربعہ کا باہمی اختلاف ہے نیز وہ اختلاف ہے جو خود کسی مذہب کے اندر پایا جاتا ہے۔

وقوعِ اختلاف:

انسانی دنیا میں اختلاف کا پایا جانا ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے کسی طور بھی بچا نہیں جا سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق میں ایک سنت بھی ہے، چنانچہ لوگ اپنے رنگ وزبان، طبیعت وادراک، معارف وعقول اور شکل وصورت میں باہم مختلف ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ، إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ[1]﴾ اگر اللہ چاہتا تو لوگوں کو ایک امت بنا دیتا اور لوگ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گئے مگر جس پر آپ کا رب رحم فرمادے اور اسی کے لئے اس نے انہیں پیدا کیا۔

امام رازیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہاں اختلاف سے مراد لوگوں کا دین واخلاق اور افعال میں اختلاف ہے۔[2] اسی طرح مختلف امور ومسائل میں آراء کا مختلف ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ مختلف وجوہ کی بنا پر آراء کا مختلف ہونا آپ ﷺ کی موجودگی اور اس کے بعد صحابہ کرام علیہم السلام، تابعین اور ائمہ اکرامؒ میں موجود رہا ہے۔ مشاورت کا عمل بھی اسی بات کا عکاس ہے کہ مختلف آراء کو سن کر کسی ایک بات پر پہنچا جائے۔ اختلاف وقیاس جیسے اہم امور میں بھی اختلافِ رائے کی وجہ سے مختلف نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ اختلافِ رائے کا یہ معاملہ اگر مثبت انداز میں ہو تو قابلِ تحسین ہے اور آسانی کا باعث بنتا ہے اور اگر منفی انداز میں ہو تو بہت سی مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ اسی بات کو علامہ سید ابوالاعلی مودودیؒ نے اس طرح واضح فرمایا:

> "قرآن اس صحت بخش اختلاف رائے کا مخالف نہیں ہے جو دین میں متفق اور اسلامی نظام جماعت میں متحد رہتے ہوئے محض احکام وقوانین کی تعبیر میں مخلصانہ تحقیق کی بنا پر کیا جائے بلکہ وہ مذمت اس اختلاف کی کرتا ہے جو نفسانیت اور کج نگاہی سے شروع ہو اور فرقہ بندی اور نزاعِ باہمی تک پہنچا دے۔ یہ دونوں قسم کے اختلافات نہ اپنی حقیقت میں یکساں ہیں اور نہ اپنے نتائج میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں کہ دونوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دیا جائے۔ پہلی قسم کا اختلاف تو ترقی کی جان اور زندگی کی روح ہے۔ وہ ہر اس سوسائٹی

---

[1] ھود: 118، 119

[2] الرازی، فخر الدین، **مفاتیح الغیب**، (دار احیاء التراث العربی بیروت، طبۃ الثالثۃ، 1420ھ)، 410/18

میں پایا جائے گا جو عقل و فکر رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہو، اس کا پایا جانا زندگی کی علامت ہے۔ رہا دوسری قسم کا اختلاف تو دنیا جانتی ہے کہ اس نے جس گروہ میں بھی سر اٹھایا اس کو پراگندہ کر کے چھوڑا۔ اس کا رونما ہونا صحت کی نہیں بلکہ مرض کی علامت ہے۔ اس کے نتائج بھی کسی امت کے حق میں مفید نہیں ہو سکتے۔"[1]

اختلاف کی انواع واقسام:

اختلاف کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1۔ اختلافِ مذموم 2۔ اختلافِ ممدوح 3۔ اختلافِ جائز۔

1۔ اختلافِ مذموم:

اختلافِ مذموم سے مراد ایسا اختلاف ہے جو قرآن، سنتِ رسول ﷺ، اجماعِ امت اور قیاس کے خلاف ہو، چہ جائیکہ وہ اعتقادی مسائل میں ہو یا عملی مسائل میں ہو۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ[2]﴾ اور انہوں نے تفرقہ نہ ڈالا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آگیا، آپس کی زد کی وجہ سے۔

یعنی اگر واضح دلائل اور معرفت کے بعد بھی کوئی اختلاف کرتا ہے تو وہی اختلافِ مذموم ہے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا[3]﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو وصیت کی کہ وہ اتحاد کا درس دیں اور فرقہ واریت اور اختلافات سے منع فرمایا ہے۔

اختلافِ مذموم کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے بعض بعض سے زیادہ قابلِ مذمت ہیں، ذیل میں چند صورتیں مختصراً بیان کی جاتی ہیں۔

1-مومن اور کافر کا اختلاف:

مومن اور کافر کا اختلاف انتہائی مذموم اختلاف ہے کیوں کہ جب اللہ کی طرف سے حق آگیا اور اس کے تمام متعلقات کو قرآن نے واضح کر دیا تو اب مزید کسی اختلاف کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ ہر انسان کو اس پر یقین کر کے اس کو ماننا چاہیے۔

---

[1]۔ مودودی، سید ابوالاعلی، **مقدمہ تفہیم القرآن**، (ادارہ ترجمان القرآن لاہور)، 38/1

[2] الشوری: 14

[3] الشوری: 13

2۔مسلمانوں کا باہمی اختلافات:

مسلمانوں کے درمیان اللہ کی واحدانیت اور آپ ﷺ کو خاتم النبیین ماننے کے بعد مختلف وجوہات کی بناپر جو اختلافات ہوئے اور ہو رہے ہیں وہ بھی اختلافِ مذموم کے زمرے میں آتے ہیں۔ جیسے مختلف فرقوں خوارج، شیعہ، معتزلہ، قدریہ وغیرہ کے باہمی اختلافات۔

3۔اہل سنت کا آپس میں اختلاف:

اہل سنت کا آپس میں تقلید اور عدم تقلید کی بنیاد پر فروعی مسائل میں جو اختلاف آج کل اپنے عروج پر ہے اور اس کے وجہ سے ایک دوسرے پر کفر اور فسق کے فتوے بھی لگائے جارہے ہیں۔

2۔اختلافِ ممدوح:

ممدوح یا محمود وہ اختلاف ہے جس میں اھلِ کتاب، مشرکین، فاسقین اور بے ادبوں کی واہیات و حالات اور ان کے تیواروں اور تقریبات کی مخالفت کرنا ہے۔ ایسی اور اس جیسی مخالفت قابل تعریف ہے اور شریعت میں ممدوح اور محمود ہی نہیں بلکہ شریعت کا مقصود بھی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے بہت سے معاملات میں یہود و نصاریٰ کی مخالفت کا حکم دیا ہے اور ان کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ[1]))جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے اٹھایا جائے گا۔

یہاں مشابہت سے مراد ہر قسم کی مشابہت ہے، خواہ وہ لباس میں ہو، اعتقادات میں ہو یا تقریبات میں ہو۔ اس حدیث میں غیر مسلموں کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے جس کا مفہومِ مخالف یہ ہوتا ہے کہ ان کی مشابہت نہ اختیار کرو بلکہ ان کی مخالفت کرو۔ اسی طرح یہود کی مخالفت میں آپ ﷺ نے محرم الحرام کی نویں اور دسویں دونوں تاریخوں کا روزہ رکھنا پسند فرمایا۔ چنانچہ فرمایا:

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ،ذُكِرَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ عَاشُورَاءُ وَقِيلَ إِنَّهُ يَوْمٌ تَصُومُهُ الْيَهُودُ، وَتُعَظِّمُهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ: إِنْ عِشْنَا

---

[1] أبوداود، **سنن ابی داؤد**، 44/4، رقم الحدیث: 4031

خَالَفْنَاهُمْ , وَصُمْنَا الْيَوْمَ التَّاسِعَ، قَالَ: وَقُبِضَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ ذَلِكَ [1]"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ عاشوراء کے دن کی تعظیم کی وجہ سے یہودی اس دن روزہ رکھتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر ہم اگلے سال زندہ رہے تو ان کی مخالفت میں نویں تاریخ کا روزہ بھی رکھیں گئے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: لیکن آپ ﷺ اگلے سال تک حیات نہ رہ سکے۔

ان احادیث اور ان جیسی دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور دیگر گمراہ گروہوں کی مخالفت کرنا اسلام میں محمود سمجھا گیا ہے۔

3۔ اختلافِ جائز:

جائز اختلاف اجتہادی مسائل میں مجتہدین یعنی فقہاء و مفتیان کرام اور حکام کا اختلاف ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ((إِذَا حَكَمَ الحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ[2]))حاکم جب اپنے اجتہاد سے درست فیصلہ کردے تو اسے دوہرا اجر ہے اور اگر فیصلہ میں چوک ہو جائے تو اسے اکہرا اجر ہے۔[3]

اختلافِ مقبول و جائز کے فوائد:

جائز اختلاف کے بہت سے فوائد ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

1۔ احتمالات کا بڑھ جانا:

نیتیں صحیح ہوں تو ان سارے احتمالات کے جاننے کا موقع ملتا ہے جن میں کسی بھی رخ سے دلیل دینا ممکن ہو۔

2۔ ایسے اختلافات سے دینی ریاضت اور تبادلہ خیال کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور مختلف عقلیں جو مفروضات قائم کر سکتی ہیں ان پر غور و فکر کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

3۔ متعدد حل سامنے آجاتے ہیں جن سے درپیش مسئلہ میں اس دینِ فطرت کے مناسب حل کی طرف رہنمائی ہوتی ہے[4]۔

---

[1] الشجري، يحيى بن حسين، **الأمالي**، دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، طبع اولى: 2001ء، 112/2، رقم الحديث: 1787

[2] بخاری، الجامع الصحیح، 108/9 رقم الحدیث: 7352.

[3] ڈاکٹر صالح بن عبداللہ حمید، **ادب الخلاف**، 1/10-23۔ والعلوانی، طہ جابر فیاض، **اختلاف کے اصول و آداب** 1/203–204

[4] والعلوانی، طہ جابر فیاض، **اختلاف کے اصول و آداب** 26/1

مذکورہ بالا فوائد اسی صورت میں ممکن ہیں جب اختلاف اپنے ان آداب و حدود کے دائرے میں رہے جن کی رعایت ہر حال میں ضروری ہے۔ اگر وہ اپنی حدود سے تجاوز کرے اور ان کا لحاظ نہ کیا جائے تو وہ جدال و شقاق میں تبدیل ہو جاتا ہے جس سے منفی اور برے نتائج سامنے آتے ہیں اور امت میں ایک نیا انتشار اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ اختلاف تعمیر کے بجائے تخریب کا سبب بن جاتا ہے۔

اختلاف کے اسباب:

اسباب اختلاف کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اسباب اختلاف مذموم، اسباب اختلاف ممدوح و جائز۔

اسباب اختلاف مذموم:

اختلافِ مذموم کے بہت سے اسباب ہیں جن میں سے بعض کو ذکر کیا جاتا ہے۔

1۔ لالچ:

اختلاف مذموم کا سب سے پہلا سبب ہے لالچ۔ انسان فطرتاً لالچی ہے۔ کسی کو شہرت کی لالچ ہے، کسی کو عزت کی لالچ ہے، کسی کو مال و دولت کی لالچ ہے، اور کسی کو جنت کی لالچ ہے۔ ہر انسان لالچی ہے، لیکن لالچ اگر اچھی چیزوں میں ہو تو کوئی حرج نہیں اور اگر بری چیزوں میں ہو تو یہ ایک بری صفت ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ، حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ[1]﴾ تمہیں حصولِ کثرت کی خواہش نے غفلت میں رکھا، یہاں تک کہ تم نے قبروں کی زیارت کر لی۔ یعنی انسان مرتے دم تک لالچی ہی رہتا ہے اور زیادتی کا طالب ہوتا ہے اور اسی زیادتی کے چکر میں وہ صحیح و غلط، جائز و ناجائز کا فرق بھی بھول جاتا ہے۔

2۔ ضد اور حد سے نکل جانا:

انسان بسا اوقات اپنی اوقات بھول جاتا ہے۔ اپنی حد پار کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ نافرمان ہو جاتا ہے۔ حق و سچ والوں سے اختلافات شروع کر دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی ہے، اس کا جسم ہے، وہ جو مرضی کرے کوئی اس کو روکنے ٹوکنے کا حق نہیں رکھتا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ[2]﴾ واضح دلائل کے آجانے کے بعد بھی وہ صرف آپس میں ضد کی وجہ سے اختلاف کرتے ہیں۔

---

[1] التکاثر: 1، 2

[2] البقرۃ: 213

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((وَإِنَّ اللهَ أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا حَتَّى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ، وَلَا يَبْغِي أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ[1])) کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی کی کہ تم تواضع اختیار کرو یہاں تک کہ کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور کسی سے ضد نہ کرے۔

اسی طرح ایک روایت میں ہے:

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ أَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الجَرَّاحِ إِلَى البَحْرَيْنِ يَأْتِي بِجِزْيَتِهَا، وَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ صَالَحَ أَهْلَ البَحْرَيْنِ، وَأَمَّرَ عَلَيْهِمُ العَلاَءَ بْنَ الحَضْرَمِيِّ، فَقَدِمَ أَبُو عُبَيْدَةَ بِمَالٍ مِنَ البَحْرَيْنِ، فَسَمِعَتِ الأَنْصَارُ بِقُدُومِ أَبِي عُبَيْدَةَ، فَوَافَتْ صَلاَةَ الصُّبْحِ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا صَلَّى بِهِمُ الفَجْرَ انْصَرَفَ، فَتَعَرَّضُوا لَهُ، فَتَبَسَّمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ رَآهُمْ، وَقَالَ:أَظُنُّكُمْ قَدْ سَمِعْتُمْ أَنَّ أَبَا عُبَيْدَةَ قَدْ جَاءَ بِشَيْءٍ؟، قَالُوا: أَجَلْ يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ:فَأَبْشِرُوا وَأَمِّلُوا مَا يَسُرُّكُمْ، فَوَاللَّهِ لاَ الفَقْرَ أَخْشَى عَلَيْكُمْ، وَلَكِنْ أَخْشَى عَلَيْكُمْ أَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلَى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، فَتَنَافَسُوهَا كَمَا تَنَافَسُوهَا وَتُهْلِكَكُمْ كَمَا أَهْلَكَتْهُمْ[2]))

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو بحرین بھیجا کہ وہ ان کا جزیہ لے آئیں۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحرین کے لوگوں کے لیے نیک تمنائیں رکھتے تھے۔اور علاء بن الحضرمی کو ان پر امیر مقرر کیا۔ چنانچہ ابو عبیدہ بحرین سے مال لے کر آئے۔ پس انصار کو جب ابو عبیدہ کی آمد کی خبر ہوئی، انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی۔ جب آپ ﷺ نے ان کے ساتھ نماز فجر ادا کر کے لوٹے تو وہ آپ کے سامنے آ گئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انھیں دیکھا تو مسکرائے اور فرمایا: "میرا خیال ہے تم نے سنا ہے کہ ابو عبیدہ کچھ لائے ہیں؟" انہوں نے کہا: ہاں یا رسول اللہ! فرمایا: "پھر خوشی مناؤ اور اس چیز کی امید رکھو جو تمہیں خوش کرے۔ خدا کی قسم مجھے تم پر غربت کا خوف نہیں ہے بلکہ مجھے تمہارے لئے اس بات کا خوف ہے کہ دنیا تمہارے لئے پھیلا دی جائے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں کے لیے کشادہ کر دی گئی تھی۔ پس تم اس میں حرص کرنے لگو جیسا کہ انھوں نے کیا اور وہ تمہیں اسی طرح تباہ کر دیے جس طرح اس نے انہیں تباہ کیا۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ مال و دولت کی فراوانی اور اس کی محبت آدمی کے اندر حرص و طمع اور فخر و غرور پیدا کر دیتی ہے اور وہ حد سے تجاوز کرنے لگتا ہے اور تکبر میں مبتلا ہو کر ناجائز اختلافات کو ہوا دینے لگتا ہے۔

---

[1] مسلم، الجامع الصحیح، 2198/4، ح:64-(2865)

[2] بخاري، الجامع الصحیح، 96/4، ح:3158.

3۔جہالت وکم علمی:

اختلاف مذموم میں سے ایک سبب جہالت اور کم علمی بھی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ کسی بارے میں علم نہ ہونے یا کم علمی کی وجہ سے ایک دوسرے سے اختلافات رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے دست و گریباں ہوتے ہیں، جبکہ وہی بات جب علماء اور صاحب علم لوگوں کی مجالس میں رکھی جاتی ہے تو اس میں کوئی اختاف نہیں ہوتا اور قیامت کی نشانیوں میں سے بھی ایک نشانی علماء کا اٹھ جانا ہے اور جہالت کا عام ہو جانا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے قیامت کی نشانیاں بتاتے ہوئے فرمایا:

((إِنَّ اللَّهَ لاَ يَنْزِعُ العِلْمَ بَعْدَ أَنْ أَعْطَاكُمُوهُ انْتِزَاعًا، وَلَكِنْ يَنْتَزِعُهُ مِنْهُمْ مَعَ قَبْضِ العُلَمَاءِ بِعِلْمِهِمْ، فَيَبْقَى نَاسٌ جُهَّالٌ، يُسْتَفْتَوْنَ فَيُفْتُونَ بِرَأْيِهِمْ، فَيُضِلُّونَ وَيَضِلُّونَ[1])) اللہ تعالی تمھیں علم دینے کے بعد تم سے اسے چھینے گا نہیں، مگر وہ ان سے چھینے گا علماء کو ان کے علم کے ساتھ قبض کر کے۔ پس جاہل لوگ باقی رہ جاہیں گے۔ لوگ ان سے فتوے طلب کریں گے اور وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے، پس وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور اوروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

4۔اہل بدعت کا ظاہر ہونا اور لوگوں کو اپنی بدعت کی طرف دعوت دینا:

اسباب اختلاف میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ اہل بدعت مختلف مقاصد کی بناپر لوگوں کو اپنی بدعت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور لوگ ان کی باتوں سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور جو لوگ حق پر ہوتے ہیں ان کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں۔

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((كَانَ النَّاسُ يَسْأَلُونَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الخَيْرِ، وَكُنْتُ أَسْأَلُهُ عَنِ الشَّرِّ مَخَافَةَ أَنْ يُدْرِكَنِي، فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّا كُنَّا فِي جَاهِلِيَّةٍ وَشَرٍّ، فَجَاءَنَا اللَّهُ بِهَذَا الخَيْرِ، فَهَلْ بَعْدَ هَذَا الخَيْرِ مِنْ شَرٍّ؟ قَالَ: «نَعَمْ» ----[2])) لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر اور بھلائی کے بارے میں پوچھتے تھے اور میں برائی کے بارے میں پوچھا کرتا تھا تاکہ میں اس سے بچ سکوں۔ چنانچہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ہم جاہلیت میں تھے اور برائیوں میں تھے پھر آپ اللہ تعالی سے ہمارے پاس اس خیر کو لے کر آئے۔ یہ خیر عطا فرمائی تو کیا اب اس خیر کے بعد بھی شر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، میں نے کہا: کیا اس شر کے بعد پھر خیر ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں الخ۔

امام نوویؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] بخاري، الجامع الصحيح، 100/9، ح:7307

[2] ایضاً، 199/4، ح:3606

"دَعَاة عَلَى أَبْوَابِ جَهَنَّمَ مَنْ أَجَابَهُمْ إِلَيْهَا قَذَفُوْهُ فِيْهَا" قَالَ الْعُلَمَاءُ هَؤُلَاءِ مَنْ كَانَ مِنَ الْأُمَرَاءِ يَدْعُوْا إِلَى بِدْعَةٍ أَوْ ضَلَالٍ آخَرَ كَالْخَوَارِجِ وَالْقَرَامَطَةِ وَأَصْحَابِ الْمِحْنَةِ[1]۔"پکارنے والے جہنم کے دراوازوں پر ہوں گے اور جو کوئی ان کی پکار پر لبیک کہے گا وہ اس کو اس میں پھینک دیں گے۔اور علماء نے کہا کہ یہ وہ امراء ہوں گے جو بدعت اور گمراہی کی طرف بلاتے تھے جیسے خواج اور قرامطہ اور اصحاب محنہ۔

آج کل کے زمانے میں مستشرقین اور اعداء اسلام اس حدیث کے زمرے میں آتے ہیں۔

5۔تعصب:

اختلاف کے اسباب میں سے ایک اہم سبب تعصب بھی ہے اور یہ سبب آج کل بہت زیادہ پایا جاتا ہے،، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کے لوگ آج مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔یہ گروہ بندی دینی و مسلکی بنیادوں پر ہو یا سیاسی بنیادوں پر لوگ اپنے مخالفین سے شدید اختلاف رکھتے ہیں اور اکثر اختلاف کی وجہ تعصب ہی ہوتا ہے۔یہ تعصب ایسی بری بیماری ہے کہ بہت دفعہ بندہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں اور فریق ثانی حق پر ہے لیکن تعصب کی وجہ سے مانتا نہیں ہے۔

6۔حسد:

اسباب خلاف میں سے ایک سبب حسد بھی ہے۔مشرکین مکہ عرب ہونے کی وجہ سے قرآن کو سمجھتے تھے اور ان کو پتہ تھا کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے، لیکن پھر بھی اسلام نہیں لاتے تھے صرف حسد کی وجہ سے۔اسی طرح علماء یہود و نصاریٰ بھی سمجھتے تھے کہ آپ ﷺ نبی برحق ہیں، لیکن مانتے نہیں تھے صرف حسد کی وجہ سے۔اسی بات کو اللہ تعالی نے قرآن پاک میں یوں بیان کیا ہے:

﴿حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ[2]﴾اور اسی طرح بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا:﴿أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا [3]﴾ بلکہ یہ لوگوں سے اس چیز پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے۔پس بے شک ہم نے ابراھیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی اور انھیں بہت بڑی دولت عطا فرمائی۔

---

[1] النووي، أبوزكريا محيي الدين يحيى بن شرف، **المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج**، (دار إحياء التراث العربي—بيروت، الطبعة الثانية، 1392۔)

[2] البقرة:109

[3] النساء:54

چنانچہ آج بھی ہمارے معاشرے میں لوگ دوسروں سے صرف حسد کی بناپر اختلاف کرتے ہیں، اگرچہ فریق مخالف حق پر ہی کیوں نہ ہو۔

7۔ تکبر:

اسباب اختلاف میں سے ایک اہم سبب تکبر بھی ہے، تکبر کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کی بات نہیں مانتے اور اختلاف کرتے ہیں[1]۔

اسباب اختلاف ممدوح وجائز:

اختلاف ممدوح اور اختلاف جائز کے بھی اسباب ہیں جن میں سے چند یہاں ذکر کیے جاہیں گئے۔

1۔ اختلاف جائز کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کے بارے میں دلیل قطعی وارد نہیں ہوئی ہے، بلکہ دلیل ظنی ہے جس میں غور وفکر اور اجتہاد کرنے کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ مجتہدین حضرات اپنے اصولوں اور اپنی ذہنی سطح کی بناپر ان دلائل میں خوب غور وفکر کر کے کوئی حکم لگاتے ہیں اور چوں کہ ہر انسان ذہنی سطح کے اعتبار سے دوسرے سے مختلف ہے تو اس بناپر مجتہدین کے احکامات کے اندر اختلافات پائے جاتے ہیں، جب کے دونوں کا مقصد صحیح اور صواب بات تک پہنچنا ہوتا ہے۔

2۔ تفاوت الافہام:

اختلاف جائز کے اسباب میں سے ایک سبب سمجھ بوجھ میں تفاوت ہے اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو سمجھنے کی صلاحیت ایک جیسی نہیں دی ہے بلکہ بعض کو بعض سے زیادہ سمجھ بوجھ کی صلاحیت سے نوازا ہے جس کی وجہ سے ایک آدمی کی سمجھ میں جو بات آتی ہے دوسرا وہ سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان اختلاف ہو جاتا ہے۔

3۔ اسباب خلاف جائز میں سے یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں کے پاس وسائل زیادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ان وسائل کو استعمال میں لاتے ہوئے مسائل کو زیادہ احسن طریقہ سے سمجھ جاتے ہیں، جبکہ دوسرے بعض کے پاس وسائل کم ہوتے ہیں تو وہ اس بات کو اس طریقہ سے نہیں سمجھ پاتے۔ اور بھی بہت سے اسباب ہیں لیکن طولت کے خوف سے انہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

---

[1] الشیخ یاسر بن حسین برھامی، **ادب الخلاف** 19/1

اختلافِ رائے کے آداب:

احمد بن فارس الازدیؒ فرماتے ہیں: (أدب) الْهَمْزَةُ وَالدَّالُ وَالْبَاءُ أَصْلٌ وَاحِدٌ تَتَفَرَّعُ مَسَائِلَهُ وَتَرْجِعُ إِلَيْهِ: فَالْأَدَبُ أَنْ تَجْمَعُ النَّاسَ إِلَى طَعَامِكَ.وَهِيَ الْمَأْدِبَةُ[1]. (ادب) ہمزہ اور دال اور با ایک اصل ہیں۔اس کے مسائل پھیلتے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر آتے ہیں۔ادب یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے کھانے پر جمع کرو۔اور وہ ضیافت ہے۔

مولانا سید احمد دھلوی فرماتے ہیں: ادب اسم مذکر ہے، لغوی معنیٰ: ہر چیز کی حد کو نگاہ رکھنا، پسندیدہ طریقہ، خلق، سلیقہ وغیرہ کے آتے ہیں اور آداب جمع ہے ادب کی جس کے معنیٰ ہیں: وہ عمدہ تربیت یافتہ ہو گیا، وہ طریقے جن سے بڑوں کی بڑائی اور چھوٹوں کی چھوٹائی ثابت ہو[2]۔

ادب کا اصطلاحی مفہوم:

ادب کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوے ابو زید انصاری فرماتے ہیں: "الْأَدَبُ يَقَعُ عَلَى كُلِّ رِيَاضَةٍ مَحْمُودَةٍ يَتَخَرَّجُ بِهَا الْإِنْسَانُ فِي فَضِيلَةٍ مِنْ الْفَضَائِلِ"۔[3] ادب ہر قابل تعریف مشق پر واقع ہوتا ہے۔جس سے انسان بہت سی خوبیوں کے ساتھ فارغ التحصیل ہوتا ہے۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

"الْأَدَبُ اسْتِعْمَالُ مَا يُحْمَدُ قَوْلًا وَفِعْلًا وَعَبَّرَ بَعْضُهُمْ عَنْهُ بِأَنَّهُ الْأَخْذُ بِمَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ وَقِيلَ الْوُقُوفُ مَعَ الْمُسْتَحْسَنَاتِ وَقِيلَ هُوَ تَعْظِيمُ مَنْ فَوْقَكَ وَالرِّفْقُ بِمَنْ دُونَكَ وَقِيلَ إِنَّهُ مَأْخُوذٌ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَهِيَ الدَّعْوَةُ إِلَى الطَّعَامِ سُمِّيَ بِذَلِكَ لِأَنَّهُ يُدْعَى إِلَيْهِ[4]. ادب اس قول اور فعل کا استعمال ہے جس کی تعریف کی جائے۔اور بعض لوگوں نے اسے اعلیٰ اخلاق کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اچھائیوں کے ساتھ کھڑا ہونا ہے۔اور کہا گیا کہ یہ تجھ سے اوپر والوں کی تعظیم ہے اور جو تیرے نیچے ہیں ان پر مہربانی ہے۔اور کہا گیا کہ یہ ضیافت سے لیا گیا ہے۔اور وہ کھانے کی دعوت ہے۔اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کیوں کہ اس کی طرف بلایا جاتا ہے۔

---

[1] أحمد بن فارس الأزدي، **مقاييس اللغة**، 74/1

[2] دھلوی، سید احمد، **فرھنگ آصفیہ**، 49/1

[3] الفيومي، احمد بن محمد، **المصباح المنير في غريب الشرح الكبير**، (مكتبہ العلمیۃ: بیروت، لبنان، طبع: 1987ء) 9/1

[4] ابن حجر، **فتح الباري**، 400/10

اختلافِ رائے کے آداب کی اہمیت:

اختلافِ رائے کے آداب کی بہت زیادہ اہمیت ہے ہم میں سے اکثر لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اگر کوئی ہم سے بحث و مباحثہ کرے یا ہم کسی سے بحث و مباحثہ کریں تو دوسرا ہماری بات کو غور سے سنے اور آداب کا مکمل خیال رکھے، لیکن اگر اسی چیز کو ہم اپنے اندر دیکھیں تو ہم میں سے اکثر لوگ دورانِ بحث عقل سے کام لینا بھول جاتے ہیں اور غصہ ہم پر غالب آجاتا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے اداروں میں اختلافِ رائے کے آداب و اخلاقیات کے درس و تدریس کا اہتمام کریں اور اس کی عملی مشق بھی کروائیں تاکہ یہ چیز ہماری نئی نسلوں کی عادت بن جائے اور ساتھ ساتھ عبادت بھی بن جائے۔ عبادت بایں معنیٰ کہ اس میں اللہ کی اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت ہے اور عادت بایں معنیٰ کہ جب ایک بچے کی تربیت ہی اس پر ہو گی اور اس کو اس کی عملی مشق بھی کروائی جائے گی تو یہ اس بچے کی فطرت و طبیعت ہو جائے گی جس پر عمل کرنے اور اس کو برتنے میں اسے کسی قسم کی تکلیف و زحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ باہمی گفتگو کے آداب کی ضرورت ایک حاکم کو بھی ہے اور ایک عام آدمی کو بھی۔ حاکم کو اس لئے تاکہ رعیت اور رعایا کے حقوق کی وہ حفاظت کر سکے حتیٰ کہ ان لوگوں کے حقوق کی بھی جو اس سے اختلاف رکھتے ہیں، جیسے ہمارے پیارے نبی ﷺ نے سب کے حقوق کی حفاظت فرمائی حتیٰ کہ مکہ کے جانی دشمن مشرکین اور مدینہ کے سخت ترین دشمن یہود و نصاریٰ اور منافقین کے حقوق کی بھی حفاظت فرمائی۔

آپ ﷺ اپنے اصحاب کے معاملہ میں تو بہت زیادہ اس کا اہتمام کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے اصحاب نے آپ ﷺ کے اس معمول و دستور کا پورا پورا لحاظ و پاس رکھا یہاں تک کے دشمنان اسلام مسلمانوں کی شکل و صورت اپنا کر اسلام میں داخل ہو گئے اور انہوں نے مسلمانوں کے باہم اختلافات کو ہوا دی۔ ان آداب و اخلاق کی ضرورت ایک استاد کو ہوتی ہے تاکہ وہ کلاس میں اپنے شاگردوں کی اختلافی آراء کو صبر و تحمل کے ساتھ سن سکے اور ان کا حل نکال سکے۔ ان آداب و اخلاق کی ضرورت ایک باپ کو بھی ہوتی ہے تاکہ اولاد کے لیے وہ محبوب ہو اور وہ اولاد کے درمیان انصاف کر سکے اور انکی بہتر تربیت کر سکے، کیوں کہ آج جو ہمارے بچے ہیں کل کسی کے بڑے ہوں گئے۔ غرضیکہ ان آداب کی ضرورت معاشرے کو ہر فرد کو ہے، اگر معاشرہ ان آداب کا لحاظ کرنا شروع کر دے تو معاشرے کے نوے فیصد جگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔

ذیل میں اختلاف کے چند آداب و اخلاقیات ذکر کی جارہی ہیں تاکہ قاری ان کو سمجھے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔

1۔اخلاص:

آدابِ اختلاف میں سے پہلا ادب یہ ہے کی آدمی اپنے اندر اخلاص پیدا کرے وہ جو کام بھی کرے صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کرے، امام بخاریؒ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف الجامع الصحیح کے اندر سب سے پہلے اس حدیث کو ذکر کیا جس کے اندر اخلاص نیت کا ذکر ہے، فرمایا:

((إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا، أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا، فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ[1])) بے شک اعمال کا دامدار نیتوں پر ہے۔اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس نے ہجرت کی دنیا حاصل کرنے کے لیے یا عورت سے نکاح کرنے کے لیے تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔

انسان جو بھی کرتا ہے اس کا دار و مدار نیت پر ہوتا ہے اگر ایک آدمی پوری رات نوافل اور پورا سال روزے رکھتا ہے اور بقرہ عید پر مہنگا ترین جانور قربان کرتا ہے لیکن اس میں اخلاص نہیں ہے اور اس سب کے پیچھے اس کی نیت یہ ہے کہ لوگ مجھے نیک آدمی سمجھیں اور میری تعریف ہو کے یہ آدمی کتنا نیک ہے تو اس کی ان تمام عبادتوں کا ذرہ برابر بھی کوئی فائدہ نہیں اور ماسوائے نیند کے ختم ہونے اور مال کے ضیاع کے اسے کوئی اجر نہیں ملے گا، جبکہ دوسرا آدمی صرف رمضان کے فرض روزے رکھتا ہے اور فرض نمازیں ادا کرتا ہے اور اس سے اس کی نیت خالص حصول رضائے الٰہی ہے تو یہ شخص اللہ کے ہاں زیادہ محبوب ہے، اس لئے اخلاص ایک بہت ہی اہم عبادت ہے اگر ہم کسی سے کسی بارے میں اختلاف کرتے ہیں اور ہماری نیت حصول رضائے الٰہی ہے تو یہ اختلاف اللہ کی طرف سے ایک رحمت بن جائے گا اور یہ بہت فائدہ مند ہو گا اور اگر ہمارے اندر اخلاص نہیں ہے تو ہمارا اختلاف عذاب بن جائے گا اور یہ بہت سی ناراضگیوں اور رنجشوں کا سبب بنے گا، اسی لئے ہمیں چاہیے کہ ہم جو کام بھی کریں اخلاص نیت کے ساتھ کریں[2]۔

2۔اتباع سنت:

آدابِ اختلاف میں سے دوسرا اور اہم ادب اتباع سنت ہے اللہ رب العزت نے نبی اکرم ﷺ کو ہمارے لئے نمونہ بنایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ[3]﴾ ہمیں چاہیے کے ہم جو کام بھی کریں اس میں آپ ﷺ کی اتباع

---

[1] بخاري، **الجامع الصحيح**، 6/1ح:1

[2] عائض بن عبد الله القرني، **الخلاف أسبابه وآدابه**، (الناشر: الكتاب منشور على موقع وزارة الأوقاف السعودية بدون بيانات)، 38/1

[3] الأحزاب:21

کریں، اگر ہم کسی سے کسی مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں تو ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہمارے پیارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب لوگوں سے اختلاف کیا تو آپ ﷺ نے کون سا طریقہ استعمال کیا اور ہمیں بھی اسی طریقہ پر چلنا چاہئے[1]۔ چناچہ آپ ﷺ کو یہ تعلیم سکھلائی گی:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ[2]﴾ آپ بلائیں اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور اچھے واعظ و نصیحت کے ساتھ اور ان سے مجادلہ کریں اس طریقے سے بحث جو سب سے بہتر ہو، بیشک تمہارا رب وہ خوب جانتا ہے اسے جو اس کی راہ سے گمراہ ہوا اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو بھی۔ اور اسی طرح فرمایا: ﴿وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ[3]﴾ نہ کرو اہلِ کتاب سے بحث مگر اچھے انداز پر۔

3۔ مدمخالف کے صحیح طریقہ پر آنے کی تمنا:

آج کل ہم جب کسی سے بحث و مباحثہ کرتے ہیں تو ہمارا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ مد مخالف ہار جائے اور اس کی لوگوں کے سامنے بے عزتی ہو اور لوگ میری واہ واہ کریں اور کہیں کے یہ کتنی علمی شخصیت ہیں۔ یہ سوچ قابل مذمت ہے۔ اس کے برعکس ذہن میں حق بات تک پہنچنا ہمارا مقصد ہونا چاہئے اور اسی طرح مد مخالف تک حق پہنچانا ہمارا مقصد ہونا چاہیے اور اگر غلطی پر ہیں تو ہمیں مخالف کی بات ماننی چاہئے اور اگر مد مخالف غلطی پر ہے تو اس کے حق کو قبول کرنے کی تمنا ہمارے دل میں ہونی چاہیے۔

4۔ دوسروں کی بات اور دلائل کو غور سے سننا:

آج اختلافات کے بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ دوسرا ہماری سنے اور ہم اس کی نہیں سن رہے ہوتے اور اسی طرح کا رویہ دوسرے کا بھی ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اختلافات ختم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم دوسروں کے دلائل و براہین کو غور سے سنیں پھر اپنے دلائل پیش کریں اور اپنی بات رکھیں، اگر اس طریقے سے بحث و مکالمہ ہو گا تو بہت جلد ہم کسی نتیجہ تک پہنچ جائیں گئے۔

---

[1] عائض بن عبد اللہ القرني، **الخلاف أسبابه وآدابه** 40/1

[2] النحل: 125

[3] العنکبوت: 46

5۔دلائل پیش کرنا:

بسااوقات ہمارے پاس کوئی دلائل نہیں ہوتے اور ہم ادھر ادھر کی فضول باتیں کررہے ہوتے ہیں جو بہت بری بات ہے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے دعوے پر دلائل پیش کریں اور دوسرے کے دلائل کو علمی دلائل سے رد کریں اور اگر کوئی دلیل نہ ہو تو خاموشی سے اس کی بات سنیں۔اللہ تعالیٰ کاارشاد ہے:﴿قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ[1]﴾اسی طرح دوسرے مقام پر فرمایا:﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ [2]﴾اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔

6۔دوسرے کی بات کو نرمی سے رد کرنا:

شور وغل کر کے اور دوسرے کو برا بھلا کہہ کر کبھی بھی اختلاف کو ختم نہیں کیا جاسکتا،اگر اختلاف ختم کرنا ہو اور آپ کو معلوم ہو کہ مد مخالف غلطی پر ہے تو آرام سے اور پیار و محبت اور نرمی سے اس کی بات کو جھٹلانا چاہئے[3]۔

7۔دوسروں کی باتوں کو جھٹلانے میں تواضع اختیار کرنا:

قرآن کریم نے ہمیں جو طریقہ بتلایا ہے وہ یہ ہے کہ تواضع کے ساتھ دوسروں کی باتوں کو جھٹلایا جائے، چنانچہ قرآن کریم میں اہل ایمان کفار سے کہتے ہیں:﴿وَإِنَّا أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَى هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ[4]﴾یاتو ہم ھدایت پر ہیں یاتم ہدایت پر ہو۔
ہمیں معلوم ہے کہ ایمان والے ہی ہدایت پر ہیں لیکن اس کے باوجود یہ طریقہ اختیار کیا گیا کیوں کہ یہ کسی کی بات کو جھٹلانے کا بہترین اسلوب ہے۔

8۔مختلف فیہ باتوں سے پہلے متفق علیہ باتوں کو جمع کرنا:

سب سے پہلے وہ باتیں جن میں فریقین متفق ہیں اور ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے،ان کو دوسری باتوں سے الگ کر لینا چاہیے۔اس کے بعد وہ باتیں جن میں افضل و غیر افضل کا اختلاف پایا جاتا ہے ان کو بھی الگ کر لیا جانا چاہیے۔اس کے بعد بہت کم ایسے مسائل رہ جائیں گئے جن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔۔چنانچہ فریقین کو دلائل کی روشنی میں ان کا کوئی حل نکالنا چاہئے۔آج ہم

---

[1] الأنعام:148

[2] البقرۃ:111

[3] عائض بن عبداللہ القرني،**الخلاف أسبابه وآدابه**،45/1

[4] سبأ:24

فوراایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگا لیتے ہیں اور بات کی گہرائی تک نہیں جاتے جس کی وجہ سے اختلافات میں کمی کے بجائے اضافہ ہورہاہے۔

9۔اپنے آپ کو مخالف کی جگہ پر رکھنا:

ہمیں دوسروں سے اختلاف کرتے وقت اپنے آپ کو دوسروں کی جگہ رکھ کر سوچنا چاہیے کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتااور وہ مجھ سے ایسے لہجہ میں باتیں کرتاتو کیا میں برداشت کر سکتا تھا،اگر جواب نہیں میں ملے تو پھر ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے لہجہ کو تبدیل کر کے اس لہجہ میں بات کریں جو ہم اپنے لئے پسند کرتے ہیں[1]۔

آپ ﷺ کا مبارک ارشاد ہے:((لاَ يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ، حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ[2]))کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہ نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

آج اگر صرف اس ایک حدیث پر عمل ہو جائے تو ہمارے اختلافات میں کبھی بھی جگڑے کی نوبت نہ آئے۔

10۔اختلاف کرنے والوں کوایک دوسرے پر لعن طعن کرنے سے گریز کرنی چاہیے:

اختلاف کرنے والوں کوایک دوسرے کو لعن طعن نہیں کرنا چاہیے اوراپنے آپ کو بہت بڑاعالم اور دوسرے کو جاہل نہیں سمجھنا چاہیے،اوراپنے آپ کو قطعی طور پر دوسرے سے اچھا،مضبوط ایمان والا،وسیع علم اور پختہ عقل والا نہیں سمجھناچاہیے۔یحییٰ ابن سعیدؒ فرماتے ہیں:"مَا بَرِحَ الْمُسْتَفْتُونَ يُسْتَفْتَوْنَ فَيُحِلُّ هَذَا وَيُحَرِّمُ هَذَا فَلَا يَرَى الْمُحَرِّمُ أَنَّ الْمُحَلِّلَ هَلَكَ لِتَحْلِيلِهِ وَلَا يَرَى الْمُحَلِّلُ أَنَّ الْمُحَرِّمَ هَلَكَ لِتَحْرِيمِهِ[3]"فتویٰ دینے والوں سے فتویٰ ومسائل کا سوال ہمیشہ ہوتارہااور وہ جواب دیتے رہے ایک نے ایک چیز کو حلال اور دوسرے نے اسی چیز کو حرام کہالیکن حرام کہنے والے نے یہ نہیں سمجھا کہ حلال کہنے والا اس وجہ سے تباہ ہو گیااور نہ حلال کہنے والے نے یہ گردانا کہ حرمت کا فتویٰ دینے والا اس کی وجہ سے برباد ہو گیا۔مطلب یہ کہ ہمیں بھی اسلاف کے طریقہ پر عمل کرنا چاہیے اور فوراایک دوسرے کے خلاف غلیظ زبان استعمال نہیں کرنی چاہیے بلکہ صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے اور آداب کالحاظ ہر صورت رکھنا چاہیے۔

---

[1] عائض بن عبداللہ القرني،**الخلاف أسبابه وآدابه**،55/1

[2] البخاري،**الجامع الصحيح**،12/1،رقم الحديث:13.

[3] ابن عبدالبر،**جامع بيان العلم وفضله**،903/2

11۔انصاف:

بحث ومباحثہ اور اختلافات میں کبھی بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"ثلاثٌ مَنْ جَمَعَهُنَّ فَقَدْ جَمْعَ الإِيْمَانُ: الإِنْصَافُ مِنْ نَفْسِكَ، وَبَذْلُ السَّلَامِ لِلْعَالَمِ، وَالْإِنْفَاقِ مِنْ الْإِقْتَارِ[1]"

جو آدمی تین باتوں کو جمع کرے وہ ایمان کو جمع کر لیتا ہے، اپنے آپ سے انصاف، عالم کے لئے سلام، بخل کے موقع پر خرچ۔

انصاف بڑا پسندیدہ خلق ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تم درپیش معاملات میں دوسروں کو اپنی جگہ رکھو اور سمجھو، انصاف یہ ہے کہ فریقِ مخالف کے پاس جو حق وصواب ہو اسے قبول کرنا چاہیے خواہ فریق مخالف بدعتی، فاسق یا کافر ہی کیوں نا ہو۔

شیخ عبدالرحمن سعدیؒ فرماتے ہیں: اگر کوئی عالم اھلِ بدعت کی باتوں سے متعلق گفتگو کرے تو اس پر لازم ہے کے وہ ہر ذی حق کے حق کا لحاظ کرے اور ان کی باتوں میں جو حق اور جو باطل ہے اس کو واضح کرے اور ان کی باتوں میں حق سے قرب وبعد کا خیال رکھے[2]۔

12۔صبر، نرمی ورواداری کا استعمال نیز ایذا پر تحمل وصبر اور برائی کا اچھائی سے جواب دینا۔

اختلاف کے دوران انسان کے پاس سب سے بہترین ہتھیار صبر کا ہوتا ہے۔ اگر وہ اس ہتھیار کو دورانِ اختلاف استعمال کرتا ہے تو وہ اس اختلاف کو مفید بنا سکتا ہے۔ اگر دوران اختلاف وہ صبر و تحمل سے کام نہیں لیتا اور اس کا غصہ اس پر غالب آجاتا ہے تو وہ شخص حق پر ہوتے ہوئے بھی ناحق ہوتا ہے اور بجائے اختلاف کے ختم کرنے کے مزید اختلافات کا سبب بنتا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ [3]﴾ نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی۔ آپ نیک برتاؤ سے برائی کو ٹال دیا کیجئے، پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے کوئی دلی دوست۔

---

[1] بخاری، الجامع الصحیح، **کتاب الإیمان، باب إفشاء السلام من الإسلام**، 15/1.

[2] سعدی، عبدالرحمن، **تفسیر سعدی** (1/280) سورت الانعام، الآیۃ: 152۔

[3] فصلت: 34

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی آپ کے ساتھ برائی کرے تو بدلے میں آپ کو اس کے ساتھ برائی نہیں بلکہ اچھائی سے پیش آنا چاہئے۔ آپ ﷺ کا طریقہ بھی یہی تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے سخت سے سخت دشمن سے بھی بدلا نہیں لیا بلکہ فتح مکہ کے موقع پر تو آپ نے ان سب کو معاف کر دیا تھا جنہوں نے آپ ﷺ کی دشمنی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

اختلافِ رائے اور ریاستِ پاکستان کی ذمہ داریاں:

اختلافات اور لوگوں کے درمیان باہمی منافرت، ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگانا، ایک دوسرے کو سب و شتم کرنا وغیرہ یہ ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے ریاست کے اندرونی نظام میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو بڑھتے بڑھتے آخر کار خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور ریاست کو تباہ کر دیتی ہیں۔ جیسا کہ اسلام کے خلافتِ بنو امیہ اور خلافتِ بنو عباس کے دور میں مسلمانوں کے درمیان مذہبی اور سیاسی اختلافات کی بنیاد پر بہت سے معرکے ہوئے اور بہت خون بہایا گیا۔ امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے بڑے بڑے علماء کو سخت ترین سزائیں دی گئیں۔ آج بھی مذہبی اختلافات کی وجہ سے آئے روز کہیں نا کہیں جگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سیاسی اختلافات کی وجہ سے الیکشن میں کتنے لوگ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں اور کتنی جگہوں پر بات قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے ریاستِ پاکستان کو چاہئے کہ وہ لوگوں کے اختلافات کو کنٹرول کرنے کے لئے اپنی ذمہ داری کو سمجھے اور اس پر خود بھی اور لوگوں کو بھی سختی سے عمل کروائے۔ ذیل میں چند نکات پیش کئے جاتے ہیں جن پر عمل کر کے لوگوں کے درمیان اختلافات کو کم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ ایسے ادارے بنائے جہاں اختلافِ رائے کے آداب کا درس دیا جائے اور اس کی عملی مشق کروائی جائے تاکہ لوگ دورانِ اختلاف اپنی حد پار نہ کریں۔

2۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ آدابِ اختلاف کو نصاب میں شامل کرے اور ہم نصابی سرگرمیوں میں بزم ادب کی طرح اس کی بھی عملی مشق کروائی جائے۔

3۔ حکومتی افراد کو خود لوگوں کے سامنے دورانِ اختلاف صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہئے تاکہ لوگوں میں اس کے مثبت اثرات مرتب ہوں۔

4۔ خاص ادارے بنائے جائیں جہاں ہر فرقے کے علماء کرام کو جمع کیا جائے جو آپس کے متفق علیہ مسائل اور ایسے مسائل جن کے اندر صرف افضلیت و غیر افضلیت کا اختلاف ہے اور ایسے مسائل جن کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان سب کو الگ الگ کریں اور پھر قرآن و سنت اور موجودہ حالات کے پیشِ نظر ان اختلافات کا حل تلاش کیا جائے۔ کسی متفقہ نتیجے پر پہنچنے کے بعد ان مسائل کو الیکٹرونک میڈیا، پرنٹ میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعے عام کیا جائے اور عام لوگوں تک پہنچایا جائے۔ مساجد میں بھی

اختلافی مسائل پر خطبات دینے پر پابندی لگائی جائے اور اس کی جگہ حل شدہ مسائل کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے کا پابند کیا جائے۔

خلاصہ بحث:

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ انسانی سماج میں رائے کا مختلف ہونا ایک فطری عمل ہے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ دینی و دنیاوی دونوں قسم کے معاملات میں بہت سے مسائل ایسے آتے ہیں جن میں آراء مختلف ہوتی ہیں اس لیے کے ہر انسان اپنا دماغ رکھتا ہے جس سے وہ سوچتا ہے اور ایک نظریہ قائم کرتا ہے۔ ہر انسان کے اپنے افکار نظریات اور تخیلات ہوتے ہیں اور یہ محال ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کے تمام خیالات سے متفق ہو جائے اور اسکی ہر بات کو من و عن تسلیم کرلے۔ آراء کا مختلف ہونا ایک فطری عمل ہے اور اسے زندہ قوموں کی علامت بھی بتایا جاتا ہے۔ اس لیے اگر اختلاف اخلاص، اخلاق اور آداب کے دائرہ میں رہ کر کیا جائے تو بہت مستحسن عمل ہے اور یہ رائے کا اختلاف فی نفسہ کوئی برا اور ناپسندیدہ عمل نہیں ہے بلکہ اس اختلاف کے نتیجہ میں ایک دوسرے سے رقابت کرنا، کینہ رکھنا، بغض رکھنا، ایک دوسرے کی تذلیل کرنا، پھوٹ ڈالنا اور آپس میں نفرت کے جذبات کو پروان چڑھانا یہ مذموم عمل ہے اور بات بھی ظاہر ہے کہ اختلاف رائے رکھنے والے سب ایک ہی سطح کے لوگ نہیں ہوتے۔ بعض اہل علم اور آداب کو پہچاننے والے ہوتے ہیں اور بعض کم علم اور نادان ہوتے ہیں جو آدابِ اختلاف سے ناآشنا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے معمولی نوعیت کے اختلافات بھی بعض دفعہ بڑے نزاع اور فتنہ کا باعث بن جاتے ہیں لہذا ایسی صورت حال میں ارباب حل وعقد یعنی ریاستی اداروں اور ان سے منسلک افراد کی یہ ذمہ داری ہے کہ جہاں ایسے اختلافات ابھر رہے ہوں وہ ان کی بروقت تشخیص کریں اور ان اسباب و عوامل کو سمجھیں اور ان کے تدارک کی طرف متوجہ ہوں۔

فصل دوم: مخلوط تعلیم

فصل دوم: مخلوط تعلیم

اسلام میں تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پہلی وحی جو آپ ﷺ پر غار حراء میں نازل ہوئی وہ علم کے متعلق تھی۔ قرآن پاک میں بار بار علم کے ذکر، اہل علم اور علم سے ناآشنا لوگوں کے درمیان فرق کے بیان اور حصولِ علم کی ترغیب و تشویق کے ذریعے اس کی قدر و منزلت کو واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح احادیث نبویہ ﷺ کے ذخائر بھی علم کی فضیلت، حاملینِ علم کی عظمت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تمام کتبِ حدیث میں علم سے متعلق احادیث کو علیحدہ ابواب قائم کر کے جمع کیا گیا ہے۔ اسلام نے مردوں کے ساتھ خواتین کی تعلیم کو بھی خصوصی اہمیت دی ہے؛ کیوں کہ کسی بھی قوم کی ترقی میں اپنے اساسی مقاصد کے مطابق افراد کار کی تیاری کرنے، تہذیب و ثقافت سے بہرہ ور کرنے اور اخلاق و کردار سے مزین کرنے میں اس قوم کی خواتین کا مرکزی اور اساسی حصہ ہوتا ہے۔ اسی باعث ماں کی گود کو بچے کی پہلی درسگاہ کہا جاتا ہے۔ اسلام نے ابتداء سے مردوں کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم پر بھی زور دیا ہے۔ اسی لیے ہر دور میں مسلم خواتین نے دیگر اوصاف حمیدہ کی طرح علم و فضل میں بھی اپنے آپ کو منوایا ہے۔

آپ ﷺ نے تین لوگوں کے لیے دوہرے اجر کا وعدہ فرمایا ہے جن میں ایک وہ شخص بھی ہے جس کے پاس باندی ہو اور وہ اسے ادب سکھائے اور اچھی تعلیم دے پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے تو اس کے لیے دو اجر ہیں[1]۔

حدیث کے اس آخری جزء کی شرح میں ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: "یہ حکم صرف باندی کے لئے نہیں ہے بلکہ اپنی اولاد اور عام لڑکیوں کے لئے بھی ہے۔"[2] اسلام جس طرح صنفِ لطیف کو دیگر حقوق بخشنے میں بالکل عادلانہ بلکہ فیاضانہ مزاج رکھتا ہے، ویسے ہی اس کے تعلیمی حقوق کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ عملی سطح پر انہیں عطا کرنے کا بھی حد سے زیادہ اہتمام کرتا ہے۔ موجودہ نظامِ تعلیم (Co-Education) "مخلوط تعلیم" مغرب سے درآمد کردہ ہے اور جو دراصل مغرب کی مسلمان خواتین کے خلاف گھناؤنی سازش اور اس کی چادرِ عصمت و عفت کو تار تار کرنے کی چال ہے۔ اس کی مذہبِ اسلام تو کبھی بھی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا۔ اس فصل میں ہم مخلوط تعلیم کی تعریف، اس کے فوائد و نقصانات، مخلوط تعلیم اور اسلامی نقطہ نظر اور مخلوط تعلیم اور ریاستی ذمہ داریوں کو زیر بحث لائیں گے۔

مخلوط تعلیم کی تعریف:

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں اس کی مندرجہ ذیل تعریف بیان کی گئی ہے: "ایک ہی مضمون کی تعلیم، ایک ہی وقت میں، ایک ہی جگہ، ایک طریقے سے، ایک ہی نظام کے تحت۔" احمد انس اس نظامِ تعلیم کی عملی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] بخاری، **صحیح بخاری**، کتاب العلم، باب تعلیم الرجل امتہ واہلہ، 20/1

[2] ملاء علی قاری، **مرقات**، 89/1

"جس طرح آج مردوں کے کالج میں مرد اور عورتوں کے کالج میں عورتیں تعلیم حاصل کرتی ہیں ٹھیک اسی طرح مرد اور عورتیں ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کریں۔ کسی کی فوقیت اور کسی کی کمتری کا سوال نہ ہو، کامل مساوات کا دور دورہ ہو، استادوں اور منتظمین کی جانب سے کسی کا خصوصی لحاظ نہ ہو، نہ علیحدہ کامن روم ہو، نہ علیحدہ نشست، نہ ساتھ کھیلنے کودنے پر پابندی ہو اور نہ ہی رہائش کے لیے علیحدہ ہاسٹل ہوں۔ یہ ہے حقیقی مخلوط تعلیم کا تصور۔"[1]

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں مخلوط تعلیم کی ایک اور تعریف بھی درج ہے۔:

"چونکہ دونوں انسان ہیں اسی لیے ساتھ ساتھ تعلیم تو ضروری ہے لیکن ذہنی و طبعی اختلافات کا تھوڑا بہت لحاظ رکھا جانا چاہیے اس لیے مخلوط تعلیم "مخلوط ضروریات" کا لحاظ رکھ کر زیادہ تر کلاسوں، کھیلوں اور سوشل زندگی میں ساتھ تعلیم حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔"[2]

مخلوط تعلیم کا تصور:

مخلوط تعلیم کی بنیادیں تاریخی حقائق کی روشنی میں تلاش کرنا چاہیں تو اس کا کھوج یونان کے دانشور افلاطون کے قائم کردہ نظریات میں ملتا ہے۔ افلاطون عورتوں اور مردوں کو ایک ہی طریقہ تعلیم تجویز کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"مملکت میں نظم و نسق میں مرد یا عورت کے لئے جنسی اعتبار سے کوئی مخصوص خدمت مقرر نہیں ہے۔ قدرت نے مرد اور عورت کو یکساں صفات عطا کی ہیں جو کام مرد کر سکتے ہیں وہ عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔"[3]

افلاطون کا کہنا ہے کہ مرد اور عورت کے لیے جنسی اعتبار سے کوئی مخصوص خدمت مقرر نہیں ہے، اس کا یہ دعویٰ انتہائی نامناسب ہے اور ایک ایسا جھوٹ ہے جس کو کبھی سچ ثابت نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ عورت بچہ جنتی ہے اسے دودھ پلاتی ہے جب کہ مرد کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔

ارسطو کا نظریہ اپنے استاد افلاطون کے برعکس تھا وہ عورتوں کے بارے میں اعلیٰ تعلیم کے حق میں نہیں تھا۔ اس کے نزدیک عورتوں کا اصل مقام گھر ہے جہاں وہ مرد کی اطاعت کرے گی[4]۔ روسو بھی عورت کے حق میں صرف ماں اور بیوی بنے کے لیے تعلیم کا قائل ہے اس کے علاوہ عورت کو تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] ام عبد منیب، **مخلوط تعلیم**، 19/1

[2] ایضًا۔

[3] اکرام قریشی، **تاریخ تعلیم**، 45/1

[4] اکرام قریشی، تاریخ تعلیم، 50/1

مخلوط تعلیم کی ابتدا:

دورِ حاضر میں مخلوط تعلیم کی ابتدا امریکہ سے 1774ء میں ہوئی۔ انگلستان میں اس کا آغاز 1870ء میں ہوا اور 1902ء میں وہاں مخلوط تعلیم کے لیے قانون پاس کیا گیا۔ فرانس میں 1867ء میں اسے قانونی جواز دیا گیا۔ غرض اس کی ابتدا تو بہت پہلے ہوئی لیکن اسے قبول عام حاصل نہ ہو سکا جس کی سب سے بڑی وجہ لڑکے اور لڑکیوں میں جنسی، طبعی اور طبّی فرق تھا۔ دوسری وجہ لڑکے اور لڑکیوں کو ایک ہی جگہ پر ایک ہی انداز سے تعلیم دینے سے جنسی انارکی پھیلنے کے خدشات موجود تھے۔ 1950ء کی دہائی میں تحریک آزادئ نسواں اپنے عروج کو پہنچ گئی جس میں عورت کو مرد کے برابر حقوق دینے کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں دونوں کو برابر کی سطح پر شامل کرنے کا شور مچایا گیا لہذا مخلوط تعلیم کو بھی اس غوغائے مساوات کا سہارا مل گیا، لیکن شرفاء نے کسی بھی زمانے میں اسے پسند نہ کیا کیوں کہ وہ اس کے مضر اثرات اور نقصانات سے ہمیشہ ڈرتے رہے۔

پاکستان میں مخلوط تعلیم:

لڑکوں اور لڑکیوں کے مخلوط کالجوں اور اسکولوں کے متعلق ہر نیک دل مسلمان کو یہ گمان تھا کہ پاکستان بننے کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کی جائے گی۔[1] لیکن صورت حال اس کے برعکس ثابت ہوئی۔ جب مسلمان ساری دنیا پر برتر قوم کی حیثیت سے چھائے ہوئے تھے تو وہ اپنی اقدار و روایات پر فخر محسوس کرتے تھے اور اسلام میں ستر و حجاب کا بہت اہتمام کیا جاتا تھا، لیکن بیسویں صدی میں جب انگریز برتر اور فاتح قوم کی حیثیت سے برصغیر پر قابض ہوا تو اس نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو بھی یکسر بدل کر رکھ دیا۔ مسلم ممالک میں بھی مخلوط نظام تعلیم کو رائج کیا چنانچہ جب پاکستان آزاد ہوا تو اس نے بھی انگریز کے لائے ہوئے نظام تعلیم کو ترجیح دی اور اسی کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی۔ این۔جی۔اوز اور دیگر غیر ملکی حکومتوں نے اس کی پشت پناہی کی اور آج تک کر رہی ہیں[2]۔

مخلوط تعلیم کے فوائد:

مخلوط تعلیم کے حامی اس کے حق میں بہت سے دلائل دیتے ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر ہم یہاں کریں گئے۔

مسابقت کا جذبہ:

مخلوط تعلیم سے طلباء و طالبات میں مسابقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے جذبے میں ایک دوسرے سے زیادہ محنت کرتے ہیں جس سے مقابلے اور مسابقت کی فضا پروان چڑھتی ہے اور بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

---

[1] اصلاحی، امین احسن، **پاکستانی عورت دوراہے پر**، 43/1

[2] ام عبد منیب، **مخلوط تعلیم**، 34/1

ایک دوسرے کو سمجھنا:

مخلوط تعلیم حاصل کرنے والے طلباء وطالبات ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں۔ خواتین مردوں کے جذبات، ان کے احساسات اور ان کے طریقہ زندگی سے واقفیت حاصل کرتی ہیں اور اسی طرح مرد حضرات عورتوں کے جذبات واحساسات کو سمجھ سکتے ہیں۔ یوں جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو خوشحال زندگی گزارتے ہیں۔ چوں کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے جذبات سے واقف ہوتے ہیں اس لیے ان کے درمیان بانسبت دوسروں کے بہت کم اختلافات ہوتے ہیں۔

چوری چھپے تعلقات سے چھٹکارا:

مخلوط نظام تعلیم کی وجہ سے جو لڑکے اور لڑکیاں چوری چھپے ایک دوسرے سے ملتے تھے اور پکڑے جانے پر بے عزتی اور جگڑوں کی نوبت آجاتی تھی، ان کو چوری چھپے ملنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور اس طرح وہ بے عزتی اور خاندانی جگڑوں سے بچ جاتے ہیں۔

معاشی سہولت:

غریب ممالک اگر بچوں اور بچیوں کے لئے الگ الگ تعلیم اداروں کا قیام کریں گئے تو اس کا ملک کے خزانے پر بہت بوجھ پڑتا ہے۔ الگ الگ عمارتوں کے اخراجات، اساتذہ کی تنخواہیں اور دیگر بہت سے اخرجات ملکی خزانے سے ہی ادا کیے جاتے ہیں جبکہ مخلوط تعلیمی نظام میں ملکی خزانوں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور ملک ترقی کرتا جاتا ہے۔

خود اعتمادی کا پیدا ہونا:

مخلوط تعلیمی نظام کی وجہ سے طلباء اور طالبات میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور ان کے اندر سے جھجک ختم ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے وہ ہر قسم کے پروگرامز اور محافل میں مافی الضمیر کو بہتر طریقہ سے ادا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں[1]۔

مخلوط نظام تعلیم کے نقصانات:

مخلوط نظامِ تعلیم کے نقصانات درج ذیل ہیں۔

معیار تعلیم کا انحطاط:

جس طرح دنیاوی کاموں کے لیے یکسوئی اور مکمل توجہ درکار ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ کام بخیر وخوبی انجام نہیں پاتا، بلکل اسی طرح تعلیم کا معاملہ بھی ہے بلکہ اس کے لیے تو اور بھی زیادہ توجہ اور یکسوئی درکار ہوتی ہے۔ ایسے ادارے جہاں مخلوط نظام تعلیم رائج ہے وہاں طلبہ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہی درپیش ہے کہ انھیں ذہنی یکسوئی حاصل نہیں رہتی بلکہ وہ مخالف صنف کی توجہ

---

[1] ام عبد منیب، **مخلوط تعلیم**، 54/1

اپنی طرف مبذول کروانے کے لیے ہر وقت غیر ضروری بناؤ و سنگار، خوش لباسی اور خوش گفتاری میں مگن رہتے ہیں۔ انہیں ذہنی یکسوئی نصیب نہیں ہوتی جس کا نتیجہ تعلیمی گراوٹ اور پسماندگی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔[1]

ناجائز دوستیاں اور تعلقات:

اسلام میں بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسلام نے غیر محرم مرد اور عورت کے لیے حدیں مقرر کی ہیں۔ اور ارشاد فرمایا:

﴿ولاتقربوا الزنا﴾ اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ اور ﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ۔۔۔﴾ اور مومنوں سے کہہ دیں کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں "لیکن اس کے برعکس مخلوط تعلیم کے اداروں میں طلباء اور طالبات کا پسندیدہ مشغلہ ہی ایک دوسرے کے ساتھ دوستیاں بنانا، دل لگی کرنا اور ایک دوسرے کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہنا ہے جس کے لیے مختلف حیلے اور بہانے اختیار کیے جاتے ہیں۔

شرم وحیاء کا خاتمہ:

مخلوط تعلیم کے نظام نے جہاں ناجائز دوستیوں اور تعلقات کا دروازہ کھولا وہاں اس کے اور بھی بہت سے بھیانک نتائج سامنے آئے ہیں جن میں سے ایک شرم وحیاء کا ختم ہونا بھی ہے۔ آپ ﷺ کا پاک ارشاد:

((إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُولَى: إِذَا لَمْ تَسْتَحِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ[3])) پہلے انبیاء کے کلام میں سے جو چیز مجھے ملی ہے وہ یہ کہ اگر تمہیں حیاء نہ رہے تو جو مرضی کرو۔ اور فرمایا: ((اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ[4])) حیاء ایمان کا ایک شعبہ ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم کی وجہ سے حیاء نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ لڑکے لڑکیاں آپس میں بے تکلف ہو جاتے ہیں اور مشترک مطالعہ کے عنوان سے ایک کیبن میں گھنٹوں تنہائی میں وقت گزارتے ہیں۔ یہ سب مغرب کی اندھی تقلید میں بے حیائی کے سمندر میں کود کر اپنی آخرت کو برباد کرنے کے اسباب ہیں۔

---

[1] ضیاء الرحمن، مفتی، **خواتین کے زیب وزینت کے احکام اور ان کی سائنسی حکمتیں**، 3/1

[3] بخاری، **صحیح بخاری، کتاب الأدب: باب إذا لم تستحي فاصنع ما شئت**، ح6120

[4] ایضاً: **کتاب الإیمان، باب أمور الإیمان**، ح:9

تہذیب سے روگردانی اور معاشرتی نظام سے بغاوت:

مخلوط تعلیم کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ ہماری نئی نسل اپنی تہذیب وروایات اور اسلاف کے طریقوں سے کھلی بغاوت اختیار کرتی جارہی ہے۔اور یہ چیز خاندانی نظام کی تباہی و بربادی کا باعث بن رہی ہے۔آج ہمارے معاشرے میں بھی گرل فرینڈ بوائے فرینڈ کلچر عام ہوتا جارہا ہے۔بے پردگی عام ہو چکی ہے، بچے بچیاں والدین سے بغاوت کرکے پسند کی شادیاں رچا رہے ہیں، اخلاقیات کا جنازہ نکل چکا ہے، وقتی لذت اور تسکین کے لیے خاندان کی رسوائی کا سبب بن رہے ہیں اور یہ سب مخلوط طریقہ تعلیم کے ثمرات ہیں۔

مخلوط تعلیم اور اسلام کا نقطہ نظر:

اسلام انسانیت کی فلاح و بہبود کا علمبراد دین ہے اور بلا تفریق مسلم و غیر مسلم پوری انسانیت کے لیے سرچشمہ ہدایت ہے۔اسلام کسی ایسے عمل کی اجازت ہر گز نہیں دیتا جو فتنہ وفساد کا ذریعہ بنے۔بلکہ اسلام ایسے تمام فتنوں کی بیخ کنی کرتا ہے۔ان فتنوں میں سے ایک مخلوط تعلیم کا فتنہ بھی ہے۔اسلام نے صراحتاً اس کو حرام قرار دیا ہے۔اور اس کی حد بندی کی ہے خواتین غیر مردوں کے ساتھ اختلاط نہ کریں بلکہ عورت کو کسی غیر مرد کے ساتھ نرم لہجے میں گفتگو کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔اور یہ بھی ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ[1]﴾جب تم ان سے یعنی نبی کی ازواج سے کوئی چیز مانگو تو ان سے پردے کے پیچھے سے مانگو۔یہ بات تمارے دلوں کے لیے اور ان کے دلوں کے لیے زیادہ پاکیزگی کی بات ہے۔اس آیت کریمہ کی تفسیر میں ابن کثیرؒ نے فرمایا ہے:

> "جیسے اللہ تعالی نے تمھیں عورتوں کے پاس علیحدگی میں جانے سے روکا ہے اسی طرح ان کی طرف کلی طور پر دیکھنے سے منع کیا ہے۔اگر تمھیں کوئی ضرورت پیش آجائے تو ان کو دیکھے بغیر پردے کے پیچھے سے طلب کرلیا کرو۔"[2]

امین احسن اصلاحیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> "اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط، ان کا ایک مجلس میں بیٹھ کر خوش گپیاں کرنا اور تفریحات میں ایک ساتھ شریک ہونا اسلام کی تہذیب نہیں ہے۔"[3]

---

[1] الأحزاب:53.

[2] ابن کثیر، إسماعیل بن عمر، **تفسیر القرآن العظیم**، 403/6، المحقق: محمد حسین شمس الدین، (الناشر: دار الکتب العلمیة، منشورات محمد علي بیضون، بیروت، الطبعة: الأولى 1419ھ۔)

[3] امین احسن اصلاحی، **پاکستانی عورت دوراہے پر**، 133/1

پردے کا حکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی درخواست وخواہش پر نازل ہوا جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

((يَا رَسُولَ اللَّهِ يَدْخُلُ عَلَيْكَ البَرُّ وَالفَاجِرُ، فَلَوْ أَمَرْتَ أُمَّهَاتِ المؤْمِنِينَ بِالحِجَابِ، فَأَنْزَلَ اللَّهُ آيَةَ الحِجَابِ[1]))یارسول اللہ ﷺ: آپ کے پاس اچھے برے ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ اگر آپ امہات المؤمنین کو پردے کا حکم دیں تو اچھا ہوتا۔ جس پر اللہ تعالی نے آیت حجاب نازل کیا۔ اسی طرح اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا[2]﴾ اور ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا"۔

عبادت کرنے کی غرض سے حضرت مریم علیہا السلام نے علیحدگی اختیار کی تاکہ کوئی انھیں دیکھ نہ سکے۔ حضرت اسید بن حضیر انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کو مسجد کے باہر یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا! جب مرد وزن کا راستے میں اختلاط ہو گیا تو آپ ﷺ نے خواتین سے ارشاد فرمایا:

((اسْتَأْخِرْنَ، فَإِنَّهُ لَيْسَ لَكُنَّ أَنْ تَحْقُقْنَ الطَّرِيقَ عَلَيْكُنَّ بِحَافَّاتِ الطَّرِيقِ فَكَانَتِ الْمَرْأَةُ تَلْتَصِقُ بِالْجِدَارِ حَتَّى إِنَّ ثَوْبَهَا لَيَتَعَلَّقُ بِالْجِدَارِ مِنْ لُصُوقِهَا بِهِ[3].)) تم ٹھہرو، پیچھے رکو پس بے شک تمہارے لیے یہ مناسب نہیں کے راستے کے درمیان چلو۔ تمہارے لیے ضروری ہے کہ کنارے پر چلو، پس عورتیں دیوار کے ساتھ لگ کر چلنے لگیں یہاں تک کہ ان کے کپڑے دیوار کے ساتھ اٹکنے لگے، ان کے دیوار سے چمٹنے کی وجہ سے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((لَوْ تَرَكْنَا هَذَا الْبَابَ لِلنِّسَاءِ،قَالَ نَافِعٌ: فَلَمْ يَدْخُلْ مِنْهُ ابْنُ عُمَرَ، حَتَّى مَاتَ[4].)) اگر ہم اس دروازے کو عورتوں کے لیے خاص کر دیں! حضرت نافع کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ اس دروازے سے کبھی داخل نہ ہوئے حتی کہ وہ فوت ہو گئے۔

نبی کریم ﷺ نے اس اختلاط کے سبب پیش آنے والے فتنوں کے پیش نظر عبادات میں بھی علیحدگی کا حکم دیا ہے۔ ارشاد فرمایا: ((خَيْرُ صُفُوفِ الرِّجَالِ أَوَّلُهَا، وَشَرُّهَا آخِرُهَا، وَخَيْرُ صُفُوفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا، وَشَرُّهَا أَوَّلُهَا[5])) بہترین صفیں مردوں کی پہلی ہیں اور بری صفیں آخری ہیں اور عورتوں کی بہتریں صفین آخری ہیں اور ان کی بری صفین اگلی ہیں۔

---

[1] البخاري، **الجامع الصحیح**، 118/6، رقم الحدیث: 4790.

[2] مریم: 17.

[3] أبو داؤد، **السنن ابی داؤد**، 369/4، رقم الحدیث: 5272

[4] ایضاً: 1/126، رقم الحدیث: 462

[5] مسلم، **الجامع الصحیح**، 326/1، رقم الحدیث: 132-(440)

ان روایات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرد وزن کے اختلاط کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے چاہے وہ عبادات کے باب میں ہو، چاہے تعلیم کے باب میں ہو یا کھیل کود کے میدان میں، کسی بھی صورت میں اس کی اجازت نہیں ہے۔اور اگر کہیں ایسا ہو رہا ہے تو اس کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

مخلوط نظام تعلیم اور ریاستِ پاکستان کی ذمہ داریاں:

اسلام خواتین کی تعلیم کا قطعاً مخالف نہیں ہے بلکہ وہ تو عورتوں کی تعلیم کے حق میں ہے۔ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی محبوب بیوی تھیں اس کے باوجود ذخیرہ حدیث آپ کی روایات سے بھرا پڑا ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام عورتوں کی تعلیم کا کس قدر قدر دان ہے۔

جب اسلامی نظامِ تعلیم اور مخلوط طریقہ تعلیم دو الگ نظام ہیں تو ان کے احکامات و حدود بھی الگ الگ ہوں گی اور اسی طرح ایک اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست کی اپنی اپنی ترجیحات ہیں لیکن ہم یہاں ان اسلامی ریاستوں کی بات کریں گے جو خود تو اسلامی ہیں لیکن ان کا نظامِ تعلیم غیر اسلامی ہے جیسا کہ ریاست پاکستان۔ مخلوط نظام تعلیم کے بارے میں پاکستانی ریاست کی کیا ذمہ داریاں ہیں، درج ذیل سطور میں ان میں سے چند کو ذکر کیا جاتا ہے۔

1۔نظام کو تبدیل کرنا:

سب سے پہلا کام جو حکومت کی ذمہ داری ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس غیر مسلم نظام تعلیم کو اسلامی نظام تعلیم سے بدلے اور اس میں جو مشکلات ہوں ان کو حل کرنے کی کوشش کی جائے،اس میں جو مشکلات عام طور سے پیش آسکتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

- **عالمی دباؤ:**

سب سے پہلی مشکل جس کا سامنا ملک پاکستان کو یا اس دور کی کسی حکومت کو کرنا ہوتا ہے وہ عالمی دباؤ ہے اور ان این جی اوز کا دباؤ ہے جو مخلوط تعلیمی نظام کو ختم کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔

- **بجٹ کی کمی:**

دوسری مشکل غریب ممالک کی ہے جن کے پاس اتنا بجٹ نہیں ہے کہ وہ طلباء اور طالبات کے لیے الگ الگ عمارتیں تیار نہیں کر سکتی لیکن اس کا آسان حل یہ ہے کہ بے شک عمارت ایک ہی ہو لیکن اس کے اندر پردے کا انتظام ہونا چاہیے اور طلباء اور طالبات کی الگ الگ کلاسز ہونی چاہیئں۔

2۔اسلامی تعلیمات کا رواج:

مسلمان ہونے کے ناطے ہم سب کی ذمہ داری ہے اور حکومت کی بطور خاص یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کو عام کرے اور نصاب میں اس کو شامل کرے تاکہ ایک سائنس، ڈاکٹری اور انجنیئرنگ پڑھنے والا طالب علم بھی اپنے مذہب کی بنیادوں سے آگاہ ہو سکے۔

خلاصہ:

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام عورتوں کی تعلیم کے قطعاً خلاف نہیں ہے بلکہ اسلام تو عورتوں کی تعلیم کی ترغیب دیتا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جہاں تک بات نظامِ تعلیم کی ہے تو اسلام مخلوط نظامِ تعلیم کی قطعاً اجازت نہیں دیتا جس سے معاشرہ جنسی بے راہ روی کا شکار ہو جو مخلوط نظام تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے بلکہ تعلیمی اداروں سے ہٹ کر بھی سوسائٹی میں غیر محرم مرد و زن کے اختلاط کو برداشت نہیں کرتا۔ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آنے والی ریاست ہے۔ یہاں اکثریت میں مسلمان بستے ہیں جو یہ بات ہر گز گوارہ نہیں کریں گے کہ ملک پاکستان میں اسلام کے متصادم نظام تعلیم رائج ہو۔ یعنی ملک میں مخلوط نظام تعلیم رائج ہو، مسلمان بچے اور بچیاں اکھٹے تعلیم حاصل کریں اور اللہ کی قائم کردہ حدوں کو پامال کریں۔ لہذا یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ فوراً انگریز کے لائے ہوئے اس مخلوط نظام تعلیم کو ختم کر کے اس کی جگہ اسلامی نظام تعلیم کو نافذ کرے۔ بچوں اور بچیوں کے لیے علیحدہ تعلیمی ادارے قائم کرے اور ان کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کرے۔

فصل ثالث: غیر نصابی سرگرمیاں

فصل ثالث: غیر نصابی سرگرمیاں

غیر نصابی سرگرمیوں کا مفہوم:

غیر نصابی یا ہم نصابی سرگرمیوں سے مراد ایسی سرگرمیاں جن کی سرپرستی اسکول یا کالج کے ذریعہ کی جاتی ہے یا یہ تعلیمی نصاب کا حصہ نہیں ہیں لیکن وہ کسی تعلیمی ادارے کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ شریک نصاب سرگرمیوں میں کھیل، اسکول کے بینڈ، طالب علمی اخبار تحریری و تقریری مقابلے، ادبی محافل، ذہنی آزمائش کے پروگرامات، ورکشاپس، اسمبلی، کانفرنس اور پریزنٹیشنز وغیرہ شامل ہیں۔ بین الاقوامی لغت کی تعلیم (1977) کے مطابق، ملازمت کے معمول کے فرائض سے باہر کی سرگرمیاں، جیسے اضافی کلاس سرگرمیاں۔

ہم نصابی سرگرمیوں کی ضرورت:

تعلیمی ادارے ایک مربوط نظام کے تحت قوم کی تعمیر میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں جن میں حکومت کی طرف سے مقررہ نصاب کو مقررہ وقت کے اندر مکمل کروایا جاتا ہے اور امتحان لے کر طلباء کو اگلی جماعت میں ترقی دے دی جاتی ہے۔

اور یہ سلسلہ تعلیمی اداروں میں سیڑھیوں کی مانند جاری رہتا ہے جس طرح نخلستان بغیر پانی کے اور استاد بغیر تختہ تحریر استعمال کرنے کے کامل نہیں ہوتا اسی طرح ان سرگرمیوں کے بغیر ایک طالب علم کامل نہیں ہو سکتا۔ چند اضافی سرگرمیاں جو کہ مقررہ نصاب کے ساتھ ساتھ ذہین طلباء کے لیے مخصوص کی جاتی ہیں اور پھر ان اضافی سرگرمیوں میں طلباء حصہ لے کر اپنی کاوش و کردار سے اپنے سکول اور اپنے اساتذہ کا نام روشن کرتے ہیں اور پھر یہی طلباء بڑے ہو کر معاشرے اور قوم کا اہم اور ضروری جزو بن جاتے ہیں۔ ہم نصابی سرگرمیوں کا کردار سازی اور تربیت میں اہم اور بنیادی کام ہوتا ہے۔

جامعات میں ہم نصابی سرگرمیوں کا بنیادی مقصد آئندہ نسلوں کے کردار اور شخصیت کی اس طرح تشکیل و تعمیر کرنا ہے کہ زندگی کے انفرادی و اجتماعی دائروں میں وہ مفید و مناسب اور ذمہ دارانہ کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں۔ یہ سرگرمیاں نوجوانوں میں لیڈرشپ اور ٹیم سپرٹ پیدا کرتی ہیں۔[1]

---

[1] V.K. Verma, **Eduacation and Sports Psychology**, Educational Publishers and Distributors, 291, Bank Enclave, Laxmi Nagar, Dehli-110092, 2011, P: 1-4

تعلیم کا مقصد بچوں کو محض کتابی کیڑے بنانا ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کو معاشرے کا ایک باکردار اور باحیا شہری بھی بنانا ہے۔اس لیے طلباء کو ان ہم نصابی سر گرمیوں میں شریک کرنا انتہائی ضروری ہو جاتا ہے۔ ان سر گرمیوں کو اس سے قبل غیر نصابی یا اضافی سر گرمیاں کہا جاتا تھا مگر حکومت نے اب ان اضافی سر گرمیوں کو ہم نصابی سر گرمیوں کا نام دیا ہے اور گورنمنٹ کی طرف سے ہر ادارے پر زور دیا جاتا ہے کہ آپ نے ان ہم نصابی سر گرمیوں میں ضرور حصہ لینا ہے۔ غرض ہر وہ سر گرمی جو طالب علم ادارے کے نظم کے ماتحت رہ کر سرانجام دیتا ہے وہ ہم نصابی سر گرمی کہلاتی ہے اور وہ سر گرمی جو نصاب اور نظم کا حصہ نہیں ہوتی ہم نصابی سر گرمی کہلائے گی۔

ہم نصابی سر گرمیوں کی اہمیت:

کسی بھی معاشرے کے لئے تعلیم کی اہمیت ناگزیر تسلیم کی جاتی ہے اور ماہرین کا قول ہے کہ درسگاہوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا عمل بھی بخوبی ہونا چاہیے، کیونکہ نصاب کی تکمیل جہاں تعلیم کا پہلو ممکن بناتی ہے وہیں ہم نصابی سر گرمیاں ہم نصابی طلبہ کو تربیت اور سیکھنے کے مواقع فراہم کرتی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ نصابی سر گرمیوں کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سر گرمیوں کو بھی اہمیت دی جائے۔

یہ سر گرمیاں قوتِ تخیل میں وسعت واستحکام پیدا کرتی ہیں اور نظم وضبط کی بہترین تربیت فراہم کرتی ہیں۔[1]

یہ سر گرمیاں طلبہ میں خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ محنت کرنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا کرتی ہیں جو ان کی شخصیت پر مفید اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہ سر گرمیاں نہ صرف دماغ کی بہترین نشو ونما کرتی ہیں بلکہ ایک صحت مند مقابلے کی فضا بھی پیدا کرتی ہیں جس سے نہ صرف طلبہ کو اپنی فطری صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملتا ہے بلکہ ان میں لیڈر شپ کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلبہ کے لئے نصاب کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سر گرمیوں کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

تحقیق کے مطابق جو طلبہ نصابی سر گرمیوں کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سر گرمیوں میں بھی حصہ لیتے ہیں وہ دیگر طلبہ کی نسبت زیادہ ترقی کرتے ہیں۔ ماہرین کے نزدیک جو بچے اپنے وقت کا بہتر انصرام کرنا یا اپنے دباؤ کو کم کرنا سیکھ جاتے ہیں ایسے طلبہ ایک سے زیادہ چیزوں میں انتہائی مہارت حاصل کرنے کی کوشش میں جتے رہتے ہیں۔ تاہم سب سے اہم سوال یہ پیش آتا ہے کہ

---

[1] David Tod, Joanne Thatcher and Rehman, **Sports Psychology**, Palgrave Macmillan, U.K. 2010, P:1-12

دوران تعلیم وہ نصابی سر گرمیاں کون سی ہیں جو طلبہ کی سیکھنے کی صلاحیتوں میں اضافہ کر سکیں، جو ان میں نظم وضبط کا قیام، ہدف کا تعین، ٹیم ورک، احتساب اور ذمہ داری کا احساس جگا سکیں۔

غیر نصابی سر گرمیوں سے قبل ضروری ہے کہ ان سر گرمیوں پر بات کی جائے جن کا شمار ہم نصابی سر گرمیوں میں کیا جاتا ہے۔ ان سے حاصل ہونے والے فوائد میں اجتماعی مفادات، بلند کرداری اور مضبوط اخلاق جیسی صفات شامل ہیں اور ان سر گرمیوں کا سب سے اہم فائدہ طلباء و طالبات کا روز مرہ کے تدریسی کاموں میں دلچسپی کے عنصر کا اضافہ کرنا، سیکھنے کا جذبہ اور رفتار کی صلاحیت بڑھانا ہے۔

ادب وثقافت سے آگاہی فراہم کرنے والی تفریحی سر گرمیاں:

اسکول میں طلبہ وطالبات کو ادب اور ثقافت سے آگاہی فراہم کرنے کے لئے ورائٹی پروگرام اور مضمون نویسی جیسے مقابلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے جن کا مقصد ایک طرف بچوں کو ادب اور ثقافت سے آگاہ کرنا ہوتا ہے تو دوسری طرف ان میں ادبی ذوق ابھارنا، تاکہ ان میں موجود فنکارانہ صلاحیتوں کو اظہار کا موقع دیا جاسکے۔

نیشنل ڈے اور طلبہ وطالبات:

تئیس مارچ، چودہ اگست اور چھ ستمبر جیسے اہم قومی مواقع کے دن اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بچوں کے مابین نغموں، ٹیبلو، بحث ومباحثہ اور تقاریری مقابلوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ان سر گرمیوں کا انعقاد بچوں میں جذبہ حب الوطنی، دفاع وطن جیسے جذبات پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔

صحت اور جسمانی نشوونما کے لئے کھیلوں کا اہتمام:

اسلامی نے صحت کی حفاظت پر کتنا زور دیا ہے، اس کا اندازہ پیغمبر اسلام کے اس فرمان سے ہوتا ہے کہ دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے معاملے میں انسان بہت غفلت کا شکار ہوتا ہے، ان میں سے ایک صحت ہے اور دوسری فراغت۔[1] طلبہ کی صحت اور جسمانی نشوونما ان کی تعلیم پر زیادہ اثرانداز ہوتی ہیں۔ طبّی ماہرین کے مطابق صحت مند دماغ صحت مند جسم میں ہی ہوتا ہے۔اور اسی قول کے پیش نظر مختلف قسم کے کھیل، دوڑ، جمناسٹک، کرکٹ، ہاکی، فٹبال، والی بال جیسی سر گرمیوں کا اسکول میں انعقاد نصابی سر گرمیوں میں شامل ہے۔

---

[1] ترمذی، **الجامع الترمذی، باب زہد**، الناشر، دار الغربی اسلامی، بیروت، 1998ء، 126/2، ح:2304۔

مذہبی سرگرمیاں:

قومی ایام کی طرح مذہبی مواقع پر بھی سکولوں میں مختلف مقابلوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ان سرگرمیوں میں حسن قرات، نعت خوانی ،سیرت نبوی اور دوسرے اسلامی موضوعات پر تقاریر اور مباحثے وغیرہ جیسی سرگرمیاں شامل ہیں۔ان سرگرمیوں کا مقصد طلبہ کو مذہب کے بارے میں بنیادی معلومات سے آگاہی جیسا بنیادی فریضہ سرانجام دینا بھی ہے۔

نیشنل ہیروز اور طلبہ وطالبات:

قومی اور مذہبی تقریبات کی طرح کسی بھی ملک کے لئے قومی اور ملی ہیروز بھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔وہی قومیں بلند منازل حاصل کرتی ہیں جو اپنے ہیروز کو یاد رکھتی ہیں۔اسی بات کے پیش نظر ہر قوم اپنے شہیدوں کی برسی کے موقع پر انہیں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے یہ دن خاص اہتمام سے مناتی ہے۔چنانچہ قائداعظم، علامہ اقبال اور قائد ملت کے یوم پیدائش پر تقاریر، ملی نغموں اور اقبال کی نظموں پر مشتمل پروگرام ترتیب دیے جاتے ہیں۔

تقسیم اسناد، کانووکیشن:

چھوٹے بڑے تمام تعلیمی اداروں میں طلبہ کی صلاحیتوں کو مزید اجاگر کرنے کے لئے تقسیم اسناد یا پھر فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ وطالبات کو ڈگریاں دینے کے لئے تقسیم اسناد اور کانووکیشن جیسی سرگرمیوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ان تقاریب میں موجود مہمان خصوصی نمایاں کارکردگی دکھانے والے طلبہ وطالبات کو گولڈ میڈل، سلور میڈل یا پھر اعزازی شیلڈز سے نوازتے ہیں۔

تفریحی دورے:

تعلیمی عمل اگر مشینی عمل بنادیا جائے تو طالبِ علم کی شخصیت گہنا جاتی ہے۔طلباء کی صلاحیتوں میں نکھار، قوت فیصلہ اور مہم جوئی کے شوق میں اضافہ کے لئے تعلیمی اداروں میں تفریحی اور تعلیمی دوروں کا انعقاد کیا جاتا ہے جو کہ تعلیم کے لئے ضروری ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی صحت پر بھی مفید اثرات مرتب کرتے ہیں۔ماہرین کے مطابق کتابی کیڑا پن شخصیت کو چاٹتا رہتا ہے۔طوطاسازی کا عمل یا تو نمو کے امکانات ختم کردیتا ہے یا گھٹن پیدا کرتا ہے۔تعلیم کا تفریح سے وہی تعلق ہے جو پانی کا پھلواری سے ہے۔یہی وجہ ہے کہ تعلیمی ادارے ہر سیشن میں طلبہ وطالبات کے لیے تفریحی دوروں کا اہتمام کرتے ہیں۔

ہم نصابی سرگرمیوں کے فوائد:

ہم نصابی سرگرمیوں کے بہت سے فوائد ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

1۔ صحت مند ذہن:

صحت مند ذہن کے لئے ضروری ہے کہ جسم صحت مند ہو، کیوں کہ بیمار جسم کے ساتھ کوئی بھی کام بہتر طریقے سے انجام نہیں پا سکتا اور اسی طرح ہر وقت پڑھ پڑھ کر انسان کا دماغ تھک جاتا ہے اس لیے بھی ضروری ہے کہ انسان پڑھائی کے ساتھ ساتھ ذہن کے سکون کے لئے ہم نصابی سر گرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لے تاکہ وہ بہتر طور پر کام کر سکے۔

2۔ فعال اور متحرک ہونا:

غیر نصابی سر گرمیاں منظم اور معنی خیز سیکھنے کے مواقع فراہم کرتی ہیں اور طلباء کو مستقبل کے لیے تیار کرتی ہیں۔ یہ آپ کو فعال اور متحرک بناتی ہیں جس کے ذریعہ طلباء کو سیکھنے اور متعدد مہارتوں کو فروغ دینے میں مدد ملتی ہے۔

3۔ دوسروں کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانا:

غیر نصابی سر گرمیوں کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے دوسرے طلباء کے ساتھ ملنے اور گپ شپ کرنے کا موقع ملتا ہے اور دوسروں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔

ہم نصابی سر گرمیوں کی حدود اور دائرہ کار:

اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر نصابی یا ہم نصابی سر گرمیاں بہت اہمیت کی حامل ہیں لیکن اس کے باوجود اس کی چند حدود ہیں جن کے اندر رہنا بہت ضروری ہے ورنہ بجائے فائدے کہ الٹا نقصان ہی اٹھانا پڑے گا۔ ویسے تو ہر ادارے کو اپنی اپنی مناسبت سے حدود اور دائرہ کار متعین کرنا چاہیے لیکن چند چیزیں ہیں جن کی پابندی ہر اس ادارے کو کرنی چاہیے جو غیر نصابی سر گرمیوں کے بہتر نتائج کی حامل ہیں۔ ذیل میں ان میں سے بعض کو ذکر کیا جاتا ہے۔

1۔ شریعت کی حدود کی پابندی:

بحیثیت مسلمان ہمیں ہر کام شریعت کے اندر رہتے ہوئے کرنا چاہئے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی صفات کو ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ[1]﴾ ایمان والے وہ ہیں جو لغو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس لیے ادارے کے اندر جو بھی غیر نصابی ایکٹیویٹی ہو اس میں سب سے پہلے دیکھنا چاہیے کہ اس کی وجہ سے کہیں ہم کوئی خلافِ شرع کام کو فروغ تو نہیں دے رہے۔ آج کل عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ غیر نصابی سر گرمیوں کے نام پر یونیورسٹیوں اور

---

[1] المومنون: 3

کالجوں میں مخلوط ڈانس اور گانے وغیرہ کو رواج دیا جارہا ہے اور اسی طرح دیگر بہت سی برائیاں جن کی شریعت اجازت نہیں دیتی اس دروازے سے ہمارے اداروں میں گھس رہی ہیں اور ہماری نئی نسل کو تباہ کر رہی ہیں۔

2۔ملک کی سالمیت کا خیال رکھنا:

اداروں کے ذمہ داروں کو چاہیے کہ وہ اپنے ادارے میں کسی ایسی سرگرمی کی ہرگز اجازت نہ دیں جس سے کسی بھی طرح ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچتا ہو۔

ہم نصابی سرگرمیاں اور ریاست کی ذمہ داریاں:

تعلیم کی اہمیت جتنی زیادہ ہے اتنی ہی ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت بھی ہے اس لیے کسی بھی ریاست کے لیے جہاں نصابی تعلیم ضروری ہے وہاں ہم نصابی تعلیم بھی ضروری ہے لہذا ریاست کو اس امر کا بھی پورا پورا خیال رکھنا چاہیے اور اسی طرح ہم نصابی سرگرمیوں کی وجہ سے طلباء کے اندر چھپی مہارتیں سامنے آتی ہیں جو کہ بعد میں ملک و قوم کی ترقی کا باعث بنتے ہیں۔

چنانچہ ریاست پر اس حوالے سے بہت اہم ذمہ داریاں لاگو ہوتی ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

1۔بجٹ مختص کرنا:

ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت کے پیشِ نظر ریاست کی ذمہ داری ہے کہ تعلیم کی طرح ہم نصابی سرگرمیوں کے لیے بھی بجٹ مختص کیا جائے۔

2۔سہولیات مہیا کرنا:

ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہم نصابی سرگرمیوں میں دلچسپی رکھنے والے طلباء کو سہولتیں مہیا کرے تاکہ طلباء میں مزید جوش و جذبہ پیدا ہو اور زیادہ طلباء ان میں حصہ لیں۔

3۔ریاستی سطح پر مقابلے کروانا:

ریاست کو چاہیے کہ وہ ریاستی اور بین الاقوامی سطح پر طلباء میں مقابلہ جات کروائیں اور جیتنے والے طلباء کو دوسرے ممالک کے دورے کروائے جائیں اور شریک طلباء کو انعامات سے نوازا جائے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ طلباء کے اندر مزید جذبہ پیدا ہو اور مزید محنت کریں۔

باب چہارم: سماجی امور میں احکام اسلامی کی تنفیذ

فصل اول: پردہ ولباس سے متعلق امور

فصل ثانی: سوشل میڈیا

فصل ثالث: جنسی مصنوعات کی فروخت

فصل اول: پردہ ولباس سے متعلق امور

فصل اول: پردہ ولباس سے متعلق امور

جب سے انسان اس دنیا میں آیا ہے لباس اس کی خاص ضرورت رہی ہے۔ اپنے بعض اعضاء کو چھپانا انسان کی فطرت میں ہے۔ لباس انسان کی ہر دور کی ضرورت رہی ہے۔ اسلام ایک مکمل دین اور مکمل ضابطہ حیات ہے جس نے عورت کو ذلت سے عزت، نشیب سے فراز، ظلمت سے نور اور حیوانیت سے انسانیت کے بلند و بالا مقام پر فائز کیا۔ عظمت و وقار جیسی عظیم نعمتوں سے سرفراز کیا لیکن مغرب نے آزادی کے نام پر عورت کو انسانیت سے دور کر کے پھر حیوانیت کی طرف دھکیل دیا۔

شرم وحیاء ہی سے تو انسانوں اور حیوانوں میں فرق سمجھا جاتا ہے۔ جب شرم وحیاء کا نام ونشان باقی نہ رہے تو انسان اور حیوان میں امتیاز کا ختم ہونا قدرتی بات ہے۔ اسلام نے عورت کی قدر و منزلت کو بڑھانے کے لئے اس کی تربیت کا خصوصی اہتمام وانتظام کیا ہے۔ اس کو مقام و مرتبہ عطا کرنے کے صرف کھوکھلے دعوے ہی نہیں کئے بلکہ چند فطری خصائل کے علاوہ باقی زندگی کے تمام مقامات پر مثلاً علم و عمل، تہذیب و تمدن میں عورت کو مرد کے شانہ بشانہ کھڑا کیا ہے۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلام سے پہلے معاشرے میں عورت کو سب سے زیادہ ظلم وجبر کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کی ناموس کو پامال کیا گیا۔ عورت معاشرے پر اس قدر بوجھ سمجھی جاتی تھی کہ پیدا ہوتے ہی اسے زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ بیوی کے روپ میں بھی اس کے حق کا احساس تک نہیں کیا جاتا تھا۔ ماں کے روپ میں بھی عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی بلکہ باپ کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتا تھا۔ پس ایسے میں دین اسلام کی روشنی چمکی جس نے عورت پر سے ظلم و ستم کی تاریکیاں دور کر دیں۔ اس کے حقوق بحال کئے اور اس کو ذلت و پستی کی تاریکیوں سے نکال کر عزت و مرتبت کے اعلی وارفع مقام پر لا کر کھڑا کیا۔ اگر عورت ماں کے روپ میں تھی تو قدموں تلے جنت بنادی چنانچہ فرمان نبوی ﷺ ہے:

((الْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الْأُمَّهَاتِ[1])) جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اگر بہن کے روپ میں تھی تو اس کی عزت و حرمت بھائیوں کی غیرت بنادی، اگر بیٹی کے روپ میں تھی تو اس کی پرورش اور تربیت پر جنت کی خوشخبری سنادی۔ فرمان رسول ﷺ ہے: ((لَا يَكُونُ لِأَحَدٍ ثَلَاثُ بَنَاتٍ أَوْ بِنْتَانِ، أَوْ أُخْتَانِ فَيَتَّقِي اللَّهَ فِيهِنَّ، وَيُحْسِنُ إِلَيْهِنَّ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ[2])) کسی کی تین بیٹیاں یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں وہ ان کے بارے میں خدا سے ڈرے اور ان کے ساتھ بھلائی کرے تو اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

---

[1] الدولابي، أبو بِشْر محمد بن أحمد، **الكنى والأسماء**، 1091/3، حدیث نمبر: 1911.

[2] البیہقی، ابو بکر، أحمد بن الحسین، **الآداب** (ص: 14) 23۔

خالق کائنات نے انسان کی تخلیق کے لئے ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ[1]﴾ فرمایا تو یقیناً اس کا کچھ مقصد و مدعا تھا و گرنہ اس نے کائنات کی ہر چیز کو تخلیق کیا لیکن احسن تقویم نہیں کہا۔ احسن تقویم کی شرح و تفسیر کرتے ہوئے جو حقیقت واضح ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو فی احسن تقویم سے اس لئے یاد کیا گیا ہے کہ اسے خلیفۃ الارض یعنی نائب خدا کی حیثیت میں احکام خداوندی کو دنیا میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر نافذ کر کے اپنی عبودیت کا ثبوت بہم پہنچانا تھا چنانچہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے اور ایک ایسے انسان کی تشکیل کے لئے جو ان جملہ ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ براہ ہو سکے، خالق کائنات نے انبیائے کرام کا ایک طویل سلسلہ دنیا میں مبعوث فرمایا جس نے انسان کو اس کے اعلیٰ و ارفع منصب سے روشناس کرایا اور اسے ایک ایسا ضابطہ حیات دیا جسے دین برحق کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامُ[2]﴾ بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ اور یہی وہ مکمل دین ہے جس کی تکمیل کے مختلف مراحل حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر مکمل ہوتے ہیں اور آیتِ کریمہ:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا[3]﴾ آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے پورا کر دیا ہے اور پوری کر دی ہے تم پر اپنی نعمت اور پسند کیا ہے میں نے تمہارے لیے اسلام کو دین۔ کا ارشاد خداوندی سامنے آتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ مکمل ضابطہ حیات ہے جو ہماری زندگی کے ہر شعبے خواہ اس کا تعلق اخلاق سے ہو یا عبادات سے، معاشرت سے ہو یا معیشت سے، سیاست سے ہو یا عمرانیات سے، تہذیب سے ہو یا تمدن سے الغرض ہر شعبہ کے متعلق مکمل راہنمائی عطا کرتا ہے۔

اسی ضابطہ و دستور کے مطابق بقائے نسل انسانی کے اہم مسئلے کو بھی خداوند قدوس نے کچھ اس طرح حل کیا کہ آج تک انسانی عقل اس منفرد طریق کار پر بحث اور غور و خوض کرنے کے باوجود اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ اس انوکھے اور نرالے طریق کار کے علاوہ اور کوئی بھی عائلی نظام اس قدر مستحکم اور دیرپا ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

خدائے لم یزل نے نسل انسانی کی تخلیق کے لئے مرد اور عورت کو پیدا کیا اور سرور کونین ہادیٔ برحق محسن انسانیت محمد ﷺ نے

((النِّكَاحُ من سُنَّتِي فمَنْ لَمْ يَعْمَلْ بِسُنَّتِي فَليسَ مِنِّي، و تَزَوَّجُوا؛ فإني مُكَاثِرٌ بِكُمُ الأُمَمَ، و مَنْ كان ذَا طَوْلٍ فَلْيَنْكِحْ،

---

[1] التین:4

[2] آل عمران:19

[3] المائدۃ:3

و مَنْ لَمْ يَجِدْ فَعليهِ بِالصِّيامِ، فإنَّ الصَّوْمَ لهُ وِجَاءٌ[1]))نکاح کرنا میری سنت ہے،جو میری سنت پر عمل نہیں کرتا وہ مجھ سے نہیں ہے اور نکاح کرو کیوں کہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔جو مالی طور پر استطاعت رکھتا ہو وہ ضرور نکاح کرئے،جسے رشتہ نہ ملے وہ روزے رکھا کرے کیوں کہ روزہ خواہش کو کچل دیتا ہے۔

یہ فرمان جاری کر کے ان تمام مضر اثرات کا قلع قمع کر دیا جو عورت اور مرد کے جوڑے سے ناجائز طور پر سامنے آسکتے تھے اور انسانی خواہشات کو کنٹرول کرنے کا حل بھی بتادیا کہ جو شخص نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا وہ روزہ رکھا کرے۔

چنانچہ اسلام جو کہ دین فطرت ہے اس نے معاشرے کو غلط اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے پردہ ضروری قرار دیا جس پر عہد رسالت مآب ﷺ اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لیکر بعد تک سختی سے عمل ہوتا رہا لیکن مختلف لادینی نظریات اور مغربی ثقافتی یلغار کے زیر اثر پردہ کو غیر ضروری قرار دیا جانے لگا اور اس کے لئے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈے جانے لگے اور مختلف حیلوں اور بہانوں سے پردہ کے احکامات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی جانے لگی۔

پردہ کی اہمیت:

اسلام دین فطرت ہے جو حیاء کو ایمان کا ایک شعبہ قرار دیتا ہے اس حدیث میں پردہ کی خصوصی اہمیت بیان کی گئی ہے اور مرد اور عورت کو ستر پوشی کے ساتھ شرم وحیا کو بھی ملحوظ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ مرد کے لئے کسی بھی غیر محرم عورت پر دوسری نگاہ قصداً ڈالنا جائز نہیں۔نبی کریم ﷺ بہت شرم وحیا والے تھے اور آپ ﷺ نے اوروں کو بھی اسی کا درس دیا۔

حدیث پاک میں ارشاد ہے۔حضرت ابو سعید خدری ؓ کا بیان ہے:

((أَشَدَّ حَيَاءً مِنَ العَذْرَاءِ فِي خِدْرِهَا، فَإِذَا رَأَى شَيْئًا يَكْرَهُهُ عَرَفْنَاهُ فِيْ وَجْهِهِ[2]))آپ ﷺ پردہ والی کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ باحیا تھے۔جب کوئی بات ایسی دیکھتے جو آپ ﷺ کو ناگوار گزرتی تو ہم لوگوں کو آپ ﷺ کے چہرے سے معلوم ہو جاتا"۔اسلام چونکہ دین فطرت ہے اور اللہ اور رسول کریم ﷺ کے فرمودات اور احکامات پر عمل کرنا ہی اسلام ہے اور اسلام مومنوں کو پردے کا حکم دیتا ہے۔

---

[1] ابن ماجہ، **سنن ابن ماجہ**، 592/1، حدیث نمبر:1846 ۔

[2] بخاری، **الجامع الصحیح**، جلد سوم، حدیث نمبر 1055۔

قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے: ﴿يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا وَلِبَاسُ التَّقْوَى ذَلِكَ خَيْرٌ ذَلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ[1]﴾ اے اولاد آدم! ہم نے اتارا ہے تمہارے لئے لباس جو چھپاتا ہے تمہاری شرم گاہوں کو اور زینت کا باعث بھی ہے اور تقویٰ کا لباس یہ بہتر ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ یہ لوگ یاد رکھیں۔

اور دوسری جگہ قرآن پاک میں ارشاد ہے: ﴿وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ ------[2]﴾

"اور آپ ﷺ کہہ دیں مومن عورتوں سے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کے مقامات کو ظاہر نہ کریں مگر جو اس میں سے ظاہر ہو (جس کا ظاہر ہونا ناگزیر ہو) اور وہ اپنی اوڑنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنی زینت کے مقام ظاہر نہ کریں سوائے اپنے خاوند پر۔۔۔۔"

خواتین کو مستورات بھی کہا جاتا ہے اور مستور کا مطلب ہے چھپا ہوا، عورت کے پردہ کے حوالہ سے ایک حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((إنَّ المرأةَ عورةٌ، فَإِذَا خَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ، وأَقْرَبُ مَا تَكُوْنُ مِن وَجْهِ رِبِّهَا وَهِيَ فِي قَعْرِ بَيْتِهَا[3]))عورت پردہ میں رہنے کی چیز ہے کیوں کہ جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے بہکانے کے لئے موقع تلاش کرتا ہے۔ وہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب ہوتی ہے جبکہ وہ اپنے گھر کے سب سے اندر ہوتی ہے۔

"عورت کے پردہ کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ اس کے لئے عبادت بھی پردہ کے بغیر اور بے پردہ جگہ پر کرنا منع فرمایا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

((صَلَاةُ الْمَرأَةِ فِيْ بَيْتِهَا أَفْضَلُ مِن صَلَاتِهَا فِيْ حُجْرَتِهَا وَصَلَاتُهَا فِي مَخْدَعِهَا أَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِهَا فِي حُجْرَتِه[4]))عورت کا کمرہ میں نماز پڑھنا گھر (آنگن) میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور (اندرونی) کوٹھڑی میں نماز پڑھنا کمرہ میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔"

---

[1] الأعراف:26

[2] النور:31

[3] الطبرانی، **معجم الوسیط**، دار الحرمین للطباعۃ والنشر والتوزیع، 189/3، ح1181

[4] ابوداؤد، **سنن ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب: التشدید فی ذالک**، ح570۔

یعنی عورت جس قدر بھی پردہ کرے گی اسی قدر بہتر ہے۔ صحن میں نماز پڑھنے کے مقابلہ میں کمرہ میں نماز پڑھنا افضل ہے اور کمرہ میں نماز پڑھنے کے مقابلہ میں کمرہ کے اندر بنی ہوئی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا زیادہ افضل ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جیسے کسی بھی مرد کا کسی خاتون پر نظر ڈالنا درست نہیں اور پہلی نظر کی معافی کے بعد دوسری نگاہ ڈالنے سے منع کیا گیا ہے ایسے ہی خواتین کو بھی حکم ہے کہ وہ مردوں پر نظر نہ ڈالیں۔ اس حوالہ سے حدیث پاک میں آتا ہے حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں رسول کریمؐ کے پاس تھی اور آپؐ کے پاس حضرت میمونہؓ بھی تھیں۔ سامنے سے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم (جو نابینا تھے) تشریف لائے اور یہ واقعہ پردہ کا حکم دیئے جانے سے بعد کا ہے۔۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان سے تم دونوں پردہ کرو، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ نابینا نہیں ہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ انہیں نہیں دیکھتی ہو[1]" اس حدیث سے ثابت ہوا کہ خواتین کو بھی مردوں سے پردہ کرنا چاہئے اور نگاہ نہیں ڈالنی چاہئے چاہے وہ مرد بصارت سے محروم ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام میں کسی کے گھر بلا اجازت نگاہ ڈالنے کی اجازت نہیں ہے اس سلسلہ میں مذکورہ حدیث شریف میں بیان ہے ''حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اجازت ملنے سے پہلے پردہ اٹھا کر کسی کے گھر میں نظر ڈالی گویا کہ اس نے گھر کی چھپی ہوئی چیز دیکھ لی اور اس نے ایسا کام کیا جو اس کے لئے حلال نہیں تھا۔ پھر اگر اندر جھانکتے وقت کوئی اس کی آنکھیں پھوڑ دیتا تو میں اس پر کچھ نہ کہتا (یعنی بدلہ نہ دلاتا) اور اگر کوئی شخص کسی ایسے دروازے کے سامنے سے گزرا جس پر پردہ نہیں تھا اور وہ بند بھی نہیں تھا پھر اس کی گھر والوں پر نظر پڑ گئی تو اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں بلکہ گھر والوں کی غلطی ہے۔"[2]

حضرت جریر بن عبداللہ البجلیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر اچانک کسی غیر محرم عورت پر نظر پڑ جائے تو اس کا کیا حکم ہے تو نبی کریمؐ نے فرمایا: اپنی نظر کو پھیر لو۔ اچانک اگر کسی نامحرم عورت پر نظر پڑ جائے تو وہ معاف ہے لیکن اگر دوبارہ جان بوجھ کر اس کی طرف دیکھے گا تو گنہگار ہو گا۔ ستر پوشی یعنی پردہ دین اسلام میں نہایت ضروری ہے۔ مرد کا ستر ناف سے گھٹنوں تک ہے۔ زرا سی جگہ کو ننگا نہیں ہونے دینا چاہیے اور اگر کوئی برہنہ ہو تو اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہیے۔ تنہائی میں بھی بے پردہ ہونے کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالی اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔ اسی طرح نامحرم عورت کا سارا بدن (ہاتھ اور چہرہ کے سوا) ستر ہے۔ نفسا نفسی کے اس دور میں جبکہ لوگوں کی آنکھوں میں حیا نہیں رہی، ہر طرف آوارگی اور بیہودگی کا دور دورہ ہے، ٹی وی، کیبل اور انٹرنیت وغیرہ پر غیر مذاہب یہود و نصاریٰ کی ثقافت نے ملت اسلامیہ پر

---

[1] ابوداؤد، **سنن ابوداؤد**، ح720

[2] ترمذی، **الجامع الترمذی**، ح618

عارضی طور پر غلبہ پالیا ہے۔آیت کریمہ میں آنکھوں کو ہر وقت اور بلاوجہ بند رکھنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اُس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنے سے روکا گیا ہے۔ نبی کریمؐ نے بڑی سختی سے نامحرم عورت کی طرف دیکھنے سے منع فرمایا ہے اس سلسلہ میں ہمیں ان ارشادات نبویؐ پر غور کرنا چاہیے جن میں آپؐ اپنی امت سے مخاطب ہیں :

((عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:"تَقَبَّلُوا لِي بِسِتٍّ أَتَقَبَّلْ لَكُمْ بِالْجَنَّةِ".قَالُوا: وَمَا هِيَ ؟ قَالَ: "إِذَا حَدَّثَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَكْذِبْ، وَوَعَدَ فَلَا يُخْلِفْ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ فَلَا يَخُنْ، وَغُضُّوا أَبْصَارَكُمْ، وَكُفُّوا أَيْدِيَكُمْ، وَاحْفَظُوا فُرُوجَكُمْ"[1])) اگر تم میری طرف سے چھ چیزوں کو قبول کر لو تو میں تمہارے لیے جنت کو قبول کرتا ہوں، صحابہ نے عرض کیا وہ کیا ہیں ؟ارشاد فرمایا: جب بات کرے تم میں سے کوئی تو جھوٹ نہ بولے اور جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی نہ کرے اور جب امانت دار بنایا جائے تو خیانت نہ کرے، اپنی نگاہوں کو نیچی رکھو اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو اور اپنے ہاتھوں کو روک کر رکھو۔

اس حدیث کی روسے امت مسلمہ کا ہر فرد اس بات کا ذمہ دار ہے کہ وہ ان نصیحتوں کو دل و جان سے قبول کرے اور جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت، بدنظری، زنا اور ظلم سے اپنے آپ کو بچائے۔

پردہ کی فطرتاً ضرورت:

بے شک تمام نفوس و قلوب کا موزوں و متناسب اور حسین و جمیل اشیاء کی طرف میلان ایک طبعی امر ہے جو نظام عالم کے خاص اسرار میں سے ہے مگر ہر من بھاتی چیز کی محبت ہمیشہ مفید نہیں ہوتی بلکہ اس آیت کریمہ کے مطابق:﴿وَعَسَى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ[2]﴾اور قریب ہے کہ کوئی بات تمہیں پسند آئے اور وہ تمہارے حق میں بری ہو۔ بہت سی چیزیں جو طبعاً مرغوب و پسندیدہ ہوتی ہیں عقل و دانش اور دین و دیانت ان کے مضر و خطرناک ہونے کی شہادت دیتی ہے تو ان کا ترک کرنا واجب ہو جاتا ہے مثلاً ایک خوش رنگ سانپ جس کے نقش و نگار دلفریب ہوں دیکھنے میں انتہائی اچھا لگتا ہے لیکن دین و دانش یہ ہر گز اجازت نہیں دیتے کہ اس کو ہاتھ لگائیں کیونکہ اس کو ہاتھ لگانا پیغام موت ہے اسی طرح مرد و عورت کا آپس میں میلان ایک طبعی امر ہے جس پر انسانی معاشرت کے مصالح مبنی ہیں لیکن یہ حد جواز کے اندر ہی مستحسن ہے اور اگر یہ

---

[1].أمالي ابن بشران-الجزء الأول(ص:123)261۔

[2]البقرة:216

جذبہ حدِ اعتدال سے بڑھ جائے اور اس میں میاں بیوی اور غیر مرد و عورت کا امتیاز نہ رہے تو یہی میلان مضر و خطرناک بن جاتا ہے جس کے اسباب و دواعی کی روک تھام واجب ہو جاتی ہے۔

یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مرد اور عورتیں بالکل ایک دوسرے سے جدا رہیں اور ایک دوسرے کے سامنے نہ ہونے پائیں کیونکہ اس سے دنیا کا انتظام قائم نہیں رہ سکتا اور اگر آزادانہ و غیر مشروط اختلاط ہو تو ایسے وصف کے مرد و عورت بھی بہت ہی کم ملتے ہیں جو ایک دوسرے کو دیکھیں اور وہ کشش جو قدرت نے تمدن و معاشرتی مصالح کی بنا پر ان کے دلوں میں پیدا کی ہے اپنا اثر نہ دکھائے اس لئے ضرورت ہوئی کہ مردوں اور عورتوں کے اختلاط و مصاحبت اور ملاقات و مکالمت کے متعلق خاص قانون وضع کیا جائے جس کی بدولت ان شرور کا اندیشہ نہ رہے جو مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول میں مقتضیات طبع کے بے قید اور بے روک ٹوک ہو جانے کے باعث ممکن بلکہ یقینی ہیں، اس شرعی قانون کے ماتحت ستر اور پردے کا حکم ہوا ہے۔

کیا پردہ ترقی کا مانع ہے:

اسلام نے مردوں اور عورتوں کے بے جا میل جول کو ممنوع قرار دے کر ایک حد تک پردہ قائم کر دیا جو عفت و عصمت کا ضامن، معاشرتی اور تمدنی امن کا کفیل ہے۔ جن مذاہب میں پردہ نہیں ہے ان میں عصمت کی حالت ناگفتہ بہ ہے لیکن یورپین تمدن کے دل دادہ مسلمان جو آوارہ مزاج واقع ہوئے ہیں۔ وہ پردے کے سخت مخالف ہیں اور پردے کو محض قید اور حبس بے جا کہتے ہیں۔ وہ مستورات کے کھلا پھرنے، گاڑیوں اور بائیکوں پر سوار ہو کر گول باغ یا ٹھنڈی سڑک پر نکلنے اور اپنے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ پکڑ کر چلنے کو پسند کرتے اور اسی کو تہذیب اور شائستگی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک ہم میں سے پردے کا رواج اور طریقہ دور نہیں ہو گا ہم کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتے ہماری پستی اور تنزل کی اصل وجہ یہی پردہ ہے۔

یہ تمام دعاوی محض یورپ کی طرز زندگی پر فریفتہ ہو جانے والوں کے طبع زاد ہیں، ورنہ حقیقت میں اسلامی پردہ نہ مانع ترقی ہے نہ اس سے ملت اسلام کے قومی عروج میں کوئی رکاوٹ پیدا ہونے کا احتمال ہے اور نہ وہ خواتین اسلام کی تعلیم و تربیت کا مانع ہے جس وقت مسلمان تمام عالم میں عزت و برتری کے واحد مالک تھے، وہ ترقی کی تمام منازل میں دنیا کی ساری بڑی بڑی اقوام سے پیش قدم تھے۔ اسلامی پردہ اس وقت بھی موجود تھا اس زمانہ کی بڑی بڑی عالم و فاضل خواتین کے تذکروں سے کتابیں بھری پڑی ہیں اس وقت مسلم خواتین پروفیسریاں کرتی تھیں، وعظ کہتی تھیں، تلقین و ہدایت کرتی تھیں اور یہ فرائض پس پردہ انجام پاتے تھے۔ مسلم خواتین برقع و نقاب کے ساتھ جنگی مہمات میں حصہ لیتی تھیں اہل فوج کے لئے آپ رسانی کا بندوبست اور مجروحین کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ پیادہ و سوار ہو کر تیغ زنی کرتی تھیں مگر پردہ و حجاب ہر حالت میں لازم سمجھا جاتا تھا جو ان مشاغل سے مانع

نہیں ہو سکتا تھا اور نہ اس وقت کے غیور مردوں کے دلوں میں کبھی اس طرح کے سوال نے جنم لیا کہ پردہ سبب مانع ترقی ہے اور نہ خود ان خواتین نے کبھی وفد بنا کر امیر المؤمنین کے حضور میں یہ درخواست کی کہ ہمیں پردہ سے آزادی ملنی چاہئے۔

بے شک آج مسلمان قوم زوال کی گہرائیوں میں گری ہوئی ہے مگر اس کا ذمہ دار پردہ کو قرار دینا غلط ہے بلکہ اس زوال اور اس کی نحوست کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے دین الٰہی پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم نے اللہ کے باندھے ہوئے قوانین کی پابندی ترک کر دی، جس کی وجہ سے ہم کمزور و ناتواں اور اقوام عالم میں ہلکے ہو گئے۔ اگر پردہ وغیرہ اسلامی مراسم ہماری موجودہ ذلت و پریشانی کا باعث ہیں تو قرون سابقہ کے مسلمان کیونکر ترقی کر گئے تھے جو پردہ نسواں کے شدت کے ساتھ پابند تھے۔

سب سے پہلے تو وہی مسلمین سابقین ان احکامات کے ساتھ مخاطب ہوئے تھے کہ آنکھیں نیچی رکھو، عورتیں جاہلیت کا بناؤ سنگھار نہ کریں، گھروں میں رہیں۔ اگر باہر جانا پڑے تو بالکل ملکر شرم و حیا سے چلیں۔ ان اصحاب نے ان احکام پر اس عمدگی سے عمل کیا کہ آج ہم اس کا عشر عشیر بھی بجا نہیں لاتے اور ساتھ ہی دنیا کو ترقی کی بالاترین منزل پر فائز ہو کر دکھایا۔

پردہ ولباس کی موجودہ صورت حال:

پردہ ولباس کی موجودہ صورت حال مختلف نوعیت کی ہے۔ کہیں کہیں تو شرعی پردہ کیا جاتا ہے اور بہت کم ایسی جگہیں ہیں جہاں صحیح شرعی پردے کی پابندی کی جاتی ہے وگرنہ اکثر مقامات پر تو پردہ کرنا یا تو ان کی رسم ورواج میں شامل ہے جس کو وہ بھرپور طریقے سے نبا رہے ہیں یا پھر ایک فیشن کے طور پر پردہ کا رواج بن چکا ہے۔ جن علاقوں میں پردہ رسم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور جو خواتین اس علاقے کی رسم سمجھ کر پردہ کرتی ہیں وہ جب یورپی ممالک میں جاتی ہیں تو یورپین خواتین سے بھی زیادہ کم لباس پہننا شروع کر دیتی ہیں، جس کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ پردے کا احترام ان کے دلوں میں نہیں ہوتا اور وہ دل سے اس کو ایک شعائر اسلام سمجھ کر نہیں کر رہی ہوتیں بلکہ معاشرہ کے برا بھلا کہنے کے خوف سے وہ ایسا کر رہی ہوتی ہیں یا پھر اپنے بڑوں کے ڈر سے ایسا کر رہی ہوتی ہیں۔ جب ان کو اس خوف سے آزادی ملتی ہے تب ان کے دل کی بات کھل کر سامنے آتی ہے۔ دوسری قسم کی وہ خواتین ہیں جو پردہ کو فیشن کے طور پر استعمال کرتی ہیں اس قسم کی خواتین کا پردہ ان کے موڈ پر اور موجودہ فیشن پر انحصار کرتا ہے۔ اگر موڈ ہوا تو پردہ کر لیا اگر موڈ نہیں تو کوئی پردہ نہیں۔ تیسری قسم کی خواتین وہ ہیں جو کسی غلط کاری میں مبتلا ہیں اور اپنا چہرہ چھپانے کی غرض سے پردہ کرتی ہیں اس طرح کی پردہ کرنے والی خواتین کا بھی کوئی دین ایمان نہیں ہوتا بلکہ حالات کے مطابق ان کا پردہ کرنا اور نہ کرنا بدلتا رہتا ہے۔ چوتھی قسم کی خواتین وہ ہوتی ہیں جو پردہ کو بطور اسلامی شعار کے کرتی ہیں ان کے دل میں اسلام کی اہمیت ہوتی ہے اور یہ اللہ کے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کو پورا کرنے کی وجہ سے پردہ کرتی ہیں اور اس طرح کی خواتین

کے دل کو پھیر ناکافی مشکل ہوتا ہے یہ خواتین وقت وحالات سے متاثر ہو کر پردہ نہیں چھوڑتیں بلکہ یہ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلی جائیں پردہ ان کے ساتھ جاتا ہے اور کیسے بھی حالات ہوں یہ پردہ کرنا نہیں چھوڑتیں۔

موجودہ دور میں پردے کو بدنام کرنے کی جو کوششیں کی جاتی ہیں اور جو خواتین ایسی این جی اوز کا ساتھ دیتی ہیں وہ پہلی تین قسموں والی خواتین ہوتی ہیں جبکہ چوتھی قسم کی خواتین ان کے جھانسے میں نہیں آتیں۔

تنفیذ احکام:

موجودہ حالات کو دیکھ کر جہاں پر مختلف ممالک پردے کے انتہائی خلاف ہیں اور مزید یہ کہ پردے کو ترقی میں رکاوٹ خیال کیا جاتا ہے اور مختلف قسم کی این جی اوز پردے کی مخالفت میں ملک میں کام کر رہی ہیں تو پردے کا سرکاری طور پر نفاذ انتہائی دشوار کام ہے لیکن چند ایسی صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں جن کی وجہ سے پردے کے احکامات کا نفاذ ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ ان میں سے چند صورتیں ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں۔

1. پردے کی صحیح اسلامی تعریف کرنا اور خواتین کو سمجھانا کہ اصل اسلامی پردہ کیا ہے اور وہ کیسا ہوتا ہے۔ عملی طور پر کر کے بتانا اس کے لیے چند خواتین کی خدمات لی جاسکتی ہیں اور ایسے ادارے بنائے جاسکتے ہیں جہاں صحیح اسلامی پردہ ولباس کے بارے میں ان خواتین کو معلومات دی جاسکیں اور پھر عملی طور پر وہ کر کے دیگر خواتین تک اس پیغام کو پہنچائیں۔

2. ممبر و محراب: ممبر و محراب کی اہمیت ہر دور میں لوگوں میں بہت زیادہ رہی ہے اور لوگ علماء کرم کی باتوں کو خاصی توجہ سے سنتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے علماء کرام کو ممبر و محراب سے پردے کی اہمیت بیان کرنی چاہیے اور پردے کے فوائد لوگوں کے سامنے اجاگر کرنے چاہئیں اور بے پردگی کے نقصانات کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا چاہیے۔

3. مختلف ٹی وی پروگرامات اور ڈراموں کے ذریعہ سے لوگوں کے اندر اس بات کو اجاگر کرنا چاہیے کہ پردہ کرنا کسی قسم کی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہے اور مسلمان خواتین اصل لباس پہن کر اس کو رواج دیں اور معاشرے کو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

4. میرا جسم میری مرضی والی خواتین کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے اور ایسے پروگرامات پر پابندی عائد کرنی چاہیے۔

فصل ثانی: سوشل میڈیا

فصل ثانی: سوشل میڈیا

دور جدید میں سوشل میڈیا انسانوں کے باہمی روابط کا سب سے تیز ترین اور بہترین ذریعہ ہے اور آج آدھی سے زیادہ دنیا اس سے مستفید ہو رہی ہے اس لئے ضروری ہے کہ سوشل میڈیا کی تعریف کی جائے اور اس کی حدود بیان کی جائیں اور اس کے استعمال کا صحیح طریقہ بیان کیا جائے اور اس کی خوبیاں، خامیاں، فوائد اور نقصانات کی نشاندہی کی جائے، چنانچہ سب سے پہلے ہم سوشل میڈیا کی تعریف کرتے ہیں۔

سوشل میڈیا کی تعریف:

سوشل میڈیا ایک ایسی آن لائن میگزین ہے جو روایتی میڈیا کے خلاف بات چیت کرتے ہوئے گفتگو کرتی ہے، جو مواد فراہم کرتا ہے لیکن قارئین/ناظرین/سنڈروں کو مواد کی تخلیق یا ترقی میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا۔[1]

رون جونز سوشل میڈیا کی تعریف کچھ ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں: "سوشل میڈیا بنیادی طور پر آن لائن میڈیا کی ایک قسم ہے جہاں لوگ بات کر رہے ہیں، شرکت، اشتراک، نیٹ ورکنگ اور آن لائن بک مارکنگ کرتے ہیں." سماجی اشتراک کی سائٹس جیسے یوٹیوب اور فلکر سماجی نیٹ ورکوں جیسے لنکڈ اور فیس بک جیسے سوشل نیٹ ورک کی ایک وسیع اقسام ہیں۔[2]

جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں سوشل میڈیا کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ہم اپنی زندگی کا اکثر وقت سوشل میڈیا کی نظر کر رہے ہیں اور اس کے بہت سے نتائج ہمارے سامنے ابھر کر آ رہے ہیں جو غور طلب ہیں۔ ہم بڑی آزادی کے ساتھ جو چاہتے ہیں سوشل میڈیا پر تحریر کر لیتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا یعنی ہمیں آزاد فضاء میسر ہے۔[3] اصل میں سوشل میڈیا ہمارے لیے تمام فکری نظریات کو آزادانہ طور پر اور بغیر کسی رقم کی ادائیگی کے پیش کرنے والے ایک سٹیج کی حیثیت رکھتا ہے[4]۔

---

[1] سوسن وارڈ، **سوشل میڈیا کی تعریف**، Error! Hyperlink reference not valid.

[2] ایضاً

[3] TRT یہ ٹرکش ریڈیو اینڈ ٹیلی ویژن کارپوریشن کی سرکاری ویب سائٹ ہے۔ - https://www.trt.net.tr/urdu/slslh-wr-prwgrm/2019/08/21/tjzyh-34-swshl-myddy-1256173

[4] ایضاً

سوشل میڈیا کی اہمیت:

زمانہ قدیم سے لوگ حالاتِ حاضرہ سے آگاہی کے لیے اور انٹرٹینمنٹ کے مختلف ذرائع پر انحصار کرتے آئے ہیں جن میں سے ماضی قریب کا سب سے زیادہ استعمال ہونے والا ذریعہ ریڈیو تھا۔ جس کے ذریعہ لوگ حالاتِ حاضرہ سے آگاہی حاصل کرتے تھے اور تفریح کا سامان بھی تھا۔ پھر اس کے بعد اخبار اور ٹی وی کا دور آیا جس سے آواز کے ساتھ ساتھ تصویر کے ذریعہ بھی آگاہی اور تفریح کا سامان میسر آیا پھر مزید ترقی کرتے ہوئے ان ذرائع نے کمپیوٹر اور موبائل کی صورت میں ہمارے لیے آگاہی جستجو اور انٹرٹینمنٹ کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ میڈیا نے آج دنیا کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے اور اس کی نئی نئی شکلیں روز بروز سامنے آرہی ہیں۔ ایک دوسرے کو اس میدان میں پیچھے چھوڑنے کے لیے پوری طرح کمربستہ ہیں۔ پاکستان میں بھی میڈیا نے اپنے پنجے بڑی دل جمعی کے ساتھ گاڑے ہوئے ہیں۔[1]

میڈیا میں آئے دن نئے نئے اخبارات اور رسائل کے ساتھ ساتھ مختلف نیوز چینلز بھی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ اگرچہ میڈیا پاکستان کے موجودہ نامساعد حالات کے پیش نظر دن بدن اونچی اُڑان اُڑ رہا ہے مگر جب بات سوشل میڈیا کی آتی ہے تو عجب دنیا کے قصے کہانیاں سامنے آتے ہیں۔ فیسک بک (Facebook) اور ٹویٹر (Twitter) جیسی سوشل ویب سائٹس نے انٹرنیٹ کی دنیا میں تہلکہ مچایا دیا ہے یہ سائٹس ایک طرف تفریح کا بہترین ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی معلومات تک رسائی کا ذریعہ بھی بن چکی ہیں۔ یہ سائٹس کبھی کبھی مختلف حوالوں سے موضوع بحث بن کر پابندیوں کی زد میں بھی آجاتی ہیں اور پابندیاں بھی دن بدن ان کی مقبولیت میں اضافہ کا باعث بن جاتی ہیں۔ نوجوان نسل کی عقلوں پر اس کا بھوت پوری طرح سوار ہو چکا ہے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پورے دن کی تھکاوٹ کے باوجود جب تک رات کو سوشل میڈیا استعمال نہ کرلیں نیند نہیں آتی۔[2]

سوشل ویب سائٹس ایک طرف تو دوستوں سے بات چیت کرنے کا بہترین اور آسان ترین ذریعہ ہیں تو دوسری طرف بہت سی معلومات کے حصول کا سہل ترین ذریعہ بھی ہیں۔ کتابیں، مقالات، آرٹیکلز، رسالے، اخبارات اور معلوماتی ویڈیوز وغیرہ باآسانی ہر وقت اور ہر ایک کو ان سائٹس کے ذریعہ میسر آجاتی ہیں۔ سوشل میڈیا اچھائیوں کو پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے لیکن کم قسمتی سے ہمارے وطن میں صرف بُرائیوں کو بیان کرنے کا رواج ہے۔[3]

---

[1] سیدہ کنول زہرہ زیدی، **سوشل میڈیا کی اہمیت**، 18 فروری 2013ء https://www.express.pk/story/92639/

[2] ایضاً

[3] سیدہ کنول زہرہ زیدی، **سوشل میڈیا کی اہمیت**، 18 فروری 2013ء https://www.express.pk/story/92639/

سوشل سائٹس پر نوجوان تفریح کے ساتھ ساتھ بہت سے مثبت کام بھی کرتے ہیں۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور اپنے حق کی خاطر جد وجہد بھی کرتے ہیں۔ آج آزاد میڈیا کی بدولت لوگ حکمرانوں، سیاست دانوں اور سرمایہ داروں سے اپنا حق وصول کرنے کے لیے آواز بلند کرتے ہیں اور مختلف ایشوز جیسے مہنگائی، ظلم، کرپشن، بدعنوانی، لوڈشیڈنگ اور گیس وغیرہ کی بندش کو ریگولر کرنے کے لیے سوشل میڈیا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ بات ذمہ داری سے کہی جاسکتی ہے کہ ملک میں مثبت تبدیلی لانے میں سوشل میڈیا اہم کردار ادا کرے گا۔ "انشاءاللہ آج کے نوجوان ریگولر اور سوشل میڈیا کے ذریعے ہی کل کے بہترین پاکستان کی تعمیر کرینگے[1]۔"

سوشل میڈیا اور سماجی ذمہ داریاں:

ایک وقت تھا کہ انٹرنیٹ کی ٹیکنالوجی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور سوشل میڈیا کا رواج نہیں تھا اس وقت خبروں کا سب سے بڑا ماخذ اخبارات تھے یا پھر ریڈیو اور ٹیلی ویژن۔ ریڈیو ٹیلی ویژن بھی بریکنگ نیوز کے جھنجھٹ سے آزاد تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اخبارات کے ساتھ ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا دائرہ کار بھی سکڑ رہا ہے۔ انٹرنیٹ پر چلنے والی موبائل ڈیوائسز ٹی وی کی روایت کو متروک کر رہی ہیں۔ اطلاعات کا طوفان اس قدر منہ زور ہے کہ اس سے بچنا محال ہے۔ ترقی پذیر معاشروں میں فیس بک، ٹوئٹر، انسٹا گرام اور ٹک ٹاک ایک نشے کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اس نشے کا شکار نوجوان نسل زندگی کی ان حقیقی رنگینیوں سے واقف نہیں جو ہمارے سے پہلی نسل کا نصیب تھیں۔ ٹیکنالوجی نے دنیا کو یکسر بدل دیا ہے۔ اس تبدیلی کو اپنی معاشی اور سماجی ضروریات کے مطابق ڈھالنا ہی فن ہے۔ لیکن افسوس ہم نے سوشل میڈیا سے دوسروں کی تضحیک، عزت داروں کی پگڑیاں اچھالنے اور ٹوٹے دیکھنے کے سوا ڈھنگ کا کوئی کام نہیں لیا۔[2]

کوئی بھی جدید ٹیکنالوجی کی اہمیت کا منکر نہیں اور نہ ہی سوشل میڈیا کو مطعون کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ سوشل میڈیا کے کچھ فوائد بھی ہیں بلکہ یہ فوائد کچھ سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس زیادہ کا انحصار اس کے استعمال پر ہے۔ بلکہ معاشرے میں پنپتے ''اُبال'' کو ٹھنڈا کرنے میں سوشل میڈیا کا کردار بڑھتا جا رہا۔ معاشرتی اور معاشی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کے لئے اس ''اُبال'' کا ہونا بہت ضروری ہے۔

---

[1] سیدہ کنول زہرہ زیدی، **سوشل میڈیا کی اہمیت**، 18 فروری 2013ء https://www.express.pk/story/92639/

[2] خواجہ محمد کلیم، **سوشل میڈیا اور سماجی ذمہ داریاں**، **ہم سب**، 26 فروری 2020ء https://www.humsub.com.pk/302040/khawaja-kaleem-106/

سوشل سائنسز کا ایک اصول ہے کہ معاشرے میں معمولی بے چینی برقرار رہنی چاہئے تاکہ معاشرے میں حرکت کا اندازہ اس کی زندگی کی ضمانت بنا رہے۔ ہمارے ہاں یہ بے چینی بہت زیادہ ہے لیکن اس کو مثبت تبدیلی کی خاطر ''چینلائز'' کرنے کا کوئی نظام سرے سے موجود ہی نہیں۔ کوئی مسئلہ ہو، کوئی واقعہ رونما ہو جائے، کوئی سماجی تہوار ہو یا خدانخواستہ کوئی سانحہ وقوع پذیر ہو پوری قوم چڑھ دوڑتی ہے۔ فیس بک یا ٹوئٹر وغیرہ دیکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ ہمارے معاشرے کے تمام تر مسائل حل ہو چکے ہیں اور اگر یہ معاملہ شام تک نبٹا نہ لیا گیا تو پوری قوم کو ہلاکت خیزی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ فیس بک کی بعض پوسٹس اور ٹوئٹر کے بعض ٹرینڈ تو پوری دنیا میں ایسے پھیلتے ہیں جیسے کوئی وبائی مرض۔ دو چار دن کی مارا ماری کے بعد کسی نئی خبر کی بنیاد پر، کسی نئے مسئلے کی آڑ میں ایک اور طوفان اٹھتا ہے تو پہلا مسئلہ ایسا گم ہوتا ہے جیسے دنیا میں اس کا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔ مقام شکر ہے کہ ففتھ جنریشن وار میں کچھ وقفہ آیا ہے ورنہ کچھ ہفتے پہلے تک یوں گمان ہوتا تھا کہ ففتھ جنریشن وار ایجاد ہی ہمارے لئے ہوئی ہے۔

اس رویے کا نقصان یہ ہے معاشی یا معاشرتی مسائل کے سدھار کے لئے جس توانائی کی ضرورت ہوتی ہے وہ سوشل میڈیا پر ضائع ہو جاتی ہے۔ مسائل تو حقیقی زندگی میں درپیش ہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ سوشل میڈیا پر لمبے چوڑے وعظ، بلند و بانگ دعووں یا گیدڑ بھبکیوں سے کسی مسئلے کو سلجھا لیا جائے۔ مسائل کے حل کی واحد کنجی درست سمت میں اپنے ہدف کے مطابق انتھک محنت ہے۔ کامیابی کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے۔ کامیابی صرف اور صرف خلوص نیت کے ساتھ محنت سے ملتی ہے۔ یہ ایسا پودہ ہے جسے ہرا بھرا رکھنے کے لئے روزانہ خون جگر سے آبیاری درکار ہے۔

ہم اگر تھوڑا سا ماضی میں جھانکیں اور اپنی فیس بک ٹائم لائن کو ایک نظر غور سے دیکھیں تو ہمیں وہاں بہت سی قبریں بنی ہوئی ملیں گی۔ ان قبروں میں وہ مسائل دفن ہیں جو معاشرے کو درپیش ہیں۔ ان قبروں میں وہ محرومیاں محبوس کر دی گئی ہیں جو معاشرے کے مختلف افراد یا گروہوں کا مقدر رہیں۔ ان قبروں میں سماج کے افراد کی امیدیں دفن ہیں جو کبھی بر نہ آئیں۔ اس لئے کہ امیدوں کے بر لانے میں بہر حال محنت کا دخل ہے اور محنت فیس بک کی دنیا سے باہر نکلنے پر ہی ممکن ہو گی۔ کچھ قبریں مذہبی یا مسلکی اختلافات کی بھی ہوں گی۔ ہم میں سے اپنے تئیں ہر انسان مذہب، سماج، معیشت، سیاست سمیت ہر موضوع کا ارسطو ہے۔ لیکن اس ارسطو کی زندگی صرف چار دن کی ہے۔ جب تک کوئی نیا موضوع ہاتھ نہ آجائے۔ ایسے میں تعصبات کی اسیری نے بھی ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ سوشل میڈیا پر کوئی تعمیری بحث آٹے میں نمک کے برابر ہی ہو گی۔ طویل مگر لایعنی گپ شپ، ہنسی مذاق اور ایک دوسرے کا ٹھٹھہ اڑانا ایسے مشاغل ہیں جن میں پاکستانی قوم ید طولیٰ رکھتی ہے۔ اس بارے اگر کوئی عالمی مقابلے کا اہتمام کرے تو مجھے کوئی شک نہیں کہ ہم اس ورلڈ کپ کے مستقل مستحق ٹھہریں گے۔ سوشل میڈیا کا استعمال ہر گز برا نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ سوشل میڈیا کے استعمال کے مقاصد کیا ہیں؟ یاد رکھیے ہتھوڑا مکان کی تعمیر یا دیوار گرانے کے لئے بنایا گیا ہے۔

ہتھوڑے کو اگر کسی کا سر کچلنے کے لئے استعمال کیا جائے تو اس میں ہتھوڑے کا کوئی قصور نہیں ہے"۔آپ بھی اسی فارمولے کے تحت سوشل میڈیا کا استعمال ضرور کیجئے لیکن تعمیری اطلاعات تک رسائی، سوشل میڈیا پر موجود مختلف شعبوں کے ماہرین کے ساتھ رابطہ، حالات حاضرہ سے آگاہی یا تنقیدی فکر کے ساتھ مختلف مسائل کا تجزیہ، کچھ ایسے مقاصد ہو سکتے ہیں جو سوشل میڈیا کے استعمال کو تعمیری بنا سکتے ہیں۔ غیر ضروری موضوعات میں الجھنا نہ صرف اپنی توانائیوں کا ضیاع ہے بلکہ منتشر خیالی کو بھی جنم دیتا ہے[1]۔

سوشل میڈیا اور اس کے فوائد:

انسانی معاشرے میں آج کل سوشل میڈیا کا استعمال روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ سوشل میڈیا کا مثبت استعمال معاشرہ کے لیے مفید بھی ہے اور اس کا منفی استعمال انتہائی نقصان دہ بھی ہے ۔ ذیل میں ہم جائزہ لیتے ہیں کہ سوشل میڈیا کا درست استعمال کیسے کیا جائے۔

1-سوشل میڈیا ہمارے آپس میں رابطے کا بہترین، سستا اور آسان ترین ذریعہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنے رشتہ داروں، عزیز واقارب اور دوست احباب سے وڈیو کال کے ذریعے رابطہ کر سکتے ہیں۔

2۔اگر آپ پڑھائی کے شوقین ہیں تو سوشل میڈیا پر لاکھوں موضوعات پر چینل، ویب سائیٹس، کتابیں اور آرٹیکلز دستیاب ہیں جن کو آپ آن لائن بھی پڑھ سکتے ہیں اور ویب سائٹس سے ڈاونلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

3۔سوشل میڈیا کو بہت سارے لوگ نیک کاموں کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مختلف ایپلیکیشنز کے ذریعے آن لائن درس وتدریس کا سلسلہ آج کل عروج پر ہے۔ قرآن پاک کی تعلیم کے لیے اور دینی مسائل کے حل کے لیے سوشل میڈیا کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ لوگ گھروں میں بیٹھ کر دینی تعلیمات حاصل کرتے ہیں اور شرعی مسائل میں علماء کرام سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

4۔سوشل میڈیا ایک علاقے کے مسائل کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے میں بہت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ وہ مسائل جن کی بڑے اور مشہور ٹی وی چینلز تک رسائی میں کافی مشکلات ہوتی ہیں اور کافی وقت درکار ہوتا ہے وہ سوشل میڈیا کے ذریعے ہر جگہ سے باآسانی لوگوں تک پہنچائے جا سکتے ہیں اور ان کے حل کے لیے عملی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔

---

[1] سوشل میڈیا کے فوائد: - https://www.naibaat.pk/27-Feb-2020/29903

5۔اگر کسی بندے کے پاس کوئی ہنر موجود ہے تو وہ سوشل میڈیا کے ذریعے لوگوں تک اس کو شیئر کر سکتا ہے تاکہ لوگ اس سے فائدہ اٹھاہیں اور وہ لوگوں سے فائدہ حاصل کرئے۔

6۔سوشل میڈیا کی ذریعے دوسروں کے کلچر سے بھی آسانی سے آگاہی حاصل ہو سکتی ہے اور لوگ اپنی پسندیدہ شخصیات سے اس کے ذریعے منسلک ہو سکتے ہیں۔

7۔سوشل میڈیا کی ذریعے دنیا کے حالات سے آگاہی منٹوں میں حاصل ہو جاتی ہے۔چاہے دنیا کے کسی بھی کونے میں کوئی حادثہ رونما ہو سوشل میڈیا کے ذریعے وہ جنگل کی آگ کی طرح فوراً ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتا ہے۔

8۔سوشل میڈیا آج کل کے دور میں کمائی کا بھی بہترین ذریعہ بن چکا ہے۔لوگ گھر بیٹھ کر سوشل میڈیا کے ذریعہ لاکھوں کماتے ہیں اور انھیں اس کے لیے کوئی زیادہ مشقت بھی نہیں اٹھانی پڑتی[1]۔

سوشل میڈیا کے نقصانات:

سوشل میڈیا کے نقصانات اس کے فوائد سے کہیں بڑھ کر ہیں اور اس کا استعمال "واثمها اكبر من نفعها" کے مترادف ہے کیوں کہ ستانوے فیصد میڈیا آج یہود کے قبضہ میں ہے جن کے مقاصد یہ ہیں:

1- ہر چیز میں میوزک کو اتنا تیز اور عام کر دیں کہ لوگوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ماءوف ہو جائے اور لوگ سائنسی ٹیکنالوجی میں اپنا لوہا منواتے رہیں۔

2- اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنا اور ان کو نقصان پہنچانے کے لیے عملی اقدام سے بھی دریغ نہ کرنا۔لوگوں کے پسندیدہ معاشرہ کی کردار کشی کرنا تاکہ لوگ اس سے متنفر ہو جائیں۔

3- لوگوں کو ذہنی غلام بنانے کے لیے اقدامات کرنا تاکہ لوگ ہر کام کو مخلوق کی طرف یعنی امریکا کی طرف منسوب کرنے لگیں۔

4- جنسی بے راہ روی کو عام کرنا۔اس کام کے لیے فلموں،ڈراموں اور دیگر پروگراموں کو استعمال کرنا اور اس کو اظہار رائے کی آزادی قرار دینا۔

آج پوری دنیا میں یہودی افکار و نظریات کا پرچار کرنے اور ان کو فروغ دینے کے لیے الیکڑانک، پرنٹ اور سوشل میڈیا کا استعمال کیا جارہا ہے۔لادینیت کو عام کیا جارہا ہے۔اور ہر آدمی اتنا مصروف ہو چکا ہے کہ کسی سے ملاقات کرنا یا کسی مریض کی عیادت کرنا

---

[1] سوشل میڈیا کے فوائد:27دسمبر2020 - https://www.newzflex.com/4153

تو دور کی بات اپنے گھر میں بھی ایک دوسرے سے بات چیت کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو گیا ہے۔ سوشل میڈیا نے لوگوں کو قریب ہونے کے باوجود دور کر دیا ہے۔ اسی طرح سوشل میڈیا نے سچ اور جھوٹ کی تمیز کو ختم کر دیا ہے۔ سوشل میڈیا کی وجہ سے غیروں کا کلچر ہمارے اندر سرایت کر چکا ہے۔ بے حیائی، فحاشی، عریانی بے باکی اور بے پردگی عام چکی ہے اور دینی اور معاشرتی غیرت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ سوشل میڈیا کے ذریعے ہمارے نظریات پر حملہ کیا جارہا ہے۔ ہزار خرابیوں کے باوجود اس کی لت ایسی پڑ چکی ہے کہ اس کے استعمال کے بغیر زندگی ادھوری معلوم ہوتی ہے اور ایک منٹ بھی اس کے بغیر گزارنا مشکل لگتا ہے۔[1]

سوشل میڈیا اور پیمرا کی ذمہ داریاں:

ویسے تو ہمارا میڈیا مکمل طور پر غیروں کے قبضہ میں ہے اور اس پر وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتے ہیں اور جو کچھ ان کی خواہش کے بر خلاف ہو اسے فوراً ماؤف کر دیا جاتا ہے لیکن اگر سوشل میڈیا کے نقصانات کو انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ صرف مسلمان گھرانوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ انسانیت کے لئے نقصان دہ ہیں اس لئے اس کے اندر اصلاحات ہر انسان کے لئے بلا تفریق مذہب و دین کے ضروری ہیں۔ ذیل میں چند سفارشات پیش کی جاتی ہیں جن کو اپنا کر اس کے نقصانات پر کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

1 پیمرا کو چاہیے کہ وہ سوشل میڈیا کی مکمل نگرانی کرے اور اسلام کے خلاف استعمال ہونے والی سب سائٹ کو بلاک کر دے۔

2. جنسی بے راہ روی کو پھلانے والی تمام سائٹس مکمل طور پر بند کر دینی چاہئے اور ٹک ٹاک جیسی ایپس کے اوپر بھی پابندی عائد ہونی چاہئے۔

3. وٹس ایپ، امو وغیرہ جیسے تمام ایپس بند کر کے اس کی جگہ ایسے ایپس کو لانچ کیا جائے جو ملک کے کنٹرول میں ہوں تاکہ کوئی کسی کی جاسوسی نہ کر سکے۔

4. وقتاً فوقتاً سکولوں اور کالجوں میں ایسے پروگرامات کیے جائیں جن کے ذریعے سے نیو جنریشن کو سوشل میڈیا کے غلط استعمال سے پیدا ہونے والے نقصانات سے آگاہ کیا جائے۔

5. والدین اور سرپرستوں کے لئے پروگرام لائے جائیں جن میں انہیں اپنے بچوں کی مثبت نگرانی اور ان سے غلط ایکٹیویٹیز کو مانیٹر کرنے کے طریقے سکھائے جائیں۔

---

[1] نوساری، مفتی صدیق احمد، **انٹرنیٹ 'سوشل میڈیا' کتنا مفید اور کتنا مضر؟** گجرات، انڈیا، 14 ستمبر 2019ء
http://sunnionline.us/urdu/2019/09/13307

خلاصہ:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آج ٹیکنالوجی کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں سوشل میڈیا کا راج ہے ہر کوئی اس میں مصروفِ عمل ہے۔ لوگوں کی ترجیحات بدل چکی ہیں ہر کوئی سوشل میڈیا کے ذریعے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہے اور بہت حد تک کامیاب ہو رہا ہے۔ حقیقت میں سوشل میڈیا نے جہاں لوگوں کی زندگیوں کو آسان بنایا ہے وہاں بہت سی مشکلات بھی کھڑی کی ہیں۔ اس لیے سوشل میڈیا کا استعمال کرتے ہوئے اس کے مضر اثرات سے اپنے کو بچانا بھی از حد ضروری ہے ورنہ فائدہ کے بجائے نقصان یقینی ہے۔ انسان کا وقت بھی اور زندگی بھی برباد ہو جاتی ہے۔ اگر دینی کاموں کے لیے اور حق کے پرچار کے لیے استعمال کیا جائے تو دنیا اور آخرت دونوں میں فائدہ مند ثابت ہو گا۔

فصل ثالث: جنسی مصنوعات کی فروخت

فصل ثالث: جنسی مصنوعات کی فروخت

اللہ رب العزت نے انسان کو اس جہانِ فانی میں پیدا فرما کر اس کی تمام ضرورتوں کا بھی انتظام فرمایا ہے۔ انسان کی بنیادی ضروریات میں سے رہائش، کپڑا کے علاوہ کھانا، پینا اور جنسی خواہشات کی تکمیل ہے۔ ان ضروریات کی تکمیل کے لیے ایک خاص نظام دیا ہے اور اس کی خاص حدیں مقرر فرمائی ہیں۔ اور یہی وہ حدّیں ہیں جن کی پاسداری انسان کو دوسری تمام مخلوقات سے اشرف بناتی ہیں ورنہ یہ ضروریات اللہ تعالیٰ نے جانوروں کے ساتھ بھی رکھی ہیں لیکن ان کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی۔ وہ جب چاہیں، جہاں سے چاہیں اور جتنا چاہیں کھائیں پیئں اور جہاں سے چاہیں اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کریں ان سے کوئی پوچھ نہیں ہو گی۔ یہ کھانا، پینا اور جنسی خواہش ہر انسان کی فطری ضرورت ہے۔ جس طرح ہر انسان کو بھوک لگتی ہے اور پیاس بھی لگتی ہے اسی طرح اس میں جنسی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح کھانا پینا انسان کو صحت مند، تندرست و توانا رکھتا ہے اسی طرح جنسی خواہش کی تکمیل سے اسے قلبی اور ذہنی سکون میسر آتا ہے۔ اس لیے اسلامی شریعت نے انسان کی ان بنیادی ضروریات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اسے نہ کھانے پینے سے روکا ہے نہ ہی جنسی خواہشات کی تکمیل پر کوئی پابندی عائد کی ہے۔ البتہ اس کی کچھ حدیں مقرر کی ہیں۔ یہ چیزیں تم کھا پی سکتے ہو، یہ تمہارے لیے جائز اور حلال ہیں اور یہ چیزیں کھانا، پینا تمارے لیے حلال اور جائز نہیں۔ اسی طرح جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے نکاح کا ایک نظام دیا ہے کہ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ دو دو کرو تین تین کرو چار چار کرو کوئی پابندی نہیں ہے اگر انصاف کر سکتے ہو تو اور ارشاد فرمایا:

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً---[1]﴾ اور یہ اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ پیدا کیے تمہارے لیے تمہاری جنس سے جوڑے تاکہ تم اُن سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبّت اور رحمت پیدا کی۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں سوچنے والوں کے لیے۔

اس آیت کریمہ میں انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت کی تکمیل کے جائز طریقے کو ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اللہ کا تمہارے اوپر بڑا احسان ہے اس نے تم میں سے ہی تمہاری تسکین کا سامان کیا ہے۔ تمہاری بیوی تمہاری ہی جنس سے ہے اور اگر کسی مخالف جنس سے ہوتی تو تمہیں اس سے دلی تسکین حاصل نہ ہو سکتی کیوں کہ تمہارا اس کی طرف طبعی میلان نہ ہوتا اور نفرت پیدا ہو جاتی یہ اس کی خاص رحمت ہے کہ اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی کے جذبات کو پروان چڑھایا ہے۔ یہ اللہ کی خاص نشانیوں میں

---

[1] الروم: 21

سے ایک نشانی ہے۔ اگر کافر لوگ اس میں غور و فکر کریں گے تو خالق کائنات کی معرفت کو حاصل کر لیں گے۔[1] ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ رب العزت نے جنسی خواہش کی جائز تکمیل کو ذہنی سکون کا ذریعہ بنایا ہے اور یہ ذہنی سکون تب ہی حاصل ہو گا جب یہ خواہش کی تکمیل جائز اور حلال جگہ پر ہو اور اگر ناجائز اور حرام جگہ پر ہو گی تو یہ خواہش کی تکمیل ذہنی سکون اور اطمینان کا باعث نہیں ہو گی بلکہ بے چینی اور بے اطمینانی کا باعث ہو گی۔ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہی معاشرہ پر سکون ہو سکتا ہے اور اگر اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کیا جائے گا تو معاشرے میں بے اطمینانی، بے سکونی اور بے چینی کی فضاء پیدا ہو گی۔ اسی لیے آج مغربی معاشرے میں زندگی بسر کرنے والے ذہنی سکون اور اطمینان کی نعمت سے محروم نظر آتے ہیں۔ حالانکہ وہ جدید ٹیکنالوجی اور نیاوی علوم و فنون کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔ مال و دولت اور سامان عیش و عشرت کی فراوانی ہے۔ اس بے سکونی کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے صرف جنسی تسکین کو ہی ہدف بنایا ہوا ہے اور عورت کو جنسی کھلونا سمجھ کر بے توقیر کیا جا رہا ہے اور مرد جب چاہے کسی عورت کے ساتھ اس کی رضامندی سے تعلقات قائم کر سکتا ہے، بلکہ مغربی معاشرے میں جنسی ہوس اب اس قدر بڑھ چکی ہے کہ انھوں نے بے حیائی کی ساری حدیں پار کر لی ہیں اور انسانیت کو شرما دیا ہے۔ ہم جنس پرستی کو قانونی جواز فراہم کیا گیا ہے۔ مرد، مرد سے اور عورت، عورت سے اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کر رہی ہے، خاندانی نظام تباہ ہو چکا ہے، اس پر مستزاد یہ کہ اب جنسی ہوس کو مٹانے کے لیے جنسی کھلونے استعمال کیے جا رہے ہیں اور جنسی کھلونوں کی باقاعدہ صنعتیں قائم ہیں جو روزانہ نت نئے پراڈکٹس تیار کر رہی ہیں اور معاشروں کو بے حیائی کے ذریعے تباہی کے دھانے پر لے جا رہی ہیں۔ مغرب کی تقلید میں اب اسلامی ممالک میں بھی جنسی مصنوعات بازاروں میں فروخت ہو رہی ہیں اس فصل میں ہم اس بات کا تجزیہ کریں گے کہ اسلام کی رو سے ان مصنوعات کا استعمال، اور ان کے کاروبار کا کیا حکم ہے؟ اس کی حدود کیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں ریاست کی ذمہ داری کیا ہے؟

جنسی صنعت:

سب سے پہلے جنسی صنعت کی تعریف کریں گئے تاکہ قارئین کو مذکورہ فصل کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ جنسی صنعت یا سیکس انڈسٹری کا اطلاق ان تمام کاروباروں پر ہوتا ہے جن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر جنسی اعمال کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ گاہکوں کو

---

[1] الرازی، فخر الدین، **تفسیر کبیر**، 9/91-92

جنسی خدمات یا جنسی مصنوعات فراہم کرتے ہیں یعنی بالغ افراد کو جنسی تسکین کی تفریحات مہیا کرتے ہیں۔ جن میں جسم فروشی کے اڈے، نائٹ کلب، ہوسٹیس کلب، جنسی کھلونے، فحش لٹریچر، سیکس چینلز، مووِیز اور جنسی روبوٹس وغیرہ شامل ہیں۔

ساری دنیا میں یہ صنعت بہت تیزی سے فروغ پا رہی ہے جس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت سے ممالک میں اس کو قانونی طور پر جائز قرار دیا گیا ہے اور اس کو کوئی معیوب بات تصور نہیں کیا جاتا جس کا مشاہدہ عام مغربی سوسائٹی میں ہوتا ہے کہ جہاں عریانیت عام ہے اور ہم جنس پرستی کو بھی قانونی جواز حاصل ہے۔ عریاں فحش اور برہنہ تصاویر ہر جگہ آویزان ہیں۔ جنسی کھلونے اور کنڈوم، سیکس مووِیز اور دیگر مواد سر عام فروخت ہو رہا ہے۔ جگہ جگہ قحبہ خانے قائم ہیں اور یہ سب کچھ روشن خیالی کی آڑ میں حکومتی سرپرستی میں سر عام سرانجام پا رہا ہے۔[1]

جنسی کھلونے یا سیکس ٹائیز ایسی مصنوعات ہیں جو جنسی لذت کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں جن میں زیادہ مشہور سیکس ڈولز یعنی جنسی گڑیا، اندام نہانی اور آلہ تناسل وغیرہ ہیں اور ان کے علاوہ اور بھی دسیوں ارتعاش پذیر اور غیر ارتعاش پذیر آلات جنہیں جنسی ٹولز کہا جاتا ہے مارکیٹ میں وافر مقدار میں دستیاب ہوتے ہیں۔ ان کھلونوں کا استعمال اکیلے میں بھی کیا جاتا ہے اور پارٹنر کے ساتھ بھی تاکہ جنسی تعلق کو مزیدار بنایا جائے۔ بہت سے مشرقی ممالک میں آج بھی ان ٹولز کی خرید و فروخت اور استعمال کو معیوب، حیاء کے منافی اور دین و شریعت کے منافی سمجھا جاتا ہے۔[2]

جنسی مصنوعات کی فروخت:

جنسی مصنوعات کے اندر بے شمار اشیاء آتی ہیں جن میں سے کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی خرید و فروخت جائز ہے اور اکثر چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی خرید و فروخت ناجائز ہے لیکن بہت سی ایسی ناجائز چیزیں بھی ہیں جن کی خرید و فروخت بعض شرائط کے ساتھ جائز ہے یا بعض حالات میں جائز ہے۔ چنانچہ اس فصل میں ہم مذکورہ تینوں قسم کی چیزوں کو الگ الگ کر کے بیان کریں گے، لیکن پہلے اس بات کو سمجھنا بھی بہت ضروری امر ہے کہ بہت سی چیزیں ذاتی طور پر جائز ہوتی ہیں لیکن بعض وجوہات کی وجہ سے ناجائز ہو جاتی ہیں مثلاً صابن، تولیہ وغیرہ ضروری چیزیں ہیں لیکن اگر ان پر تصاویر لگی ہوں تو تصاویر والی چیزیں خرید ناجائز نہیں ہے اور اگر مجبوری میں خرید لی ہیں اور ان تصاویر کو فوراً ختم کر دینا چاہیے اور گھر پر ان تصاویر والی چیزوں کو نہیں رکھنا چاہیے، چنانچہ دار العلوم دیوبند والوں کا اس پر باقاعدہ فتویٰ ہے جو کہ ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[1] https://ur.wikipedia.org/wiki

[2] https://www.plannedparenthood.org/learn/sex-pleasure-and-sexual-dysfunction/sex-and-pleasure/sex-toys

"ایسی مصنوعات جن پر تصاویر آویزاں ہو لیکن وہ تصاویر مبہم ہوں نظر آنے میں واضح اور صاف نہ ہوں تو ان مصنوعات کی بیع وشراء کی گنجائش ہے لیکن اگر تصاویر بلکل نمایاں اور واضح ہوں تو ایسی کاری گری کرنا ان کو بیچنا اور خرید ناسب ناجائز اور حرام ہے اس لیے وہ تمام مصنوعات جن پر جانداروں کی تصاویر بنی ہوتی ہیں جیسے جانوروں کی تصاویر، بچوں کی تصاویر اور مرد وخواتین کی تصاویر بڑی نمایاں بنی ہوتی ہیں ان کا لینا دینا جائز نہیں ہے۔ اگر کسی نے بامر مجبوری ایسی کوئی چیز خرید لی جس پر تصویر آویزاں ہے ے تو وہ فوری طور پر اس کو مٹا دے، اور یہ بھی واضح رہے کہ اگر وہ تصاویر مقصود بالذات نہ ہوں تو ان مصنوعات کے تابع ہو کر جواز کی گنجائش ہو گی صرف مجبوری کی صورت میں لیکن ضروری ہے کہ اس کی تعظیم نہ ہو بلکہ تذلیل کے طور اس کو استعمال کرئے۔"[1]

علامہ محمد بن علي علاءالدين الحصكفي درالمختار میں فرماتے ہیں:

(وَلُبْسُ ثَوْبٍ فِيهِ تَمَاثِيلُ) ذِي رُوحٍ، وَأَنْ يَكُونَ فَوْقَ رَأْسِهِ أَوْ بَيْنَ يَدَيْهِ أَوْ (بِحِذَائِهِ) يَمْنَةً أَوْ يَسْرَةً أَوْ مَحَلَّ سُجُودِهِ (تِمْثَالٌ) وَلَوْ فِي وِسَادَةٍ مَنْصُوبَةٍ لَا مَفْرُوشَةٍ (وَاخْتُلِفَ فِيمَا إذَا كَانَ) التِّمْثَالُ (خَلْفَهُ وَالْأَظْهَرُ الْكَرَاهَةُ و) لَا يُكْرَهُ (لَوْ كَانَتْ تَحْتَ قَدَمَيْهِ) أَوْ مَحَلَّ جُلُوسِهِ لِأَنَّهَا مُهَانَةٌ (أَوْ فِي يَدِهِ) عِبَارَةُ الشُّمُنِّيِّ بَدَنِهِ لِأَنَّهَا مَسْتُورَةٌ بِثِيَابِهِ (أَوْ عَلَى خَاتَمِهِ) بِنَقْشٍ غَيْرِ مُسْتَبِينٍ. قَالَ فِي الْبَحْرِ وَمُفَادُهُ كَرَاهَةُ الْمُسْتَبِينِ لَا الْمُسْتَتِرِ بِكِيسٍ أَوْ صُرَّةٍ أَوْ ثَوْبٍ آخَرَ، وَأَقَرَّهُ الْمُصَنِّفُ (أَوْ كَانَتْ صَغِيرَةً) لَا تَتَبَيَّنُ تَفَاصِيلُ أَعْضَائِهَا لِلنَّاظِرِ قَائِمًا وَهِيَ عَلَى الْأَرْضِ، ذَكَرَهُ الْحَلَبِيُّ[2]۔ اور ایسے کپڑے پہننا جن پر ذی روح کی تصویر ہو۔ اور یہ کہ وہ اس کے سر کے اوپر ہوں یا اس کے سامنے ہوں، اس کے پہلو میں ہوں دائیں یا بائیں یا سجدہ کی جگہ ہوں۔ تصویر اگرچہ سرہانے پر ہو جو کھڑا ہو نہ کہ بچھا ہوا۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ جب تصویر اس کے پیچھے ہو اور زیادہ ظاہر ہے کہ مکروہ ہے اور مکروہ نہیں ہے اگر اس کے قدموں کے نیچے ہو یا بیٹھنے کی جگہ ہو اس لیے کے یہ اہانت کی جگہ ہے یا اس کے ہاتھ میں ہو یہ عبارت ہے کہ اس کے بدن سے ملی ہوئی ہے اور یہ اس کے کپڑوں سے ڈھکی ہوئی ہے یا اس کی انگھوٹھی پر ہے ایسا نقش ہے جو واضح نہیں ہے اور بحر میں کہا ہے اس کی کراہت ظاہر ہونے میں ہے پوشیدہ ہونے میں نہیں ہے جو کیس میں یا تھیلی میں یا دوسرے کپڑے میں اور مصنف نے اس کا اقرار کیا ہے یا تصویر بہت چھوٹی ہے اور زمین پر ہے اگر آدمی کھڑا ہو تو دیکھنے سے اس کے اعضاء کی تفصیل ظاہر نہ ہوتی ہو اس کو حلبی نے ذکر کیا ہے۔

---

[1] دارالافتاء دارالعلوم دیوبند، Fatwa:825-843/D=9/1439

[2] شامی، ابن عابدین، الدرالمختار وحاشیۃ علی ردالمحتار (648/1)

جنسی مصنوعات کا حکم:

قضاء شہوت کے لیے جنسی مصنوعات کا استعمال اسلام کی رو سے کسی طور بھی جائز نہیں بلکہ قرآن اور حدیث میں غیر فطری طریقے سے شہوت پوری کرنے پر سخت وعیدیں بھی وارد ہوئی ہیں۔ چناچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ۔۔۔[1]﴾ اور جو لوگ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اپنی بیویوں اور باندیوں کے علاوہ تو ان پر کچھ ملامت نہیں ہے پس جو شخص اس کے علاوہ کوئی اور راستہ تلاش کرے تو یہ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔

مذکورہ آیت کی تشریح کرتے ہوئے مفتی شفیعؒ فرماتے ہیں: "﴿فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾ سو جو شخص اس کے علاوہ کوئی راستہ تلاش کرے تو وہ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں یعنی اپنی بیوی یا باندی کے ساتھ اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کر سکتا ہے مگر اس کے علاوہ اور راستہ جنسی تسکین کا جائز نہیں ہے بلکہ وہ زنا شمار ہو گا شریعت اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتی۔ اسی طرح جو عورتیں محرم ہیں ان کے ساتھ یا منکوحہ یا باندی ناپاکی کے ایام میں ہے تو اس کے ساتھ مجامعت کرنا یا غیر فطری طریقہ سے شہوت کی تسکین کرنا سب ناجائز اور حرام کام ہیں۔ اسی طرح کسی لڑکے کے ساتھ یا جانور کے ساتھ یا ہاتھ کے ساتھ شہوت پوری کرنا بھی اسی وعید میں داخل ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے: ﴿فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ﴾ بیوی اور باندی کے علاوہ شہوت پوری کرنے کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے گا وہ حرام ہے چاہے ہاتھ کا استعمال ہے یا جنسی کھلونوں کا استعمال ہے کیوں کے اس کے علاوہ کوئی اور صورت جائز ہوتی تو اللہ کے رسول ﷺ نوجوانوں کو روزے رکھنے کا حکم نہ دیتے۔ چناچہ حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ آپ ﷺ نے خاص طور پر نوجوانوں کو پاکدامنی اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ، مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ[2])) اے نوجوانو! تم میں سے جو نکاح کے لوازمات پورے کر سکتا ہے وہ نکاح کرے، بے شک یہ اس کی نگاہ کی حفاظت اور شرمگاہ کی پاکی کا ذریعہ ہے اور جو اس کی گنجائش نہیں پاتا تو وہ روزے رکھے، بے شک یہ اس کی شہوت کو توڑنے والے ہیں۔

اس حدیث سے بھی یہ واضح ہوا کہ جنسی خواہش کی تکمیل کا ایک ہی جائز طریقہ ہے کہ آدمی نکاح کرے اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ جائز نہیں۔ لہذا جنسی آلات کا استعمال شہوت پوری کرنے کے لیے یہ ﴿فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾ کے زمرے آکر ناجائز اور حرام ہے البتہ بیوی کے ساتھ جنسی جذبات کو بیدار کرنے کے لیے کوئی آلا استعمال کیا جائے تو اس میں گنجائش ہو گی۔

---

[1] المومنون: 5-8

[2] بخاری، صحیح البخاری، کتاب النکاح، 422/3، ح: 5066

جائز وناجائز جنسی مصنوعات:

کنڈوم وغیرہ اور ہم بستری میں معاونت کی دوائیاں بیچنا جائز ہے بشرطیکہ اس کے اجزاء میں کوئی حرام چیز نہ ہو اور نسخہ (فارمولا) مستند ہو، اسی طرح جنسی کھلونے بیچنا ناجائز ہے[1]۔ اصل میں چیزوں کے جائز وناجائز ہونے کے چند اصول علماء نے ذکر کیے ہیں جن کو مد نظر رکھ کر موجودہ دور کی اشیاء کے جائز وناجائز ہونے کو پہچانا جاسکتا ہے چنانچہ علامہ محمد بن علي علاء الدين الحصكفي در المختار میں فرماتے ہیں:

"أَنَّ عِلَّةَ الْإِثْمِ هَلْ هِيَ كَوْنُ ذَلِكَ اسْتِمْتَاعًا بِالْجُزْءِ كَمَا يُفِيدُهُ الْحَدِيثُ وَتَقْيِيدُهُمْ كَوْنَهُ بِالْكَفِّ وَيَلْحَقُ بِهِ مَا لَوْ أَدْخَلَ ذَكَرَهُ بَيْنَ فَخِذَيْهِ مَثَلًا حَتَّى أَمْنَى،-----[2].

بے شک گناہ کی وجہ یہ ہے کہ کیا یہ جزء سے فائدہ حاصل کرنا ہے۔ جیسا کہ حدیث اس کو بیان کرتی ہے اور اس کو مقید کیا ہے ہتھیلی کے ساتھ اور اس میں یہ صورت بھی شامل ہے کہ اگر وہ اپنی شرم گاہ کو اس کی دونوں رانوں کے درمیان داخل کرے یہاں تک کہ اس کو منی نکل جائے، یا وہ پانی بہانہ ہے اور شہوت کو ابھارنا ہے غیر محل میں بغیر عذر کے جیسا کہ اس کو بیان کیا ہے اس قول نے اور رہا یہ کہ وہ کرے اس فعل کو شہوت ابھارنے کے لیے۔۔۔؟ میرے خیال میں کوئی ایسا نہیں ہے جس نے اس کی صراحت بیان کی ہو کچھ بھی، اور دوسرا (مسئلہ) زیادہ واضح ہے۔ کیوں کہ اس فعل بیوی کے ہاتھ سے یا اس کی مثل اس میں بھی پانی بہانہ ہے مباح جز کے ساتھ جیسا کہ اگر انزال کرے اس کی ران سے یا پیٹ سے۔ بخلاف اس کے کہ جب اس کی ہتھیلی سے ہو یا اس کی مثل اور اسی طرح اگر اس نے اپنی شرم گاہ کو دیوار میں یا اس کی طرح کی کسی اور چیز میں داخل کیا یہاں تک کہ اس کو منی نکل گئی یا اس نے اپنے ہاتھ کے ساتھ کسی چیز کو حائل کر کے جو کے حرارت کے مانع ہو، منی طلب کی تو اسی طرح گنہگار ہوگا۔ اور اس پر وہ بھی دلالت کرتی ہے جسے ہم ذکر کر چکے ہیں جہاں اس کے حلال نہ ہونے پر اس قول سے دلیل دی ہے "جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں" اور کہا ہے کہ استمتاع مباح نہیں ہے مگر ان دونوں سے یعنی بیوی اور باندی سے اور اس حکم سے اس امر کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کسی اور سے فائدہ حاصل کرنا حلال نہیں ہے۔

---

[1] darulifta : Jamia Uloom Islamiyyah Allama Muhammad ،fatwa_number : 144203200400 ،Yousuf Banuri Town

[2] الدر المختار وحاشية ابن عابدين، رد المحتار، 399/2

اس عبارت سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جنسی تسکین کے جو دو راستے بیوی اور باندی شریعت نے جائز کیے ہیں ان کے علاوہ کسی اور طریقے کو اپنانا رب تعالیٰ کی مقررہ حدود سے تجاوز کرنا ہے اس لیے محض جنسی تسکین کے لیے جنسی کھلونوں کا استعمال کسی صورت بھی جائز نہیں ہے، ان لغویات سے ایمان والوں کو پرہیز کرنا چاہیے۔

خلاصۃ الکلام:

خلاصہ کلام یہ ہے ہے حکومت کو چاہیے کہ ایسی مصنوعات جن کی خرید وفروخت شرعاً ناجائز ہے ان پر مکمل پابندی لگادی جائے اور لوگوں کو جائز اور نائز جنسی مصنوعات کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں، حکومت کے ساتھ ساتھ علماء کرام کو بھی چاہیے کہ مختلف ذرائع مثلاً: اخبارات ورسائل میں مضامین اور خاص طور پر سٹیج و منبر کے ذریعے ایسی مصنوعات کے بارے میں لوگوں میں آگاہی پیدا کریں کیونکہ بہت سے لوگ جدید مصنوعات کو باوجود فوائد کے چھوڑ دیتے ہیں صرف اس لیے کہ انہیں اس کے شرعاً جائز و ناجائز ہونے کا علم نہیں ہوتا اور بہت سے لوگ ایسی مصنوعات کی خرید وفروخت کرتے ہیں اور دنیاوی فائدوں کے حصول کے لئے اپنی دوکانوں میں رکھ کر بیچتے ہیں اس لئے کہ انہیں اس کے ناجائز ہونے کا اور اس کے ذریعے سے ہونے والے گناہ کا علم نہیں ہوتا اس لئے سب سے پہلے تو علماء کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خود ایسی مصنوعات کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور پھر عوام الناس کو ان کے جواز اور عدم جواز سے اگاہ کریں اس کے ساتھ ریاست کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ایسے اقدامات کرے جن کی وجہ سے ایک اسلامی ریاست کے اندر ناجائز چیزوں کی خرید وفروخت کو بند کیا جاسکے اور ان کے متبادل جائز و حلال چیزیں بہترین کوالٹی میں لوگوں کو مہیا کی جاسکیں۔

باب پنجم: معاشی امور میں احکام اسلامی کی تنفیذ

فصل اول: مہنگائی

فصل دوم: نظام اراضی

فصل سوم: سرکاری املاک کی آبادکاری

فصل اول: مہنگائی

فصل اول: مہنگائی کے مسائل

کسی بھی ریاست کا اور ریاست میں بسنے والے افراد کی انفرادی زندگی کا بنیادی اور اہم ترین تعلق امورِ معاش سے جڑا ہوا ہے۔ جب حضرت ابراہیم علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام مکّہ کی آباد کاری فرما رہے تھے تو جہاں اپنی عجز وانکساری کا اظہار فرما رہے تھے کہ اے اللہ میں اپنی اولاد اور اہل خانہ کو اس بیابان میں آپ کے آسرے پر اس "وَادِی غَيْرَ ذِیْ زَرْعٍ" میں چھوڑے جا رہا ہوں، وہاں شہر کی آباد کاری اور اس کے امن اور نظامِ معاش کے لیے بھی دعا کی:

﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَه مِنَ الثَّمَرَاتِ﴾[1] امن نصیب ہو اور رزق کی فراوانی ہو کیونکہ تنگی معاش کے بارے میں آپ ﷺ نے

((كَادَ الْفَقْرُ اَن يَّكُونَ كُفْرًا[2]))"قریب ہے کہ فقر کفر تک پہنچادے" کا عنوان قائم کر کے بتلادیا کے حالات کی استواری میں ایک بنیادی عنصر امورِ معاش کی فراوانی اور اس کا حسن انتظام ہے وگرنہ اسلام بھی خطرے میں پڑھ سکتا ہے اور جناب رسول اکرم ﷺ جب اہل ایمان کے درمیان مواخاۃ مدینہ کا عقد کروا رہے تھے تو اس میں ایک بنیادی بات یہی پیشِ نظر تھی کہ مہاجرین کے ہجرت کرنے کی وجہ سے ان کے کاروبار اور گھر بار اجڑ چکے تھے، ان کی آباد کاری کے لیے اہل مدینہ سے کچھ مدد ملے۔ اہل مدینہ نے بھی کما حقہ قربانی پیش کی۔ اس طرح ایثار اور قربانی کی لازوال مثالیں ان کی زندگیوں میں ملتی ہیں جو رہتی دنیا کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ لوگوں نے عرض کیا:

((قال النَّاسُ يا رسولَ اللَّهِ، غلا السِّعرُ فسعِّر لَنا، قالَ رسولُ اللَّهِ صلَّى اللَّهُ عليهِ وسلَّمَ: إنَّ اللَّهَ هوَ المسعِّرُ القابضُ الباسطُ الرَّازقُ، وإنِّي لأرجو أن ألقَى اللَّهَ وليسَ أحدٌ منكُم يطالبُني بمَظلمةٍ في دمٍ ولا مالٍ-[3]))حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے آپ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں پس آپ ہمارے لیے قیمتیں مقرر فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیمتیں طے کرنے والے تو اللہ ہی ہیں وہ تنگ بھی کرتے ہیں اور اضافہ بھی اور میں یہ آرزو رکھتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہو تو کسی کا مطالبہ میرے اوپر نہ ہو ظلم کا خونی ہو یا مالی۔

---

[1] البقرۃ:126

[2] بیہقی، ابو بکر احمد بن الحسن، **الجامع المصنف فی شعب الایمان۔ کتاب الآداب**، ح:5051

[3] ابو داؤد، **سنن ابی داود/البیوع** 51(3451)

آپ ﷺ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ چیزوں کا سستا اور مہنگا ہونا اللہ کی طرف سے ہے۔ اگر اللہ چاہیں گے تو چیزیں سستی ہوں گی اور اگر چاہیں گے تو چیزیں مہنگی ہو جائیں گی یعنی اگر میں چیزوں کے نرخ مقرر کروں گا تو ہو سکتا ہے کسی پر جانی یا مالی ظلم کر بیٹھوں اور قیامت کے دن مجھ سے اس کا مواخذہ کیا جائے۔

اگر تاجر حضرات جان بوجھ کر چیزوں کے نرخ بڑھا دیں تو ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ چیزوں کی مناسب قیمت کا تعین کرے۔ اگر مہنگائی طلب و رسد کی کمی بیشی کی وجہ سے ہو تو ریاست نرخ مقرر کرنے کا اختیار نہیں رکھتی بلکہ لوگ اپنی مرضی سے نرخ طے کر کے معاملات کریں گے تاکہ بعض کے زریعہ بعض کو روزی ملے۔ اس کے ساتھ تاجروں کو بھی اس کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ من مانی کرتے ہوئے ناجائز منافع خوری کریں اور لوگوں کو اذیت میں مبتلا کریں۔ اس فرمایا کہ اللہ تعالی ہی نرخ طے کرتے ہیں اور ایک فرشتہ مقرر کرتے ہیں جو صبح منڈیوں میں کونوں پر کھڑے ہو کر اعلان کرتا ہے آج چیزوں کا بھاؤ یوں ہو گا اور اتنی چیز مہنگی اور اتنی فراوانی اور اتنی ارزانی سے تم تک پہنچے گی۔ اسی طرح اشراط الساعۃ میں جہاں قیامت کی علامات صغریٰ اور کبریٰ کا ذکر ہے اس ضمن میں بھی ان باتوں کو ذکر کیا ہے "جب نیکی کا چلن عام ہو جائے تو پھر اشیاء میں برکات کا ظہور ہو گا۔ جسکا اثر انسانی زندگیوں پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ یہی مضمون آیاتِ قرآنیہ سے بھی واضح ہوتا ہے۔

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔۔۔[1]﴾ اور اگر بستی والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کے لیے آسمان اور زمین کی برکتوں کے دھانے کھول دیتے لیکن ان لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کی پکڑ کی ان کے کاموں کے سبب آسمان سے برکات کا ظہور معاشی آسودگی پر ہی منتج ہوتا ہے۔

گویا خیر و شر کا ہر پہلو اپنے ضمن میں معاشی آسودگی اور بدحالی لیے ہوتا ہے۔ اس فصل میں ہم پاکستان کے معاشی مسائل میں سے مہنگائی کے مسائل اور ان کے بارے میں احکامات اسلام کی تنفیذ کو ذکر کریں گے۔

مہنگائی کی بنیاد:

اسلامی نظام معیشت میں ایک بنیادی تصور وہ عقیدہ و خیال ہے جو قلب مسلم میں جاگزیں ہوتا ہے۔ ایثار کی بنیاد پر ابھرتا ہے اور دوسروں کی حاجات و ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے۔ مسلم معاشرہ میں بہترین شخص وہی شمار ہوتا ہے جو دوسروں کو نفع زیادہ پہنچائے، اس لیے اسلام نے ایک ایسا معاشی نظام دیا ہے جو بنیادی طور پر بنی نوع انسان کی رفع حاجات و ضروریات اور انفرادی و اجتماعی احتیاجات کو پورا کرنے پر قائم ہے۔ اور یہ نظام معیشت کو مال داروں کے درمیان نفع کے حصول کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتا

---

[1] الاعراف:95

بلکہ رفع حاجات اور تکمیل ضروریات کے لیے ایک مفید اور نفع بخش ذریعہ بنا کر اس کے فائدہ کو عام کرنا چاہتا ہے۔[1] زیادہ سے زیادہ افراد کمانے والے موجود ہوں گے مگر وہ اپنے لیے ہی نہیں کمائیں گے بلکہ تمام افراد قوم کے لیے کمائیں گے۔ یہ صورت پیدا نہ ہو سکے گی کہ ایک طبقہ کی کمائی دوسرے طبقوں کے لیے محتاجی و مفلسی کا پیغام ہو جائے۔ اگر اربابِ ثروت اس عادلانہ نظام کو منظور نہ کریں اور اس پر عمل پیرا نہ ہوں تو خدا کا نائب خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے اجتماعی معاشی نظام کے مطابق ارباب ثروت کو قانوناً اس پر مجبور کرے۔ اور اگر بیت المال کا مالیہ کافی نہ ہو اور حکومت و سلطنت میں محروم المعیشت لوگ رہ جاہیں تو اہل ثروت کا سرمایہ جبراً حاصل کر کے حق معیشت کی مساوات کو بروئے کار لایا جائے گا۔ حق مساوات کا فریضہ ہے کہ قلمرو اسلامی میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو حق معیشت سے محروم ہو اور نہ کسی کو یہ اختیار ہے کہ وہ حق معیشت میں دراندازی کرے۔ یہ سب فرائض اسلامی حکومت اور خلیفہ وقت کی ذمہ داریاں شمار ہوتی ہیں۔ ایک طرف اس معاشی نظام کا تصور ایک فرد واحد سے اٹھتے ہوئے بحیثیت نائب ربانی خلیفہ وقت تک پہنچتا ہے تو دوسری طرف انہی امور میں کوتائی کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اسے معاش کی وسعت و تنگی میں مرکزی مقام حاصل ہے۔

قرآن پاک میں جہاں معیشت کا لفظ آیا ہے اس کا ایک خاص تصور "اعراض عن ذکر" سے کیا ہے۔ ﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَه مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُه يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى[2]﴾ اور جو اعراض کرے گا میرے ذکر سے تو بے شک اس کی گزران تنگ کر دی جائے گی اور اس کا حشر ہم قیامت کے دن اندھوں کے ساتھ کریں گے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جو شخص بھی اللہ رب العزت کی یاد کو بھلا کر صرف دنیاوی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے تو اس کی گزر بسر مشکل کر دی جاتی ہے بظاہر اس کے پاس مال و اسباب اور عیش و عشرت کا سامان سب کچھ نظر آئے گا لیکن اس کا دل هَلْ مِن مَّزِيْدٍ کی حرص میں مبتلا ہو گا اور وہ اسی پریشانی میں ہمیشہ بے چین رہے گا۔ نصوص اور تجربات اس بات پر شاہد ہیں کہ اس دنیا میں قلبی سکون اور حقیقی اطمینان کسی کو بدون یاد الٰہی حاصل نہیں ہوتا۔ بعض مفسرین نے "مَعِيْشَةً ضَنْكًا" کے معنی لیے ہیں کہ وہ زندگی جس میں خیر داخل نہ ہو سکے۔ گویا کے خیر کو اپنے اندر لینے سے تنگ ہو گی، ظاہر ہے کہ ایک کافر جو دنیا کے نشے میں بدمست ہے اس کا سارا مال و دولت اور سامان عیش و عشرت بلآخر اس کے لیے وبال بننے والا ہے۔ جس خوشحالی کا انجام چند روز کے بعد ہمیشہ کی تباہی ہو اسے خوشحالی کہنا کہاں زیبا ہے۔[3]

---

[1] سوہاروی، حفظ الرحمن، **اقتصادی نظام**، (مکتبہ، شیخ الہند)، ص۔ 87

[2] طٰہٰ: 124

[3] عثمانی، شبیر احمد، علامہ، **تفسیر عثمانی**، (تاج کمپنی)، ص 427

ایک فرد کے بگاڑ کی قرآنی تعبیر "معیشت ضنک" سے فرمائی گئی ہے تو ان افراد سے تشکیل شدہ پورا معاشرہ اجتماعی طور پر تنگی معاش کا شکار ہو گا۔ اور برے اعمال کے حامل افراد برے لوگوں کو لاتے ہیں اور برے حکمرانوں سے برے احوال آتے ہیں اور پورا معاشرہ "معیشت ضنک" کی تصویر بن جاتا ہے۔ اب اعراض ذکر کی صورتیں جو معاشرہ میں پیش آتی ہیں ان میں بنیادی چیز اور اہم ترین سبب "شح" ہے جسے بخل سے تعبیر کر کے فرمایا: ((وأيُّ داءٍ أَدْوَى من البخلِ))اور بخل سے بدترین بیماری کون سی ہو سکتی ہے؟ پہلے اس سے امن غارت ہوتا ہے، خون خرابہ ہوتا ہے اور پھر حرص و طمع ہر حق اور ناحق سے آگئے بڑھتے ہوئے معاشرہ کے افراد کی ہر طرح کی حق تلفی کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتی ہے جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ "ادب المفرادات "میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

((اِيَّاكُمْ وَالشُّح، فَاِنَّهُ اَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ سَفَكُوْا دِمَاءَهُمْ وَقَطَعُوْا اَرْحَامَهُمْ[1])) بخل سے بچو، بے شک وہ لوگ جو تم سے پہلے تھے ہلاک ہوئے ہیں کیوں کہ انھوں نے خون بہایا اور آپس میں قطع رحمی کی۔

اور آیت قرآنی میں ساری کامیابیوں کا سرچشمہ اسی کو قرار دیا ہے کہ ﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ[2]﴾اور جو بچ گیا اپنے نفس کے لالچ سے پس وہی لوگ کامیاب ہیں۔ یعنی فلاح کو وہی شخص پہنچتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کے دل کے لالچ سے محفوظ رکھے اور حرص و بخل سے بچائے۔ بخل کی اس خصلت کے بہت سے اثرات انسانی زندگی پر پڑتے ہیں اور حرص کا یہ مریض معاشرے کا ناسور ہوتا ہے اور کچھ بنیادی اسباب و کردار کی بنا پر معاشرے کو مہنگائی و بے اطمینانی کی آگ میں دھکیل دیتا ہے۔[3]

مہنگائی کے اسباب:

مہنگائی کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

زخیرہ اندوزی، مہنگائی اور حکومتِ وقت کی ذمہ داری:

حکومتِ وقت بازار اور منڈیوں کی نگہبان ہے۔ اور ہر وقت اس پر دسترس اور شناسائی رکھنا اس کا بنیادی وظیفہ ہے۔ تاکہ معلوم ہو کہ حریص اور طماع لوگ مارکیٹ میں اشیاء کو کس طرز پر چلا رہے ہیں اور مفادِ عامہ کے خلاف کیا کیا اوچھے ہتھکنڈے اختیار کیے جا رہے ہیں؟

---

[1] فضل اللہ الصمد فی توضیح الادب المفرد، (دار الکتب الثقافیۃ)، 501/1

[2] الحشر:9

[3] تفسیر عثمانی، ص729

حضور پاک ﷺ نے ان زخیرہ اندوزوں کی مذمت بڑے واشگاف الفاظ میں فرمائی ہے۔((بِئْسَ الْعَبْدُ الْمُحْتَكِرُ إِنْ أَرْخَصَ اللَّهُ الْأَسْعَارَ حَزِنَ وَإِنْ أَغْلَاهَا فَرِحَ[1]))غلہ روکنے والا بھی کیسا برا آدمی ہے اگر نرخ ارزاں ہوتا ہے تو اس کو رنج ہوتا ہے اور گراں ہوتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے "جو شخص چالیس دن تک کھانا مسلمانوں پر روکے رکھے حق تعالیٰ شانہ اس کو کوڑھ کے مرض اور افلاس میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ نیز ایک حدیث میں ہے: "جو شخص چالیس دن تک غلہ روکے رکھے پھر اس کو لوگوں پر صدقہ کر دے تو یہ صدقہ کرنا بھی اس روکنے کا کفارہ نہ ہوگا۔"[2] اور یہ ساری مذمت اس لیے ہے کہ زخیرہ اندوزی تجارت اور معاش کی روح کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے والی چیز ہے۔

آمد ورسد میں توازن اور ریاستی ذمہ داریاں:

بخل کی مذمت اور ذخیر اندوزی کی ممانعت تو جناب رسول اکرم ﷺ کی زبانِ اقدس سے واشگاف الفاظ میں معلوم ہو ہی چکی ہے۔ دوسری طرف حکومت وقت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی عمومی مصلحت کے پیشِ نظر کسی ایسے فعل پر یا ایسی چیز پر پابندی لگا سکتی ہے۔ جو اپنی ذات کے اعتبار سے حرام نہیں بلکہ مباح کے زمرے میں آتی ہے لیکن اس سے کوئی اجتماعی خرابی لازم آتی ہے۔ یہ پابندی وقتی ہوتی ہے ابدی نہیں بلکہ اس کی حیثیت وقتی حکم کی ہوتی ہے۔ ایک کام اگر اپنی ذات کے اعتبار سے جائز ہے لیکن اس کی کثرت کسی معصیت یا مفسد کا سبب بن رہی ہے تو حکومت کو یہ اختیار ہے کہ وہ اس جائز کو بھی ممنوع قرار دے۔ اسی اصول کے تحت حکومت تمام معاشی سرگرمیوں کی نگرانی کر سکتی ہے۔ اور جن سرگرمیوں سے معیشت میں ناہمواری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ان پر مناسب پابندی عائد کر سکتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی بازار کی قیمت سے ارزاں بیچے تو اس پر پابندی بھی عائد کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے "اِمَّا اَنْ تَزِيْدَ فِيْ السِّعْرِ وَاِمَّا اَنْ تَرْفَعَ عَنْ سُوْقِنَا[3]" یا تو دام میں اضافہ کرو ورنہ ہمارے بازار سے اٹھ جاؤ۔

جب حاکمِ وقت اتنا امور پر کنٹرول رکھتا ہے اور ان چیزوں کی اتنی باریکی سے نگرانی کرتا ہے اور نفع کی حد بھی طے کرتا ہے تاکہ تاجروں کا نفع بند نہ ہو جائے یا لوگ زیادہ سستی سمجھ کر چیز نہ خریدیں کہ اسراف ہونے لگے تو پھر آمد ورسد میں توازن قائم ہوتا ہے نہ کہ اسباب تعیش اور طرح طرح کی نئی ایجادات کو مارکیٹ میں لا کر ان پر سکیمیں جاری کرنے سے اور جب ایک دفعہ لوگ اس کے خوگر بن جائیں تو سرمایہ دارانہ ذہنیت کے موافق اس کی قیمتوں کو بڑھا دینا۔ نیز حکومت وقت کا ایک وظیفہ یہ بھی ہے کہ

---

[1] البیہقی، **من زاد الطالبین**، مکتبہ لدھیانوی، ص، 18

[2] زکریا، کاندھلوی، **فضائل صدقات**،

[3] امام مالک، موطا امام مالک، **کتاب البیوع، باب الحکرۃ والتربص**، 651/2، ح57

بنیادی ضرورت کی اشیاء کا انتظام کرے۔ حوادث میں بھی حسن انتظام کا ایک شرعی منہج طے کیا گیا ہے جیسے دورِ فاروقی رضی اللہ عنہ میں قحط پڑا اور بارشوں کی کمی نے مدینہ کے امور معاش کو سخت مشکل میں ڈال دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ "صلاۃ استسقاء" کے لیے تشریف لے گئے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو ممبر پر بیٹھا کر دعا کی۔[1] اسی مضمون کو قرآن پاک میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا [2]﴾ پس میں نے کہا اپنے رب سے بخشش مانگو بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ آسمان سے تم پر (موسلا دھار) مینہ برسائے گا۔ اور مال اور اولاد سے تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے لیے باغ بنادے گا اور تمہارے لیے نہریں بنادے گا۔

غرض آخرت کے ساتھ دنیا کے عیش و عشرت سے بھی وافر حصہ مل جائے گا۔ گویا عبادات جنہیں حاکمِ وقت قائم کرے گا انھیں بھی امور معاش کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے اور وہ مال و باغات کی کثرت کا ذریعہ بنے گا اور یہی صلاۃ استسقاء کی مشروعیت کا ایک سبب ہے۔ اسی اسلامی اصول پر مبنی نظامِ زکوٰۃ کا ایک مؤثر پہرا یہ ہے کہ ہر چیز کی زکاۃ اس کی جنس سے ہی ادا کی جائے۔ ہر سرمایہ دار جس کی پیداوار بڑھ رہی ہے وہ اسی مناسبت سے غریب غربا کے حق کو بھی پیشِ نظر رکھے گا۔ نیز حکومت وقت آمد و رسد میں توازن کے لیے اہل بادیہ دیہات والوں کی حوصلہ افزائی کرے۔ جو لوگ دور نبوت میں مدینہ منورہ تشریف لاتے اور چیزیں فروخت کرتے تھے ان کی تحسین میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان:

((اِنَّ زَاهِراً بَادِيَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرُوْه[3]))زاہر ہمارا دیہاتی ہے اور ہم اس کے شہری) وہ دیہات سے چیزیں لاتے اور شہر میں فروخت کرتے تھے۔ اس سے عالمی تجارت اور اس کی حوصلہ افزائی کا اصول بھی ثابت ہوتا ہے۔ نیز لوگوں کو سامان منڈیوں تک پہچانے میں معاونت بھی حکومتِ وقت کا ایک اہم وظیفہ ہے۔

اصولِ تجارت کی تعلیم:

نفع کی دوڑ، اغراض سے پر زندگی، اسبابِ تعیش کا حصول اور اس میں آگے بڑھنے کی حرص، ہر جائز و ناجائز تک پہنچا دیتی ہے۔ جب تک عقلمندی اور ہوش مندی سے کام نہ لیا جائے تو انسان اس میدان میں بھٹک جاتا ہے۔ اس لیے تجارت کے بنیادی تصورات کو واضح کرنا، ذاتی و شخصی منافع کے پیشِ نظر قوم کو ایک کرب میں مبتلاء ہونے سے بچانے کے لیے کردار ادا کرنا، ایک اسلامی ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ ان باتوں سے آگاہی اصولِ تجارت کی تعلیم سے ہی ممکن ہے۔ معاملات بھی عقائد و عبادت کی

---

[1] نووی، **الاذکار**، دار الکتب العلمیۃ۔

[2] نوح: 11-13

[3] قاری، ملا علی، **مرقاۃ المفاتیح، شرح مشکاۃ المصابیح** ۔3064/7

طرح دین کا ایک اہم شعبہ ہیں۔ شریعت نے جس طرح عقائد اور عبادات کے بارے میں جزئیات واحکام بیان کیے گئے ہیں اسی طرح معاملات کی تفصیلات بھی کھول کھول کر بیان کر دی ہیں، جائز و ناجائز، حرام و حلال اور طہارت و ناپاکی کے تفصیلی احکامات شریعت نے بیان کر دیئے ہیں۔ عبادات کی طرح معاملات کو بھی اہتمام کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ جو لوگ معاملات میں سستی کرتے ہیں ان کا شریعت پر عمل ناقص ہے۔ آج دین صرف عبادات اور عقائد کا نام سمجھا جانے لگا ہے اور معاملات سے متعلق احکامات کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ معاملات میں سے تجارت بھی انسانی معاشرے کی ایک اہم ضرورت ہے جس کو معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ذریعہ بنایا ہے۔ تجارت، زراعت اور ملازمت وغیرہ انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے جائز اور حلال طریقے ہیں اور آپ ﷺ نے تجارت کو کمائی کا بہترین ذریعہ قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے تجارت کے بارے میں احکامات بھی ارشاد فرمائے اور سچے اور ایمان دار تاجروں کے فضائل بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ان کا حشر انبیاء صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہو گا۔

((التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ[1]))یعنی سچا ہو جھوٹ سے کام نہ لے، جھوٹ بولنے سے مال تو بک جائے گا مگر برکت ختم ہو جائے گی۔

اور دوسری بات دیانت دار ہو، مال میں ملاوٹ نہ کرے، عیب نہ چھپائے، دھوکہ نہ دے، زخیرہ اندوزی نہ کرے اور ناجائز منافع خوری نہ کرے۔ یعنی تجارت کے بنیادی اصول بتا دیے۔

نبی کریم ﷺ نے تجارت اور اخلاق کے مختلف مسائل کا تذکرہ فرمایا اور ایک جامع حدیث ارشاد فرمائی۔ راوی فرماتے ہیں کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس حکم سے دونوں امور کا احاطہ کیا۔ پہلا یہ کہ بات کرنے میں دیانت داری اور دوسری دولت کے معاملے میں دیانتداری۔ یعنی وہ گفت و شنید کے دوران جھوٹ نہیں بولتا اور فروخت کے وقت سامان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا۔ یہ دونوں چیزیں تجارت کی بنیاد ہیں جہاں چیز کا سچا ہونا اور مال کا خالص ہونا ضروری ہے لیکن تاجر کے لیے ان دونوں چیزوں پر عمل کرنا آسان نہیں۔ اس درجہ کا حصول ایک تاجر کے لیے ناممکن نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنا مال تقسیم کیا اور بیچ دیا وہ بیچا گیا اور اس میں کوئی برکت نہیں، جو شخص قسم کھا کر لوگوں کو اپنے مال کی تسلی دیتا ہے۔ اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بات بھی نہیں کریں گے اور نہ ان کو دیکھیں گے اور نہ ان کو پاک کریں گے۔ ((ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَا

---

[1] ترمذی، سنن ترمذی کتاب فقہ التاجر المسلم، التجارۃ فی السنۃ النبوی (المکتبہ الشاملہ) ص16 ح1209

يُزَكِّيهِمْ، ۔۔۔[1])) تین آدمی ایسے ہیں کہ نہیں بات کریں کے اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے روز اور نہ دیکھیں گے ان کی طرف اور نہ پاک کریں گے ان کو اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ اس کو پڑھا تو ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا خاک آلود اور نامراد ہوں کون ہیں وہ لوگ ؟فرمایا ایک ٹخنوں سے نیچے ازار لٹکانے والا اور احسان جتلانے والا اور جھوٹی قسمیں کھا کر سامان بیچنے والا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ قیامت کے روز اللہ ان سے نہ کلام کریں گے نہ ان کو دیکھیں گے۔

امام محمدؒ سے ایک مرتبہ لوگوں نے کہا کہ آپ تقویٰ کے بارے میں ایک کتاب لکھ دیں۔ انہوں نے فرمایا: "میں نے "بیوع "خرید وفرخت کے بارے میں کتاب لکھ دی ہے۔ اس کتاب کے مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب کوئی شخص خرید وفرخت کرے گا اور ناجائز اور حرام سے بچے گا تو وہی متقی ہو گا، اس کا کسب حلال اور اچھا ہو گا۔" اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: "جو خرید وفروخت کے مسائل کو نہ جانتا ہو وہ ہمارے بازار میں نہ بیٹھے۔[2]" کسی موقع پر حضرت عمر بازار کی طرف گئے اور ایک اجنبی شخص کو بیٹھے ہوے دیکھا تو پوچھا کیا تو نے اصولِ تجارت کا علم حاصل کر لیا ہے ؟اس نے انکار کر دیا تو فرمانے لگے ہمارے بازار میں بے علم کو بیٹھنے کی اجازت نہیں اور اسے بازار سے اٹھوا دیا۔ ایسے ہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایسے شخص کو بازار سے اٹھانے کا حکم دیا جس کو تجارت کے احکام معلوم نہ ہوں تاکہ لاعلمی میں لوگوں کو کہیں سود نہ کھلا دے۔ فتاویٰ تاتارخانیہ میں لکھا ہے: "کسی شخص کا تجارت میں مشغول ہونا تب تک جائز نہیں کہ وہ بیع وشراء کے احکام کو نہ جان لے اور یہ کہ کیا جائز اور کیا ناجائز ہے[3]۔

تجارتی اصول وضوابط:

تجارتی اصولوں میں سے ایک اہم اصول ناپ تول میں توازن کو برقرار رکھنا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَإِذَا كَالُوْهم أَوْ وَّزَنُوْهم يُخْسِرُوْن أَلَا يَظُنُّ أُولٰئِکَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْم يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾[4] اور خرابی ہے کم تولنے والوں کے لیے وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں سے تول کر لیتے ہیں تو بلکل پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا وزن کر کے دیتے ہیں تو گھٹا دیتے ہیں کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وہ ایک بڑے دن اٹھائے جائیں گے جس دن لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے تمام جہانوں کے پروردگار کے روبرو۔

---

[1] مسلم، **الجامع المسلم**، ح106

[2] ترمذی، **سنن ترمذی**، ح487

[3] حکیم محمود احمد ظفر، **پیغمبر اسلام اور تجارت**، بیت العلوم، ص17

[4] المطففین:1-6

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:((فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُوْرِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا وَإِنْ كَتَمَا وَكَذِبَا مُحِقَّتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا)) اگر وہ دونوں (خریدنے والا اور بیچنے والا) سچ بولیں اور معاملے کو کھول کر بیان کر دیں تو ان دونوں کی خرید وفروخت میں برکت دی جائے گی اور اگر معاملے کو چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو ان کی خرید وفروخت میں سے برکت اٹھالی جائے گی۔

آپ ﷺ نے مختلف احادیث میں تجارتی اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے دھوکہ، فریب، جھوٹ، بددیانتی، ملاوٹ، زخیرہ اندوزی اور گراں فروشی جیسی خرابیوں سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔

ایک دفعہ آپ ﷺ بازار تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک آدمی غلہ بیچ رہا ہے آپ ﷺ نے غلہ کے ڈھیر میں ہاتھ ڈالا تو وہ اندر سے گیلا تھا۔ آپ ﷺ نے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا کہ رات کو بارش ہو گئی تھی جس کی وجہ سے گیلا ہو گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا غلے کے اندر بارش ہو گی تھی؟ پھر ارشاد فرمایا:((مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا[1])) جس نے ہمیں دھوکہ دیا سو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ یعنی خراب مال کو چھپا کر اور اچھے مال کے ساتھ ملا کر بیچنا دھوکہ ہے۔ خراب مال چھپا کر صحیح مال کے ساتھ بیچنا بھی دھوکے کی ایک قسم ہے۔ تو جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تاجر جنت میں نبیوں کا ساتھی ہو گا لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ وہ گفتگو میں سچا ہو اور مال میں دیانت دار ہو۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا:((لا تَحَاسَدُوا، ولا تَنَاجَشُوا ولا تَبَاغَضُوا، ولا تَدَابَرُوا، ولا يَبِعْ بَعْضُكم على بَيْعِ بعضٍ،[2])) حسد نہ کرو اور بولی نہ بڑھاؤ اور بغض نہ رکھو اور ایک دوسرے سے پیٹھ نہ پھیرو اور ایک دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرو۔

نبی کریم ﷺ نے تلقی سے بھی منع فرمایا ہے۔((نَهَى رَسُوْلُ اللهِ صَلى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تَلَقِى الرُّكْبَانَ[3])) رسول اللہ ﷺ نے قافلہ والوں سے آگے بڑھ کر سامان خریدنے سے منع فرمایا ہے۔ یعنی یہ بھی ظلم کی ایک صورت ہے کہ سرمایہ دار لوگ شہر سے باہر ہی جا کر قافلہ والوں سے سارا سامان خرید لیں اور ان کو منڈی تک آنے ہی نہ دیں پھر اپنی من مانی قیمت وصول کر کے لوگوں کو بیچ دیں۔

اسی طرح تجارت کے ناجائز طریقوں میں سے ایک جمعہ کے اوقات میں کاروبار کرنا بھی ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان اوقات میں تجارت سے منع فرمایا ہے چناچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] مسلم، **الصحیح المسلم**، ح283

[2] ایضاً، ح6541

[3] بخاری، الجامع الصحیح، کتاب البیوع، باب نہی عن تلقی الرکبان، ح2162

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ[1] ﴾ اے ایمان والو جب نماز کے لیے پکارا جائے جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کے ذکر کی طرف اور خرید نا بیچنا چھوڑ دو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ اور قرآن پاک میں اس پر سخت تنبیہ بھی فرمائی گئی ہے ﴿ وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَ مِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ[2] ﴾ اور جب لوگ دیکھتے ہیں تجارت کو اور تماشہ کو تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔ آپ کہہ دیں جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے تماشہ سے اور تجارت سے اور اللہ بہتر روزی دینے والا ہے۔

اسی طرح تجارت کی ناجائز صورتوں میں سے ایک ذخیرہ اندوزی بھی ہے۔ آپ ﷺ نے ذخیرہ اندوزی سے منع فرمایا ہے۔ یہ صورت ہر دور میں رہی ہے کہ صاحب ثروت لوگ ارزانی کے زمانہ میں سامان خرید کر جمع کر لیتے اور گرانی کے دور میں منہ مانگے داموں فروخت کر دیتے۔ ایسی ذخیرہ اندوزی جو دوسرے لوگوں کے لیے نقصان کا باعث ہو حرام ہے۔

اسی طرح تجارت کی ناجائز صورتوں میں سے ایک سودی لین دین بھی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے: ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا[3]﴾ اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے خرید وفروخت کو اور حرام قرار دیا ہے سود کو۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے جو لوگ سودی معاملات کرتے ہیں ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔

ایک ہی جنس کی چیزوں کا آپس میں کمی زیادتی کے ساتھ جو تبادلہ کیا جاتا ہے وہ سود کہلاتا ہے اور مختلف جنس کی چیزوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کمی بیشی سے تبادلہ یہ تجارت کہلاتا ہے اسلام نے تجارت کی تو اجازت دی ہے سود کی نہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے کے دیگر ذرائع مثلاً جوا، سٹہ اور لاٹری وغیرہ کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ دھوکہ دہی اور فراڈ سے بچنے کے لیے خیار رویت، خیار شرط اور خیار عیب وغیرہ کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابَةَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ وَلِيَ خِيَارٌ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ[4]) جب تم خرید وفرخت کرو تو کہہ دیا کرو دھوکہ تو نہیں ہے میرے اور تمہارے درمیان اور میرے لیے تین دن کا اختیار ہے۔

اسلام نے تجارت کے وہ اصول بتائے ہیں جو انسان کی اخلاقیات اور اس کی حقیقی ضروریات کو پورا کرنے والے ہیں اور دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں فائدہ پہچانے والے ہیں اور اس احساس کو اجاگر کرنے کے لیے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] الجمعۃ:9

[2] الجمعۃ:11

[3] البقرۃ:275

[4] البخاری، **جامع الصحیح**، ص2117

آدمی سے مال کے بارے میں بھی سوال ہو گا کہ ((مِنْ اَیْنَ اِکْتَسَبَ وَفِیْمَا أَنْفَقَ[1])) مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ تاکہ انسان ناجائز کمائی کے ذرائع اختیار نہ کرے اور ناجائز طریقہ سے اپنے مال کو خرچ نہ کرے۔ آج موجودہ دور میں اس چیز کو مد نظر نہیں رکھا جاتا عام معاشروں میں جس چیز کی مانگ بڑھ جاتی ہے اسے جائز قرار دے دیا جاتا ہے اور جس چیز کی مانگ نہ ہو وہ ناجائز قرار دی جاتی ہے اسی لیے آج مغربی ممالک میں شراب، جوا، نشہ اور زنا جیسی برائیاں کاروبار کی شکل اختیار کر چکی ہیں کیوں کہ ان کی مانگ بڑھ رہی ہے جو دنیا میں بھی معاشرے کی تباہی کا سبب ہے اور آخرت کی بربادی کا بھی ذریعہ ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے انسانی مساوات، معاشرتی اعتدال اور آخرت میں جوابدہی کے احساس کو معاشی بنیاد بنایا ہے اور اس کے لیے انتہائی سادہ اصول وضع کیے ہیں جیسا کہ آپ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ مال کو بچا کر نہیں رکھتے تھے بلکہ جو مال آتا اس کو فوراً محتاجوں میں تقسیم فرما دیتے یا ضروریات میں خرچ فرما دیتے۔

علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں: "اِنَّ سَیَاسَتِ الرَّسُوْلِ کَانَتْ تَقْضِی بِتَوْزِیْعِ بِفَوْرِہِ اِنْ جَاءَ غُدْوَۃً لَمْ یَنْتَصِفِ النَّھَارَ اَوعَشِیَّۃً لَمْ یَبِیْتُ حَتّٰی یَقْسِمُہ[2]" رسول اللہ ﷺ کی سیاست یا پالیسی یہ تھی کہ آپ ﷺ فوری طور پر خرچ فرما دیتے اگر صبح مال آتا تو دوپہر سے پہلے اس کو تقسیم فرما دیتے اور اگر شام کو آتا تو اس کو تقسیم کر کے رات گزارتے تھے۔

ایک دفعہ آپ ﷺ کی خدمت میں بحرین سے کثیر رقم بطور خراج آئی اتنی کثیر رقم مدینہ میں اس سے قبل کبھی نہیں آئی تھی۔ آپ ﷺ کے حکم سے اسے مسجد نبوی کے صحن میں رکھ دیا گیا مگر آپ ﷺ نے اس کی طرف التفات بھی نہ کیا اور نماز کے بعد اس کو تقسیم کرنا شروع کیا اور سارا تقسیم فرما لیا اس میں سے کچھ بھی بچا کر نہ رکھا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رات وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک راستہ پر جا رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے ابوذر اگر احد پہاڑ میرے لیے سونے کا بن جائے تو پھر بھی میں کبھی یہ پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک دینار بھی باقی ہو البتہ وہ دینار جو میں قرض ادا کرنے کے لیے رکھ چھوڑوں۔

ام المؤمنین حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں داخل ہوتے تو چہرہ مبارک متغیر تھا میں نے دریافت کیا اے نبی اللہ! خیریت ہے؟ فرمایا کل جو میرے پاس سات دینار کہیں سے آئے تھے، شام کا وقت ہو گیا ہے وہ میرے پاس پڑے رہ گئے (تقسیم نہ ہو سکے)۔ یعنی اس فکر میں کہ وہ تقسیم یا خرچ کیوں نہ ہو سکے چہرہ مبارک متغیر ہو گیا۔

---

[1] ترمذی، **سنن ترمذی**، ح2416

[2] غفاری، پروفیسر ڈاکٹر نور محمد، **نبی کریم ﷺ کی معاشی زندگی**، (دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، 1999ء)، ص276

ایک بار نماز عصر کے بعد جلدی جلدی گھر تشریف لے گئے اور پھر فوراً باہر تشریف لے آئے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعجب ہوا۔ فرمایا مجھے نماز میں خیال آیا کہ سونا گھر میں پڑا رہ گیا ہے۔ مجھے خوف ہوا کہ ممکن ہے رات ہو جائے اور وہ پڑا رہ جائے اس لیے گھر جا کر اسے تقسیم کرنے کا کہہ کر آیا ہوں۔ الغرض اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو آپ ﷺ کی مالیاتی پالیسی کے اس نمایاں پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ آپ ﷺ جوڑ کر اور بچا کر رکھنے کے حق میں نہ تھے بلکہ گردش دولت کو بہتر سمجھتے تھے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مالیاتی پالیسی کا دوسرا نمایاں پہلو، تقسیم دولت میں اصول ترجیح کے بجائے اصول مساوات پر عمل کرنا ہے۔ اصول ترجیح کا تقاضا یہ ہوتا ہے کچھ لوگوں کو انکی بعض خدمات یا کسی سماجی، سیاسی یا معاشی برتری کی وجہ سے دوسروں پر تقسیم دولت کے وقت ترجیح دی جائے۔ یہ اصول سرمایہ دارانہ نظام کی تمام برائیوں کی اصل وجہ ہے۔ اسی اصول کے تحت تقسیم دولت اور ذرائع دولت صرف چند انسانوں یا خاندانوں کی ذاتی ملکیت بن جاتے ہیں۔ اور وہ معاشی طور پر کمزور لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے مبارک عمل سے اس تقسیم دولت کے ظالمانہ اصول کو روز اول سے ہی رد فرما دیا تھا۔ بلکہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے اصول مساوات پر عمل فرمایا۔ اور یوں حق معیشت میں غریب اور امیر کو برابر کر دیا۔ احمد شوقی کی قبر پر اللہ کریم کی رحمتیں نازل ہوں۔ انہوں نے آپ ﷺ کے اس عادلانہ اور خیر خواہانہ عمل کی تعبیر اس طرح کی ہے:

انصفت أهل الفقر من أهل الغنى	فالكل في حق الحياة سواء
فَلَوَ اَنَّ إنسانًا تَخَيَّرَ مِلَّةً	ما اختارَ إلّا دينَكَ الفُقَراءُ
الإشتِراكِيّونَ أَنتَ إمامُهُمْ	لَولا دَعاوي القَومِ وَالغُلَواءُ [1]

اے نبی کریم ﷺ آپ نے غریبوں کو امیروں سے پورا پورا انصاف کر کے ان کا حق لے کر دیا اور یوں تمام انسان زندگی کے حق (معیشت) میں برابر ہو گئے۔ اگر انسانوں کو اپنی مرضی سے کوئی دین اختیار کرنے کی اجازت ہوتی تو غرباء آپ ﷺ ہی کا دین اختیار کرتے۔ (کیونکہ آپکا دین امیروں سے غریبوں کا حق لے کر دیتا ہے)۔ اشتراکیوں کے امام آپ ﷺ ہیں بشرطیکہ ان لوگوں نے بے جا دعوے نہ کیے ہوتے اور حد سے نہ گزرتے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کے زمانہ مبارک میں دولت کا سب سے بڑا ذریعہ غنائم تھے۔ نبی کریم ﷺ سے پہلے بادشاہ یا سردار غنائم میں سے اچھا اور زیادہ مال اپنے لیے چھانٹ لیتے تھے۔ آپ ﷺ نے ایسا ہرگز نہیں کیا بلکہ سارا مال تمام لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

---

[1] شوقی، احمد، **دیوان العرب**۔ برنامج (زمام) لإدارة المحتوى الرقمي، الإصدار ١، برنامج تجريبي أعده وبرمجه عبدالرحمن بن ناصر السعيد

© Untitled. All rights UPoreserved. | Design: HTML

آپ ﷺ سے پہلے غنیمت کا 1/4 بادشاہِ وقت لے لیتا تھا، مگر آپ ﷺ نے یہ حصہ گھٹا کر 5/1 کر دیا تاکہ عام لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دولت میں شریک کیا جاسکے۔ آپ ﷺ نے اپنا حصہ غنیمت میں ایک عام مجاہد کے برابر کر دیا اور تمام مجاہدین اپنے حصص میں برابر تھے تاکہ تقسیم دولت کی ناہمواریوں کو کم کیا جاسکے۔ البتہ سوار کو تین حصے اس لیے ملتے تھے کہ جہاد کے لیے گھوڑے پالنے کا شوق اور بڑھے۔ مگر یہاں بھی گھڑ سوار تمام برابر تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ اگر دونوں گھوڑ سوار تھے تو دونوں حصوں میں برابر تھے۔ بیت المال سے آپ ﷺ اپنی ذات پر صرف اتنا ہی خرچ کرتے تھے جتنے کی اجازت قرآن کے مقرر کردہ احکامات سے ملتی تھی۔ اور بیت المال کو اپنا ذاتی خزانہ تصور نہیں کرتے تھے۔ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے اونٹ کے ایک بال کا زیادہ مستحق نہیں سمجھتے تھے حتیٰ کہ اموال فئے جو خالصاً آپ ﷺ کے لیے تھے وہ بھی آپ نے مسلمانوں کے لیے وقف کر دیے تھے۔ اگر اموال فئے میں نقد یا اناج ہوتا تو فوراً محتاجوں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ جو لوگ صاحب عیال ہوتے تھے ان کو دو حصے اور مجرد کو ایک حصہ ملتا تھا۔ اور حقیقت بات تو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنا وہ حصہ بھی بیت المال سے نہ لیا جس کے لینے کی اجازت تھی ورنہ ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ کو قسم کھا کر یہ روایت نہ کرنا پڑتی کہ نبی علیہ السلام اور آپ کے اھل بیت کبھی تین دن تک متواتر گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کر نہ کھا سکے۔ یہاں تک کہ اس دنیا سے پردہ فرمالیا۔ اور ر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کہنا پڑا کہ ہم اہل بیت محمد ﷺ کو ایک چاند گزر کر دوسرا چاند نظر آجاتا اور ہمارے گھر میں چولہا نہ جلتا، کھجور اور پانی پر ہماری گزر بسر ہوتی تھی۔

یہی وہ اصول ہیں جن کی بنیاد پ ایک صالح معاشرہ اور ہر طرح کی افراط و تفریط سے پاک اور انسانی مساوات کا علمبر دار نظام مرتب ہوتا ہے۔ جو تعلیمات الٰہی کا حقیقی ترجمان اور انسانیت کی خیر خواہی اور بھلائی کا ضامن ہوتا ہے۔

مہنگائی اور ریاستِ پاکستان کی ذمہ داریاں:

پاکستان میں حالیہ مہنگائی کی لہر نے ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کو متاثر کیا ہے۔ اس کے محرکات میں ذخیرہ اندوزوں کی ہوس، غیر ملکی مصنوعات اور کمپنیوں کی اجارہ داری، مافیاز کی حکمرانی اور اداروں اور محکموں کی کرپشن کے ساتھ ساتھ حکومت کی نااہلی بھی شامل ہے۔ اشیاء خورد و نوش اور دوسری ضروریاتِ زندگی کی بڑھتی ہوئی قیمتوں نے عوام سے جینے کی امنگ بھی چھین لی ہے۔ ایسے وقت میں حکومت پاکستان کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ عوام کو ریلیف دینے کے لیے فوری اقدامات کرے، انتظامی فیصلوں میں بہتری لائے، زخیرہ اندوزی اور سمگلنگ کو روکے، جن اشیاء کی ملک میں کمی ہو ان کو فوراً درامد کرے، وفاقی حکومت کے ساتھ ساتھ صوبائی حکومتیں بھی اشیاء کی قیمتوں کا تعین کریں اور پرائس کنٹرول کمیٹیاں بحال کریں، زرعی شعبے پر خصوصی توجہ دی جائے، صنعتوں کو بحال کیا جاے، اجناس کی قیمتوں میں کمی لائی جاے، کاروباری سرگرمیوں کو بڑھانے کے

لیے بے روزگار نوجوانوں کو بلا سود قرضے فراہم کیے جائیں، آئی ایم ایف اور دوسرے مالیاتی اداروں اور بیرونی قرضوں کی دلدل سے ملک کو آزاد کروایا جائے، غیر ضروری اخراجات اور خرافات جو شریعت سے بھی متصادم ہیں اور ان پر کروڑوں روپے ضائع ہو جاتے ہیں ان کو کنٹرول کیا جائے، ناجائز منافع خوری جو اخلاقاً بھی اور شرعاً بھی درست نہیں ہے اس کا قلع قامہ کیا جائے، سودی لین دین سے چھٹکارا حاصل کیا جائے، اللہ اور اللہ کے رسول کے خلاف محاذ آرا نہ ہوں۔ اللہ کی ناراضگی سے بچنے کے لیے، مصائب و پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے، دلوں کے سکون و اطمینان کے لیے، گھروں میں خوشحالی اور رزق میں برکت حاصل کرنے کے لیے سود چھوڑ دیں۔ اللہ کی مدد شامل ہو گی۔ عوام الناس اپنے وطن عزیز کی اقتصادی مشکلات دور کرنے کے لیے اپنے وطن میں سرمایہ کاری کریں اور اپنے کاروبار کو وسعت دیں اس سے ہمارا اپنا ملک مستحکم ہو گا، بے روزگاروں کو روزگار ملے گا، کئی گھرانوں کا چولہا جلے گا، صلہ رحمی سے ہمارے مال میں بھی برکت ہو گی۔ شریعت کے مطابق کاروبار اور اس کی ترقی، دینی و قار میں اضافے کا باعث ہو گی۔ ملک تباہی سے بچے گا۔

فصل دوم: نظام اراضی

فصل دوم: نظام اراضی

اللہ تعالی نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے ٹھہرنے کے لیے زمین کو مقرر کیا۔ زمین ساری اللہ کی ہے وہ جسے چاہتے ہیں اسے اس کا مالک بنادیتے ہیں۔

﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ[1]﴾ بے شک زمین اللہ کی ہے جو اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بنا دے۔ جس کے تصرف میں چاہے دے دے۔ یہ اس کی تقسیم ہے جس کو چاہے زیادہ دے جس کو چاہے تھوڑی کا مالک بنادے۔

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ[2]﴾ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

زمین اور آسمان کی تمام اشیاء پر حقیقی ملکیت اللہ تعالی کی ہی ہے۔ وہی ان اشیاء کا خالق اور ان کا حقیقی مالک ہے۔ اس مالک حقیقی نے یہ چیزیں انسانوں کو عطا فرمائی ہیں جس کے نتیجے میں وہ دنیاوی احکام و معاملات کے لحاظ سے ان اشیاء کے مالک قرار پائے ہیں اور ان کو ان مملوکہ اشیاء پر مالکانہ حقوق حاصل ہوئے ہیں لیکن یہ ملکیت چونکہ اللہ تعالی کا عطیہ ہے اس لیے یہ بلکل آزاد ملکیت نہیں ہے بلکہ اپنے حصول کے طریقے اور استعمال کے لحاظ سے بہت سے حدود کی پابند ہے چناچہ ان دنیاوی مالکوں پر واجب ہے کہ وہ اسے اللہ تعالی کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کریں اور ان حدود سے تجاوز نہ کریں۔[3] اس فصل میں ہم نظام اراضی کی اصلاح کے حوالہ سے ریاستی ذمہ داریوں کا جائزہ لیں گے۔

ارض کی ملکیت کا مفہوم:

رسول اللہ ﷺ کا پاک ارشاد ہے:

((مَن أحيا أرضًا ميّتةً فَهيَ لَهُ وليسَ لعِرقِ ظالِمٍ حقٌّ[4]))جو مردہ زمین کو آباد کرے وہ اسی کی ہے اور کوئی حق نہیں ہے اس میں ظالم جابر کا۔

---

[1] الاعراف:28

[2] ال عمران:109

[3] تقی عثمانی، مفتی، **ملکیت زمین اور اس کی تحدید**، (مکتبہ دار العلوم کراچی)، ص:11

[4] ابو داود، **سنن ابی داؤد**، ح:3073

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نے افتادہ زمین کو آباد کیا وہی اس زمین کا مالک ہو گا۔ حضرت طاوؤس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((عَادِيُّ الْأَرْضِ لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ ثُمَّ لَكُمْ مِنْ بَعْدُ، فَمَنْ أَحْيَا شَيْئًا مِنْ مَوَتَانِ الْأَرْضِ فَلَهُ رَقَبَتُهَا۔[1]))جس زمین کا مدت سے کوئی وارث نہ ہو، وہ اللہ اور اللہ کے رسول کی ہے پھر بعد میں تمہاری ہے چناچہ جو شخص بھی کسی مردہ زمین کو زندہ کرے گا، وہ زمین اسی کی ہو جائے گی۔

ان آیات اور احادیث سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ زمین کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے لیکن جب کوئی شخص کسی غیر مملوک، لاوارث اور بنجر زمین کو آباد کر لے تو وہ اس کی ملکیت میں آجاتی ہے۔ دوسری طرف ان احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آبادکاری سے صرف انہی زمینوں پر آبادکار کو ملکیت حاصل ہوتی ہے جو پہلے سے کسی کی شخصی ملکیت نہ ہوں۔ لیکن اگر زمین پہلے سے کسی شخص کی ملکیت میں ہے تو خواہ وہ غیر آباد کیوں نہ پڑی ہو اس پر اس کی اجازت کے بغیر آبادکاری جائز نہیں اور ایسی آبادکاری سے آبادکار کا کوئی حق پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح احادیث شخصی ملکیت پر بھی دلالت کرتی ہیں اور اس بات پر بھی کہ جو زمین کسی کی شخصی ملکیت میں ہو دوسروں کے ذمے اس کی ملکیت کا احترام اسی طرح واجب ہے جس طرح اشیاء صرف کی ملکیت کا۔ اسی طرح رسول کریم ﷺ نے بہت سی بنجر زمینیں متعدد صحابہ کرام کو مالکانہ حقوق کے ساتھ عطا فرمائیں۔ مفتوحہ اراضی کو مجاہدین کے درمیان تقسیم فرما کر انہیں ان اراضی کا مالک بنا دیا۔ جب بنو نضیر کے یہودی جلاوطن ہوئے تو ان کی متروکہ اراضی مہاجرین میں تقسیم کی گئی۔

((فأعطى النَّبيُّ صلَّى اللَّهُ عليهِ وسلَّمَ أَكْثرَها للمُهاجرينَ، وقسمَها بينَهُم وقسمَ منها لرجُلَيْنِ منَ الأنصارِ، وَكانا ذوي حاجةٍ لم يَقسِمْ لأحدٍ منَ الأنصارِ غيرِهما۔[2]))حضور ﷺ نے بنو نضیر کی اکثر زمینیں مہاجرین کو دے دیں اور انہیں ان کے درمیان تقسیم فرمایا اور انصار میں سے بھی دو صاحبان کو زمین کا حصہ عطا فرمایا جو ضرورت مند تھے۔ انصار میں سے ان صاحبان کے سوا کسی کو ان زمینوں میں سے کچھ نہیں دیا۔

---

[1] ابو یوسف، امام، **کتاب الخراج**، ص65

[2] تلخیص **سنن ابی داؤد**، 235/4، حدیث:2848

اس کے علاوہ بہت سے صحابہ کرام کو آپ ﷺ نے مختلف اراضی بطور عطیہ عنایت فرماہیں۔اسی طرح زمینوں کی خرید وفروخت کے بارے میں بھی حضور ﷺ نے تفصیلی احکام عطا فرمائے اور مالکان اراضی کو بیع، ہبہ، وقف، اجارہ، اور دوسرے تمام تصرفات کی اجازت عطا فرمائی۔[1] اس لیے وہ لوگ بھی اراضی کے مالک سمجھے جائیں گے جن کو یہ زمین وراثت میں، ہبہ میں، وقف میں یا فروختگی میں جائز طور پر منتقل ہو گی۔ سیاسی رشوت کے طور پر، دھوکہ اور فریب کے ذریعہ، جبر اور ناجائز طور پر سے جو زمینیں و جاگیریں حاصل کی گئی ہیں وہ بغیر معاوضہ واپس لے لی جائیں گی اور اس علاقے کے مستحق کاشتکاروں میں تقسیم کر دی جائیں گی۔ اراضی ملکیت کی کم یا زیادہ کوئی حد شریعت نے مقرر نہیں کی لیکن اگر بڑی زمینداریاں ملکی نظام معیشت اور اجتماعی معاشی نظم ونسق کو فاسد کرنے کا ذریعہ بن رہی ہوں اور شدید تر مذہبی، ملی و ملکی مفاسد اور خطرات ظاہر ہو رہے ہوں تو حکومت شریعت کے اصولوں وضوابط کی روشنی میں اراضی کی ملکیت کی مناسب تحدید کرے گی۔ اراضی کے مالک کو اپنی زمین میں ہر قسم کا تصرف کرنے کا پورا حق حاصل ہو گا مگر ظلماً اور بغیر کسی شرعی وجہ کے مزارع کو بے دخل نہیں کیا جاسکے گا۔ جن مزارعین نے زمینوں میں ترقیاتی کام کئے ہیں ان کو ان کا پورا پورا معاوضہ دیئے بغیر بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔ مزارعین کو بھی کسی اراضی کے مالک کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے زمین کو بٹائی پر دینے کی اجازت دی ہے لیکن اگر ریاست کا زرعی نظام ان اصلاحات کے باوجود بھی درست نہ ہو سکے تو حکومت کو اختیار ہے کہ وہ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ یا امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق بٹائی پر زمین دینے پر پابندی لگادے اور اراضی کے مالک کو حکم دے کہ یا تو اپنی اراضی خود کاشت کرے یا کرایہ یا اجارہ پر اٹھائے۔ زمین کے چھوٹے قطعات کے مالکان کو بڑے قطعات کے مالکوں کے دباؤ کے اثر سے نجات دلائی جائے گی اور انہیں اپنی زمینوں پر غیر مشروط مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے۔ زراعت کی جدید سہولتیں دیہات میں عام کی جائیں گی، قومی سطح پر جدید زرعی آلات کے استعمال کو وسیع تر بنایا جائے گا، زرعی زمینوں کو سیم و تھور سے محفوظ کیا جائے گا، زرعی زمینوں کو سیلاب سے محفوظ کرنے کا مستقل بندوبست کیا جائے گا، زرعی پیداور کی فروخت کا ایسا انتظام کیا جائے گا کہ اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ آڑھتیوں، سٹاک ہولڈروں، اسٹاک ایکسچینجوں، بینکوں، سٹہ بازوں اور دلالوں وغیرہ کی جیب میں جانے کی بجائے کاشتکاروں اور کھیت کے مزدوروں تک پہنچے۔ نئی آباد شدہ زمینوں کو صرف خود کاشت کرنے والوں کو آسان شرائط پر دیا جائے گا۔ اس میں اولیت اور فوقیت مقامی کاشت کاروں اور کھیت مزدوروں کو ہو گی۔ جن کاشتکاروں سے ناجائز زمینیں واپس لی جائیں گی

---

[1] تقی عثمانی، مفتی، **ملکیت زمین اور اس کی تحدید**، (مکتبہ دار العلوم کراچی)، ص: 11

اگران کا ذریعہ معاش کوئی دوسرا نہ ہوا یا ناکافی ہواتو گزارہ کے موافق خود کاشت کے لئے انہیں قطعہ زمین دیا جائے گا۔ زرعی زمینوں پر سے مالیہ وصول کرنے کے طریقوں کی شریعت کے اصولوں کی روشنی میں اصلاح کی جائے گی۔اور بد عنوانیوں اور بے جامداخلتوں کا مکمل سد باب کیا جائے گا۔ قابل زراعت زمینوں کو صنعتی ضروریات کے لئے استعمال نہیں ہونے دیا جائے گا۔ زرعی اراضی کی آبپاشی کے لئے نہروں کا جال بچھایا جائے گا۔ ڈیم تعمیر کئے جائیں گے اور ٹیوب ویل نصب کئے جائیں گے۔ اراضیات کو سیلاب سے بچانے اور پانی کو زرعی استعمال میں لانے کے لئے سمال ڈیمز تعمیر کئے جائیں گے۔ تمام نہروں کو پختہ کیا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے زمین اور اس کی حرص کو کم کرنے کا جو پیمانہ ارشاد فرمایا:

((لا تَتخِذوا الضَّيْعَةَ فتَرْغَبُوْا فِي الدُّنْيَا[1]))زمین بنانے کے پیچھے مت پڑو دنیا کی طرف راغب ہو جاؤ گے۔اس کی محبت دل میں بس جائے گی۔ لیکن اگر ایک طرف یہ پہلو ہے تو دوسری طرف زمین کی پیداوار اور اس کے منافع سے انسانیت کو فائدہ پہچانے کو رب تعالیٰ کی قدرت کی خاص نشانی بتایا جارہا ہے۔

﴿اَفَرَاَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَه اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ[2]﴾ بھلا تم دیکھو تو جو کچھ تم کھیتی کرتے ہو۔ کیا تم اسے اگارہے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے : فصل کے ہر دانہ سے ذی روح کو جو نفع پہنچے،وہ ثواب اور صدقہ کا مصداق ہے۔ انصار مدینہ جو اسلام کے اولین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اور جن کا وجود اسلامی ریاست کے وجود کا بنیادی عنصر ہے،ان کا پیشہ زراعت ہی تھا، اور فصلوں کی کاشت پر ہی ان کا دار مدار تھا۔

زمینوں کی آبادکاری اور اس کے لیے مناسب سہولیات کا مہیا کرنا اسلامی حکومت کا ایک بینادی فریضہ ہے اور اسی بنیاد پر عشر وخراج کی تحدید کا انتظام ٹھہرایا گیا ہے اور اگر نہری پانی سے زمین سیراب ہو تو نصف عشر کی مقدار کو متعین کیا گیا ہے۔ بنجر اور بیابان زمینوں کی آبادکاری کے لیے حکومت وقت کی ذمہ داری طے کی گئی ہے کہ اراضی کی تحدید کر کے اہل اور قابل لوگوں تک

---

[1] الترمذی، **سنن الترمذی**، حدیث:2328۔احمد، حدیث:3579

[2] الواقعہ:63-64

اس کو پہنچائے اور کتب فقہ میں مستقل عنوان "احیاء موات" کا قائم کیا گیا ہے۔ نیز زمانہ خلافت میں ابتداءً لوگوں کو غنیمت اور فتح کئے ہوئے علاقے حوالے کیے جاتے تھے جنہیں وہ قابل استعمال بناتے تھے۔

اراضی اور انسانی منافع:

زمین کو انسانی منافع کے لیے بنایا گیا ہے اور زراعت ایک قابل فخر پیشہ شمار کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کی نظر میں زراعت و باغبانی کی اہمیت کا انداز اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں کہیں اللہ کی قدرت کی نشانیوں پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے اس میں اکثر و بیشتر یہی نظام پیش کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ قدرت الٰہی کی کارفرمائیوں اور جلوہ گریوں کو باآسانی مشاہدہ کرنے کے لیے جتنا ذخیرہ اس نظام میں موجود ہے اتنا آسان ذخیرہ شاید ہی کہیں اور جگہ مل سکے۔ یہ نظام ایک طرف تو سائنٹیفک تحقیقات کے لیے بے شمار دفینے اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور ہر محقق کو آئے دن اس میں غور و فکر کے لیے نظر و اعتبار کے مختلف پہلو دیتا ہے۔ دوسری طرف ہر ایک کے لیے یہ بات سرمایہ بصیرت و بصارت ہے کہ زمین جتنی نباتات اگاتی ہے سب کے لیے ایک خاص اندازہ مقرر ہے۔ ایک خداپرست یہ سب دیکھ کر کہتا ہے کہ کسی خالق اور قادر مطلق کی گلکاریاں اور حسن افروزیوں کا نتیجہ ہے۔ اور قدرت خداوندی پہ غور و فکر کرنے کے لیے قرآن کریم میں بہت سے مواقع میں مستقل مضامین آئے ہیں اور ان کی پوری حقیقت تک رسائی زراعت کا پیشہ اختیار کرنے والے ہی کو ہو سکتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ۔۔۔[1]﴾ پس چاہیے کہ دیکھے انسان اپنے کھانے کی طرف کہ ہم نے برسایہ ہے پانی خوب، پھر ہم نے زمین کو چیر کر پھاڑا۔ پھر ہم نے اس میں اناج اگایا۔ اور انگور اور ترکاریاں۔ اور زیتون اور کھجور۔ اور گھنے باغ۔ اور میوے اور گھاس۔

اسی طرح سورۃ نحل آیت نمبر 5، یونس آیت 4، حج آیت 10، الانعام آیت 12 اور سورۃ کہف آیت 6 میں زراعت و باغبانی کا نظام پیش کر کے قدرت کی کارفرمائیوں اور جلوہ آرائیوں پہ جہاں مستحکم دلیلیں قائم کیں ہیں وہیں ان مظاہر کا سمجھنا اور ان سے عبرت حاصل کرنا بھی انہی کو حاصل ہے جو اس پیشہ و حرفت میں لگیں گے۔ پہلا منافع تو اس صورت میں ہوا کہ بنیادی اسلامی

---

[1] عبس: 24-28

تصور توحید کی وضاحت اس سے ہو گی اور ساتھ ہی انسانی منافع اور لوگوں کو خیر پہنچنے کا ذریعہ ہوا۔امام بخاریؒ "الادب المفرد" میں حدیث لائے ہیں:

((إِنْ قَامَتِ السَّاعَةُ وَفِي يَدِ أَحَدِكُمْ فَسِيلَةٌ، فَإِنِ اسْتَطَاعَ أَنْ لَا تَقُومَ حَتَّى يَغْرِسَهَا فَلْيَغْرِسْهَا))[1] اگر کسی کو اتنی فرصت ملے کہ اس کے اور علامت قیامت کے قائم ہونے میں کچھ گھڑیاں باقی ہوں تو پھر بھی درخت لگالے کہ اس کے بعد بھی انسانیت کچھ رہے گی اور درختوں میں اس کے لیے منافع ہوں گے۔دوسری روایت میں فرمایا:

((إِذَا سَمِعَ أَحَدُكُمْ بِالدَّجَّالِ، وَفِي يَدِهِ فَسِيْلَةٌ، فَلْيَغْرِسْهَا، فَإِنَّ للنَّاسِ عَيْشًا بَعْد[2])) اگر خروج دجال کی بھی خبر ملے تو درخت لگانا کہ انسانیت اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تو رہے گی اور ان درختوں سے نفع اٹھائے گی۔

رسول اللہ ﷺ نے مختلف موقعوں پر اس کی طرف متوجہ کیا ہے اور اس کی ترغیب دی ہے۔

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا، أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا، فَيَأْكُلُ منه طَيْرٌ أَوْ إِنْسَانٌ أَوْ بَهِيمَةٌ، إِلَّا كانَ له به صَدَقَةٌ[3])) اگر کوئی مسلمان کسی درخت کا پودا لگاتا ہے اور اس درخت سے کوئی پرندہ، انسان یا جانور کھاتا ہے تو لگانے والے کے لیے وہ صدقہ ہوتا ہے۔رسول اکرم ﷺ نے یہ حقیقت واضح فرمادی کہ کاشتکار کو صرف فعل زراعت کی وجہ سے ثواب ملتا ہے اس کی نیت ثواب حاصل کرنے کی ہو یا نہ ہو کیوں کہ زراعت کرنے سے بہر صورت خلق خدا کو فائدہ پہنچتا ہے خواہ کاشتکار فائدہ پہچانا چاہے یا نہ چاہے۔اسلام کی نظر میں اصل نیکی اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہچانا ہے۔جس کام سے خلق خدا کو جتنا زیادہ فائدہ پہنچے گا اس کا کرنے والا اتنا ہی زیادہ اجر وانعام کا مستحق ہو گا۔زراعت میں چونکہ دوسروں کو فائدہ پہچانے کا پہلو زیادہ نمایاں ہے اس لیے اس کی فضیلت بھی زیادہ ہے۔[4]

---

[1] البخاری: الادب المفرد، 479

[2] المناوی، زین الدین محمد، القاھری، **التیسیر بشرح الجامع الصغیر**، 372/1

[3] البخاری: جامع الصحیح، **کتاب المزارعۃ**۔ حدیث: 6012

[4] امینی، تقی الدین، **اسلام کا زراعی نظام**، (دار الاشاعت)، ص، 163

زراعی نظام اور حکومت وقت:

حکومت وقت کی ایک بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ کسی کی حق تلفی اور نزاع کا اندیشہ نہ ہو، اس لیے عموماً جو علاقے فتح بھی کر دیے جاتے زمینیں انہی لوگوں کے حوالے کر دی جاتی تھیں اور ان سے ایک مخصوص مقدار ریاست کو پہنچتی تھی جیسے اہل خیبر کی زمینیں انہی کے حوالہ کر دی گئیں۔[1]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ایک حکم نامہ جاری فرمایا: تمارے طرف جو بیکار اور خالی زمینیں پڑی ہیں ان سب کو کاشتکاروں میں تقسیم کر دو اور پیداوار کے نصف حصہ پر ان سے معاملہ کر لو۔ اگر وہ لوگ اس پر راضی نہ ہوں تو پیداوار کا جتنا حصہ دینے پر وہ راضی ہو جاہیں تو اتنے پر ہی معاملہ کر لو حتی کہ اگر دسواں حصہ خلافت کو دینے پر راضی ہوں تو اسے بھی تسلیم کر کے انہیں زمین دے دو اور اگر وہ اس پر بھی تیار نہ ہوں تو سرکاری خزانہ کے اخراجات سے زمین پر کاشت کر لو لیکن کسی صورت میں زمین بیکار نہ رہنے دو اور نہ کسی سے زمین زبردستی چھینو۔[2]

مسلم حکومت ارض اللہ کو کبھی بنجر اور ناکارہ رکھنا برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر صاحب زمین کسی معقول وجہ سے کاشت نہ کر سکے تو وہ کسی سے بٹائی (مزارعت) پر معاملہ کر لے۔ مزارعت کی حیثیت شرکت جیسی ہوتی ہے اور فریقین دو شریکوں کی طرح ہوتے تھے۔ زمانہ خلافت میں رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات نے سماج کا ڈھانچہ اس طرح بدل دیا تھا کہ لوگوں میں ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ غالب ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانا، نیکی و بھلائی کرنے میں سبقت کرنا اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینا ایک عام چلن بن گیا تھا۔ اس کی بنیاد وہ قرآنی تعلیمات تھیں۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ[3]﴾ ہر گز نیکی میں کمال حاصل نہ کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز سے کچھ خرچ کرو۔

ان اسلامی تعلیمات کا اثر جب معاشرہ میں قائم ہو جائے تو حقیقی اعتدال کی صورت جو دلوں میں نیکی اور انسانی ہمدردی پیدا کر دیتی ہے اور دوسروں کی خون پسینہ کی کمائی پر عیش کے ذرائع کو ختم کر دیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ انفرادی اور ذاتی حق اور نفع کا بھی پورا خیال رکھتی ہے۔ اسلامی حکومت ایسا نظام قائم کرتی ہے کہ کوئی شخص دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور اس طرح مفت خوروں کا ایک طبقہ پیدا ہو کر جسم انسانیت کا ناسور ثابت نہ ہو۔ اسی لیے مزارعت کے مسئلہ میں مسلم، کافر، حربی، ذمی، دار

---

[1] البخاری، الجامع الصحیح۔ **کتاب الاجارۃ**، بَابُ اسْتِئْجَارِ الْمُشْرِكِينَ عِنْدَ الضَّرُورَةِ، ح: 2263۔

[2] امینی، تقی الدین، **اسلام کا زراعی نظام**، ص 173

[3] ال عمران: 92

الحرب اور دارالاسلام سب برابر ہوتے تھے۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے مزارعت کی ان شکلوں سے منع کر دیا تھا جن میں باہمی نزاع اور حق تلفی کا اندیشہ ہوتا تھا۔ رافع ابن خدیج رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

((كُنَّا أَكْثَرَ الْأَنْصَارِ حَقْلًا فَكُنَّا نُكْرِي الْأَرْضَ، فَرُبَّمَا أَخْرَجَتْ هَذِهِ وَلَمْ تُخْرِجْ ذِهِ، فَنُهِينَا عَنْ ذَلِكَ وَلَمْ نُنْهَ عَنِ الْوَرِقِ[1])) ہم اکثر انصار کاشتکاری کیا کرتے تھے اور ہم زمین بٹائی پر دیتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کسی کھیت کے ایک ٹکڑے میں پیداوار ہوتی اور دوسرے میں نہ ہوتی اس لیے ہمیں اس سے منع کر دیا گیا لیکن چاندی (روپے وغیرہ) کے لگان سے منع نہیں کیا گیا۔

ایسے ہی زمین کی آبادکاری میں نقدی کرایہ پر بھی معاملہ کیا جاتا تھا۔ یعنی کاشتکار کو زمین کرایہ پر دی جاتی تھی اور مالک زمین کو سوائے کرایہ کے کچھ بھی نہ ملتا تھا۔ "وَجَازَ اِسْتِيْجَارِ الْأَرْضِ لِلزَّرَاعِ"[2] کھیتی کے لیے زمین کرائے پر دینا جائز ہے۔ ایسے ہی باغوں کی آبادکاری کے لیے مساقاۃ کا ایک پورا نظم مرتب کیا گیا ہے۔

نہری نظام اور حکومت وقت:

انسانی ترقی تسخیر کائنات کی طرف قدم بڑھاتی ہے تو بہتے پانیوں پہ بند لگایا جاتا ہے اور پانیوں کو ایک راہ پر استوار کر کے ایک نہری نظام کا وجود بنتا ہے۔ اور پاکستان کا نہری نظام دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام شمار کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام میں پانی مباح عام ہوتا ہے نہ کسی کو اس سے روکا جاتا ہے اور نہ ہی کسی سے ٹیکس لیا جاتا ہے۔ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((المسلِمونَ شُرَكاءُ في ثلاثٍ: في الكلأ، والماءِ، والنَّارِ[3])) گھاس، پانی اور آگ میں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ((لَا يَمْنَعُ فَضْلَ الْمَاءِ[4])) زائد پانی سے کسی کو نہیں روکا جائے گا۔

حکومتِ پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دریاؤں سے نہریں نکالے یا ان کی اصلاح و درستی کرے، پل باندھے، بند لگائے، آبپاشی کو زیادہ سے زیادہ عام اور سہل بنائے اور یہ سب کچھ سرکاری خزانہ سے کیا جائے اور اگر خزانے میں گنجائش نہ ہو تو مختلف ٹیکسوں اور ہنگامی چندوں سے یہ سب انتظام کیا جائے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے: خلیفہ کے ذمہ لازم ہے کہ بڑے بڑے دریاؤں سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکالے اور ان کی اصلاح و درستی کرے، بند وغیرہ کی خرابی کا اندیشہ ہو تو اس کی اصلاح کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کا تعلق پبلک کے عام مفاد سے ہوتا ہے اور حکومت مفاد عامہ کی نگران ہے۔ زمانہ خلافت میں سرکاری خزانہ سے بہت سے نہریں نکالی گئیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں نہر ابو موسیٰ، بصرہ میں، نہر سعد کوفہ میں اور

---

[1] بخاری، جامع الصحیح، **باب ما یکرہ من الشروط فی المزارعۃ**۔

[2] فتاوی علمگیری، **کتاب الاجارۃ** مکتبہ رشیدیہ، ص 52

[3] ابوداود: 3477

[4] بخاری، **الجامع الصحیح**، 34/2

نہرامیر المومنیں مصر میں۔اسی طرح نہر ساور، نہر دیبلس، نہر عمرواور نہر حرب وغیرہ نکالی گئیں۔[1] ان نہروں سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ کار حکومت کا وضع کردہ تھا جس میں اس بات کی خاص رعایت رکھی گئی کہ حقوق عامہ پامال نہ ہوں اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کا پانی میسر آسکے۔ایسی نہروں کی صفائی اور اصلاح ریاست کے ذمہ تھی۔اور اگر سرکاری خزانہ اس کا متحمل نہ ہوتا تو پوری عوام اس کی ذمہ دار ہوتی۔اور یہ سب ضرورتیں اسلامی نظام حکومت میں اراضی کی آبادکاری کی ہیں۔

اراضیہ اموات اوران کااحیاء:

بنجر زمین یاارض موات ایک فقہی وشرعی اصطلاح ہے۔زمینی آبادکاری سے انسانیت کو نفع پہنچے اس کے لیے آبادکاری کی مختلف شکلیں مقرر کی گئیں۔جن میں سے ایک یہ ہے کہ حکومت اپنے مصارف پر اس کو آباد کروائے، جیسے کتاب الخراج میں ہے:

"اِنْ شَاءَ اَنْفِقْ عَلَيْهَا مِنْ بَيْتِ الْمَالِ لِلْمُسْلِمِيْنَ[2]" حکومت مناسب سمجھے تو سرکاری خزانہ سے اس میں کاشت کروائے۔

آبادکاری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کاشتکار کو محض حقِ کاشت دیا جائے اور اس کے منافع کاشتکار استعمال کرے۔جس کی مروجہ شکل لیز پر زمینیں دینا بھی ہے۔اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ کاشتکار کو مالکانہ حقوق دے کر زمینوں کی آبادکاری کروائی جائے اور حکومت کا مقصد ہی غیر ضروری اراضی کو قابل کاشت بنانا ہوتا ہے۔مجموعی حیثیت سے تمام زمینیں اللہ کی ملک قرار دی گئی ہیں اور حکومت انتظام و نگرانی کرتی ہے۔جب تک مفاد عامہ کی حفاظت ہو تو حکومت کو کسی کے کام میں دخل دینے کی ضرورت نہیں لیکن جب اس کی خلاف ورزی ہو یا تنظیم و تقسیم کی کوئی عمدہ صورت سامنے آئے جس میں خلق کا نفع زیادہ معلوم ہو تو حکومت کو مفاد عامہ کے پیش نظر ہر نفع بخش صورت اختیار کرنے کی اجازت ہے البتہ جن سے معاہدات کر دیئے جاہیں ان کی زمینوں پر حکومتی تصرف پر بندش ہو گی جب تک کے معائدہ کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔حکومت کی اصل ذمہ داری اراضی کی تنظیم و تقسیم میں منشاءالٰہی کا پورا کرنا اور اللہ کی مخلوق کے لیے نفع بخش صورتیں وضع کرنا ہے۔

حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں جب عراق فتح ہو کر اسلامی ریاست کا حصہ بنا تو آپ سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اس زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم کر دیں لیکن سورۃ الحشر میں نازل شدہ احکامات کی رو سے چونکہ تمام ذرائع پیداوار اللہ تعالی کی ملکیت میں اور رسول اللہ ﷺ اور ان کے اطاعت شعار صحابہ کی تولیت میں آچکے تھے۔اس لئے حضرت عمرؓ نے جو فیصلہ کیا اسے قاضی ابو یوسفؒ نے اپنی کتاب "کتاب الخراج" میں اس طرح درج کیا ہے: آپ نے فرمایا: "میں چاہتا ہوں کہ یہ زمین مع کاشتکار ریاست کی ملکیت قرار دوں اور اس کے کاشت کرنے والے پر خراج عائد کروں اور ان پر فی کس جزیہ بھی مقرر کروں جسے وہ ادا کرتے رہیں۔اس طرح یہ دونوں یعنی جزیہ اور خراج مسلمانوں کے لئے ایک مستقل فَے یعنی آمدنی کا ذریعہ ہوں گے جس میں مجاہدین بھی اور عام

---

[1] البلازری، احمد بن یحیٰ، **فتوح البلدان**، مؤسسۃ المعارف للطباعۃ والنشر، بیروت۔1761ء

[2] ابو یوسف، **کتاب الخراج**، ص۔22،

مسلمانوں کی آئندہ نسلیں بھی سب حصہ دار ہوں گی"۔ صحابہ نے حضرت عمر کے اس اعلان کی مکمل تائید کی چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے پر امت کا اجماع ہو گیا اور حضرت عثمان بن حنیفؓ کو ان زمینوں کے بندوبست کے لئے مامور کیا گیا تھا[1]۔

زمین کی ملکیت کے حوالہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان قابل توجہ ہے کہ جس میں فرمایا گیا ہے:

((عَادِيُّ الْأَرْضِ لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ ثُمَّ لَكُمْ مِنْ بَعْدُ، فَمَنْ أَحْيَا شَيْئًا مِنْ مَوَتَانِ الْأَرْضِ فَلَهُ رَقَبَتُهَا مَيْتَةً فَهِيَ لَهُ وَلَيْسَ لِمُحْتَجِرٍ حَقٌّ بَعْدَ ثَلَاثِ سِنِيْنَ[2])) غیر آباد زمین اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی ہے پھر اس کے بعد تمہاری ہے، پس جو اس کو آباد کرے وہ اسی کی ہے اور جس نے اس کو تین سال تک بغیر کاشت کے چھوڑ دیا تو اس کا حق ساقط ہو گیا۔

بہر حال حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ جو عراق کے حاکم تھے انھوں نے زمینوں کی پیائش کروا کر مختلف شرحوں سے خراج عائد کر دیا ان تمام تفاصیل کو امام ابو یوسفؒ نے کتاب الاموال میں درج کیا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ: "گیہوں کے ایک کھیت پر چار درہم، گنے کی کاشتکاری پر چھ درہم، کھجور پر آٹھ درہم، جَو کے کھیت پر دو درہم اور انگوروں کے باغات پر دس درہم فی جریب مقرر کیا۔ اور اس ضمن میں مختلف افراد پر بارہ سے اڑتالیس درہم کے حساب سے جزیہ عائد تھا۔ عورتیں اور بچے جزیہ ادا کرنے سے مستثنیٰ تھے۔[3]

خلاصہ:

اس فصل کا خلاصہ یہ ہے کہ شرعی اعتبار سے اراضی کی مندرجہ ذیل قسمیں ہوتی ہیں۔

(1) اراضی شخصیہ: یعنی جو کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں ہو۔

(2) اراضیٔ سلطانیہ: یعنی جو بیت المال کی ملکیت ہو۔

(3) اراضیٔ موقوفہ: یعنی جو کسی نے وقف کر کے رکھی ہوں وہ کسی کی ملکیت نہیں ہوتیں لیکن اس کا نفع مختلف موقوف علیہم کو پہنچتا ہے۔

(4) اراضیٔ اموات: یعنی بنجر زمینیں، بنجر سے مراد یہ ہے کہ کسی نے اپنی محنت سے اس پر کوئی کاشت نہ کی ہو اور اگر کچھ خود رو پودے اس میں ہیں تو وہ بھی موات میں شامل ہیں کیونکہ موات کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس میں کوئی پیداوار نہ ہو بلکہ موات

---

[1] ابو یوسف، امام، **کتاب الخراج**، ص 91

[2] ایضاً: ص، 321

[3] ابو یوسف، **کتاب الاموال**، ص 25

یہ ہے کہ کسی نے اپنی محنت سے اس کو آباد نہیں کیا چاہے اس میں کچھ خودرو درخت کھڑے ہوں۔ لہذا نہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت ہیں، نہ وقف ہیں اور نہ اراضئ بیت المال ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ ایسی زمین ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص بھی اس کا احیاء کرے گا وہ اس کا مالک بن جائے گا۔

(5)اراضئ مباحہ: یعنی وہ زمینیں جن سے کسی بستی کے حقوق متعلق ہوں یعنی بستی کے پاس کوئی جگہ ہے جس میں بستی کے لوگ اپنے جانور چراتے ہوں یعنی چراگاہ ہے یہ اراضئ مباح ہے جس میں ہر ایک شخص کو اپنے جانور چرانے کا حق حاصل ہے وہ نہ کسی کی ذاتی ملکیت میں آسکتی ہے نہ وقف ہو سکتی ہے اور بیت المال اس کا مالک ہے اور نہ اس کو موات کی طرح احیاء کر کے اپنی ملکیت میں لایا جاسکتا ہے بلکہ وہ ہمیشہ مباح عام رہیں گی ان سے ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق فائدہ اٹھائے گا چاہے اس میں بکریاں چرائے یا اس میں درخت اگے ہوئے ہوں تو اپنے ایندھن کے لئے درخت کی لکڑیاں کاٹے اور اگر اس میں گھاس لگی ہوئی ہے تو گھاس کاٹ کر اپنے ذاتی استعمال میں لائے ہر ایک شخص کو یہ حق حاصل ہے۔ بعض مرتبہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو اراضی شخصاً مملوکہ نہ ہو اور جو اراضی موقوفہ نہ ہو وہ سب سرکاری ملکیت ہوتی ہے اور آج کل کا قانون بھی یہ ہے کہ جو زمینیں غیر آباد پڑی ہوئی ہیں اس کو اپنی طرف سے سرکاری زمین سمجھتے ہیں جس کا مطلاب یہ ہے کہ عوام اس کے مالک نہیں ہیں۔ لہذا شرعاًیہ تصور بالکل غلط ہے کیونکہ جو زمین غیر آباد پڑی ہوئی ہے وہ یا تو مباح ہو گی یعنی اگر کسی بستی کی ضروریات اس سے متعلق ہیں تو اس کو کبھی کوئی ملکیت میں نہیں لا سکتا اور اگر اس سے بستی کی ضروریات متعلق نہیں ہیں اور غیر آباد ہے تو موات ہے یعنی جو بھی آباد کرے گا وہ اس کا مالک بن جائے گا یہ اسلام کا نظام اراضی ہے۔ لہذا یہ سمجھنا کہ جو موات پڑی ہے وہ سرکاری ملکیت ہے یہ خیال غلط ہے۔ سرکار صرف اس صورت میں اس کی مالک ہو سکتی ہے جب اور مسلمانوں کی طرح وہ خود اس کو آباد کرے۔ یعنی جو زمین موات پڑی ہے حکومت نے اس کو آباد کر دیا، اس میں مکانات بنا دیئے، تعمیرات کرادیں، اس میں کھیتی کھڑی کر دی، اس میں درخت لگا دیئے تو بے شک اس کی مالک بن جائے گی اور وہ اراضی سلطانیہ میں داخل ہو گی لیکن جب تک یہ سب نہیں کیا تو وہ نہ کسی فرد کی ملکیت ہے اور نہ حکومت کی ملکیت ہے۔

فصل سوم: سرکاری املاک کی آبادکاری

فصل سوم: سرکاری املاک کی آبادکاری:

سرکاری املاک کی آبادی کاری حکومت کے فرائض میں شامل ہے کیوں کے سرکاری املاک بھی بل واسطہ عوام کی ہی پراپرٹی ہوتی ہیں اور عوام کے جان ومال کا تحفظ یہ ریاست کی اولین ذمہ داریوں میں سے ہے۔ سرکاری املاک سے مراد وہ تمام منقولہ اور غیر منقولہ اشیاء اور اثاثے ہیں جو حکومت کے قبضہ میں ہوں اور حکومت ان کا انتظام وانصرام کرتی ہو۔ یہ املاک حکومتی ملکیت تصور ہوتی ہیں لیکن در حقیقت یہ تمام عوام کی مشترکہ پراپرٹی ہوتی ہیں نہ کہ کسی فرد واحد کی اس لیے کسی بھی شخص کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ ان کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھ کر بے جا استعمال میں لائے۔ ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ سرکاری املاک کی حفاظت اور آباد کاری میں اپنا کردار ادا کرے۔ اس فصل میں ہم سرکاری املاک، ان کی اقسام اور ان کی آبادی کے طریقہ کار کو ذکر کریں گے۔

سرکاری املاک:

1- ائیرپورٹس
2- بندرگاہیں
3- ڈیمز
4- ریلویز
5- ادارے (سکول، کالجز، یونیورسٹیاں)
6- ہاسٹلز
7- سرکاری عمارات (ریسٹ ہاؤسسز وغیرہ)
8- ساحلِ سمندر
9- دریاؤں ونالوں کے ارد گرد کی اراضی
10- پبلک مقامات (پارکس، پلے گراؤنڈز اور تفریح مقامات)
11- جنگلات
12- خالصہ اراضی
13- رکاز
14- معدنیات

15- پٹرولیم مصنوعات

16- بجلی کے ذخائر

17- عجائب گھر

18- ثقافتی ورثے

19- میوزیم

20- ریڈیو، ٹی وی اسٹیشن

21- ایکسچینجز

22- پلازے، اپارٹمنٹس

23- بنکس

24- حکومتی خاص عمارات (کمیونٹی ہالز، کنونشن سنٹرز)

25- یتیم خانے

26- حکومتی مساجد و مدارس، مزارات، مندر، چرچ)

27- رفاہی ادارے (فائر بریگیڈ، ریسکیو 1122)

28- سپورٹس کمپلیکس

29- حکومتی ہاوسنگ سوسائٹیاں

30- روڈز، موٹرویز، ہائی ویز

31- حکومتی صنعتیں (ملز، سٹیل ملز)

32- پالیمنٹ ہاوسسز، کوارٹرز

33- کورٹس، کچہریاں

34- عید گاہیں

35- جنازہ گاہیں

36- پولیس سٹیشنز

37- پوسٹ آفسسز

38- سرکاری گاڑیاں، بسیں

39- ہوائی جہاز

40- ٹرینیں

پاکستان میں سرکاری املاک کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہمیں اس کی تین اقسام نظر آتی ہیں۔

1- وہ املاک جو فیڈرل گورنمنٹ کے زیر انتظام آتی ہیں

2- وہ املاک جو صوبائی گورنمنٹ کے زیر انتظام آتی ہیں

3- وہ املاک جو لوکل اور ایڈمنسٹریٹو باڈی کے تحت آتی ہیں

یہ تقسیم اس لیے کی گئی کہ ان میں سے ہر ایک کی آبادکاری کی مختلف صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں۔ چونکہ سرکاری املاک کی تین درجن سے زائد اقسام گزر چکی ہیں لہذا ان میں سے ہر ایک کی آبادکاری کی بھی مختلف صورتیں ہوں گی۔

1- وفاقی و فیڈرل گورنمنٹ کے تحت آنے والی املاک

i. ائیر پورٹس اور بندرگاہیں

ii. ریلوے اسٹیشنز اراضی

iii. ڈیمز

iv. مختلف یونیورسٹیز

v. دریاؤں کے ارد گرد کی اراضی و مختلف املاک

vi. پارلیمنٹ، مقننہ، کورٹس کی عمارات و اراضی

vii. اسلام آباد کیپیٹل ٹرایٹری (ICT)

viii. موٹرویز اور ارد گرد کی اراضی

ix. چیریٹی ادارے

x. سٹیل مل

2- صوبائی حکومتوں کے تحت آنے والی املاک

i. اسمبلی ہاوسسز اور گورنر ہاوسسز

ii. ہاسٹلز، یتیم خانے، پاگل خانے، اولڈ ہاوسسز

iii. کالجز، سکولز، وکیشنل سنٹرز

iv. بعض جامعات

v. پارکس، مونومنٹس، بڑی مساجد

vi. جنگلات

vii. خالصہ اراضی

viii. ڈسپنسریز، ہلتھ سنٹرز

3- لوکل گورنمنٹ وایڈمنسٹریٹو باڈی کے تحت آنے والی املاک

i. پلے گراونڈز

ii. پبلک پارکس

iii. کمیونٹی ہالز

iv. مزارات، درگاہیں اور مساجد

ان تمام املاک پر غور کیا جائے اور ان کی آبادکاری کے حوالے سے اگر بحث کی جائے تو دو طرح کے پہلو سامنے آتے ہیں۔

1- حکومتی وانتظامی پہلو

2- ادارتی پہلو (افرادی پہلو)

حکومتی پہلو سے مراد ان تمام املاک کی آبادکاری کے سلسلے میں کچھ امور ایسے ہیں جو براہ راست حکومت سے متعلق ہیں۔ اگر ان کی تصحیح ہو جائے تو یہ املاک خود بخود آباد ہو جائیں گی۔

عمّال کے تقرر میں میرٹ کا لحاظ:

حکومتی ذمہ داریوں و حکومتی پہلوؤں میں سب سے بنیادی پہلو جو کسی بھی ادارے کی کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے وہ ہے کسی بھی ادارے یا املاک کے سربراہ کے تقرر میں میرٹ کا لحاظ۔ عام طور پر کسی بھی بڑے ادارے میں سربراہ کا تقرر براہ راست حکومت کرتی ہے۔ جس کا دورانیہ چند سال کا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہر ہر ادارے کے ذیل میں تفصیلاً بحث ہو گی۔ پہلے اجمالاً یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کسی بھی ادارے میں براہ راست حکومت کی مداخلت کے بعد سربراہ کے تقرر میں میرٹ کا لحاظ رکھا جائے تو ادارے خود بخود آباد ہو جاہیں گے۔ اس حوالے سے ہمیں سیرت النبی ﷺ اور صحابہ کرام کی زندگیوں سے سینکڑوں واقعات

ملتے ہیں کہ انھوں نے کسی بھی علاقے میں کسی ادارے کا کوئی ذمہ دار مقرر کیا، کسی دستے کا کوئی سپہ سالار مقرر کیا یا کسی بھی شخص کو کوئی ذمہ داری سونپی تو اس میں اپنی رشتہ داری، تعلق واسطہ یا خلافِ میرٹ تقرری نہیں کی بلکہ میرٹ کی بنیاد پر تقرر کیا۔ میرٹ کے حوالے سے اس وقت کے عرف اور آج کے عرف میں شاید اس طرح مماثلت نہ ہو لیکن یہاں ہم یہ مراد لے رہے ہیں کہ ان حضرات نے جن جن افراد کو ذمہ داریاں سونپی ہیں وہ کسی سفارش، اقرباء پروری یا کسی دنیاوی مفاد کے پیشِ نظر نہیں تھیں بلکہ ان چیزوں کو بلکل نظر انداز کیا۔ جبکہ آج کے دور میں اس بات کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ جس کی وجہ سے ہمارے ادارے تباہ ہو رہے ہیں۔ کسی بھی ادارے میں سنیئر ترین فرد کو چھوڑ کر باہر سے کسی ریٹائر آفیسر، جج یا بیوروکریٹ کو لا کر اس ادارے کا سربراہ مقرر کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اداروں میں زوال آنا شروع ہو جاتا ہے اور املاک تباہ ہوتی ہیں

اہلیت وصلاحیت:

ہمارے ہاں پاکستان میں چونکہ کسی بھی ادارے کے سربراہ کے تقرر میں براہ راست حکومت ملوث ہوتی ہے اس لیے اس بات پر بھی بحث کی جاسکتی ہے کہ کسی بھی ادارے کے سربراہ کے تقرر میں مطلوبہ صلاحیت واہلیت کا پایا جانا ضروری ہونا چاہیے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اداروں کی تباہی میں ایک بنیادی عنصر میرٹ کی پامالی ہے۔ اور دوسری چیز سربراہان میں مطلوبہ اہلیت وصلاحیت کا فقدان ہے۔ جہاں اداروں کے ملازمین کے لیے مطلوبہ اہلیت وصلاحیت کا ہونا انتہائی ضروری ہے ایسے ہی سربراہانِ ادارہ میں بھی مطلوبہ صلاحیت کا ہونا اشد ضروری ہے۔ قرآن مجید میں صراحتاً اس بارے میں حکم موجود ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا[1]﴾ بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل لوگوں کے سپرد کرو۔ اور یہ امانت جب مطلوبہ اہلیت کے حامل افراد کے حوالے کی جائے گی تو ادارہ ترقی کرے گا اور اگر نااہل کو سپرد کی جائے گی تو ادارہ ترقی نہیں کر سکے گا۔

قرآنِ مجید میں سیدنا شعیب علیہ السلام کے قصے کا اگر مطالعہ کیا جائے اور سیدنا شعیب علیہ السلام کی بیٹیوں کی سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حق میں گفتگو کو دیکھا جائے تو انھوں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے جو اوصاف گنوائے ہیں ان میں بنیادی چیز یہی بیان فرمائی ہے:

---

[1] النساء:58

﴿إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ[1]﴾ بے شک بہتر نوکر جسے تو رکھنا چاہے وہ ہے جو زور آور امانت دار ہو۔یعنی اس میں مطلوبہ کام کرنے کی بھرپور صلاحیت ہے اور وہ اس کا مشاہدہ کر چکی تھیں۔

تو ان آیات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کسی بھی ادارے کے کسی بھی فرد کے انتخاب میں مطلوبہ اہلیت وصلاحیت کا جانچنا ضروری ہے۔ سربراہ ادارہ میں مطلوبہ صلاحیت کا ہونا تو اس سے بھی زیادہ ضروری ہوتا ہے۔اسی طرح سیدنا یوسف علیہ السلام کے واقعہ پر بھی اگر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔آپ فرماتے ہیں: ﴿اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ[2]﴾ بے شک میں خوب حفاظت کرنے والا جاننے والا ہوں۔یعنی مطلوبہ امور کی ذمہ داری کو نبھانے کا نہ صرف علم رکھتا ہوں بلکہ اس کی اہلیت بھی میرے اندر ہے۔

سورۃ النساء میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا[3]﴾ اور اپنے وہ مال بے سمجھوں کے حوالے نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔

اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ کوئی آدمی کسی ذمہ داری کا اہل نہیں ہے، خاص کر کسی ادارے کی نگرانی کا اہل نہیں ہے، وہ کسی بھی طور پر ادارے کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا تو ایسے افراد کو ذمہ داری دینے سے منع کیا گیا ہے۔اس ضمن میں آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه، قَالَ: بَيْنَمَا النَّبِيُّ ﷺ فِي مَجْلِسٍ يُحَدِّثُ القَوْمَ، جَاءَهُ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ: مَتَى السَّاعَةُ؟ فَمَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُحَدِّثُ، فَقَالَ بَعْضُ القَوْمِ: سَمِعَ مَا قَالَ فَكَرِهَ مَا قَالَ. وقَالَ بَعْضُهُمْ: بَلْ لَمْ يَسْمَعْ، حَتَّى إِذَا قَضَى حَدِيثَهُ قَالَ :أَيْنَ أُرَاهُ السَّائِلُ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ: هَا أَنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ:فَإِذَا ضُيِّعَتِ الأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ، قَالَ: كَيْفَ إِضَاعَتُهَا؟ قَالَ :إِذَا وسِّدَ الأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ.[4]))حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے کہ ایک اعرابی آپ کے پاس آیا

---

[1] القصص:26

[2] یوسف:55

[3] النساء:5

[4] بخاری، الجامع الصحیح، کتاب العلم باب من سئل علما وھو مشتغل فی حدیثہ، فاتم الحدیث ثم أجاب السائل، ح59

اور کہنے لگا: قیامت کب ہے؟ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بات کرتے چلے گئے اور لوگوں میں سے کچھ نے کہا: اس نے جو کہا اس نے سنا اور سوچا کہ کیا کہا۔ ان میں سے بعض نے کہا: اس نے سنا تک نہیں۔ یہاں تک کہ جب آپ نے اپنی بات ختم کی تو فرمایا((قیامت کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے))؟ اس نے کہا: اے خدا کے رسول میں حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا: ((جب تم امانت کو ضائع کر دو تو قیامت کا انتظار کرو))۔ اس نے کہا میں نے اسے کیسے ضائع کیا؟ فرمایا: ((اگر معاملہ کسی ایسے شخص پر بند کر دیا جائے جو اس کا مستحق نہ ہو تو قیامت کا انتظار کرو))۔

یعنی امانت کو ضائع کرنے کے مظاہر میں سے لوگوں کے معاملات جیسے امارت، خلافت، عدلیہ اور مختلف امور ایسے لوگوں کو سونپنا ہے جو ان کو سنبھالنے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ یہ لوگوں کے حقوق کا ضیاع، ان کے مفادات کی پامالی ہے، ان کے دلوں کو بھڑکانا اور ان کے درمیان جھگڑا بھڑکانا ہے۔ اگر لوگوں کے معاملات کی ذمہ داری اٹھانے والا امانت کو کھو دے اور لوگ ان کی نگہبانی کرنے والے کی پیروی کریں تو وہ امانت کو ضائع کرنے میں اس کے مانند ہیں لہذا حکمرانوں کی راستبازی رعایہ کی راستبازی ہے اور حکمرانوں کی بدعنوانی ان کے لیے بدعنوانی ہے پھر اس معاملے کو ان لوگوں کی طرف منسوب کرنا جو اس کے مستحق نہیں ہیں، لوگوں کی اپنے دین سے بے اعتنائی کا واضح ثبوت ہے کہ وہ اپنے معاملات کو اس کے سپرد کر دیں جس کو اپنے دین کی پرواہ نہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب جہالت غالب آجائے اور علم اٹھ جائے۔

ان تمام آیات اور احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ادارے کے سربراہ کے تعین میں جہاں میرٹ کا لحاظ رکھے وہیں مطلوبہ اہلیت کی جانچ پڑتال بھی کرے۔ مطلوبہ صلاحیت سے مراد ہے کہ جس شعبے کی ذمہ داری دی جا رہی ہے اس سے متعلقہ امور کی مکمل واقفیت ہو۔ امانت، دیانت اور صداقت جیسے اوصاف سے متصف ہو۔ کسی بھی ادارے کے سربراہ کے لیے اس ادارے کی طرف سے دیے گئے معیار پر پورا اترنا مطلوبہ اہلیت وصلاحیت کہلائے گا۔ جیسے امام مسجد کے لیے مطلوبہ معیار حافظ اور عالم ہونا ہے۔ اب اس منصب پر کسی غیر حافظ یا غیر عالم کا تقرر درست نہیں ہوگا۔ اسی طرح ہر شعبے میں نگران کے تقرر کے لیے اس شعبے کے مطلوبہ کوائف پر پورا اترنے والے شخص کو ہی نگران مقرر کیا جائے تو یہی درست ہوگا۔ کسی عام شہری یا بزنس مین کو کسی ادارے کا سربراہ مقرر کر دینا خلاف شریعت بھی ہوگا اور اس ادارے کی تباہی اور بربادی کا سبب بھی ہوگا۔

نگرانی:

تیسری چیز جو اس ضمن میں زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ افراد کی نگرانی ہے گویا کسی بھی ادارے کے سربراہ و نگران کے تقرر کے بعد بھی حکومت اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہوتی بلکہ اس کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ تقرر کے بعد اس کی نگرانی بھی کرتی رہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت برائے راست نگرانی کرے اور وقتاً فوقتاً ادارے کی جانچ پڑتال کرتی رہے یا کوئی ادارہ قائم کر دے جس کا کام ہی یہی ہو جیسا کہ پاکستان میں نیب (NAB) یا احتساب کا ادارہ ہے۔ بہر حال براہ راست حکومتی مداخلت انتہائی ضروری ہے۔ اس کے لیے حکومت کا بھی مطلوبہ کوائف پر پورا اترنا ضروری ہے۔ گویا اسلامی حکومت ہونی چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ایک شخص کو گورنر بنا کر بھیجا تو اس علاقے سے شکایت آ گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شکایت کی جانچ پڑتال کے لیے افراد بھیجے اور گورنر کو بھی طلب کیا اور باقاعدہ تفتیش کی، مگر وہ گورنر اس جانچ پڑتال میں بلکل بری ہو گئے اور یہ گورنر صحابی رسول ﷺ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تھے۔[1]

بخاری شریف کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک صاحب کو خیبر کا سالانہ جزیہ، زکوٰۃ اور عشر وغیرہ لینے کے لیے بھیجا۔ وہ وہاں سے یہ سب کچھ وصول کر کے لائے تو آپ ﷺ نے واپسی پر ہر ہر چیز کا نہ صرف حساب لیا بلکہ پوری کی پوری نگرانی فرمائی۔ جسے آج کے زمانے میں آڈٹ کہا جاتا ہے وہ مکمل کیا۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری عمال کی نگرانی بھی ہے۔ یہ چند اہم بنیادی باتیں تھیں جو کسی بھی حکومت کے اداروں کی آبادکاری اور ان کی ترقی میں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔

2-ادارتی پہلو:

کسی بھی ادارے کی آبادکاری میں دوسری اہم چیز اس ادارے اور افراد کی انتظامی صلاحیتوں، ان کی ایمانداری، دیانت داری صداقت وغیرہ سے متعلق ہے۔ عام طور پر مرکزی حکومت براہ راست صرف سربراہ کے تعین کی حد تک ہی ملوث ہو سکتی ہے مگر ان افراد کی صلاحیتوں سے کام لینا، ادارے و مشینری کا استعمال، اوقات کی پابندی، فرائض کی ادائیگی، کام کو اپنا کام سمجھنا، دیانتداری، صداقت اور ادارے کی دن بدن ترقی کی فکر، ادارے کے افراد کی ذمہ داری ہے۔ اس میں حکومت آ کر کسی کو بھی

---

[1] الطبری، محمد بن جریر، **تاریخ طبری، تاریخ الامم والملوک**: 2607، 2606

زبردستی کام نہیں کروائے گی بلکہ ہر شخص خود ہی ذاتی طور پر اپنے کام کا جوابدہ ہے۔اور اس نے حکومت کے ساتھ ساتھ اپنے رب کو بھی جواب دینا ہے۔ کسی بھی ادارے کی آبادکاری کے لیے اس ادارے کے ملازمین اور متعلقہ افراد میں چند امور کا ہونا ضروری ہے۔

1-اطاعت وفرمانبرداری:

قرآن پاک میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ[1]﴾اے ایمان والو!اللہ کی فرمانبرداری کرواور رسول کی فرمانبرداری کرواوران لوگوں کی جو تم میں سے حاکم ہوں۔

اس آیت کے ذیل سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی ادارے کے افراد کو اپنے افسرانِ بالا کے احکام کی اطاعت کرنا ضروری ہے اگر وہ اپنے افسرانِ بالا کے احکام کی فرمانبرداری نہیں کریں گے تو وہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی کریں گے بلکہ اپنے فرائض سے بھی کوتاہی برتیں گے۔

2-امانت داری:

اسلام نے کسی بھی عہدے پر براجمان افراد یا کسی بھی ادارے کے افراد کے ذمہ دار کی ذمہ داریوں کو ان کے حقوق قرار نہیں دیا بلکہ یہی کہا ہے کہ انھیں خدا کی امانت سمجھا جائے اور یہ عہدے اور مناصب خدا کی امانت ہیں۔ایک ادارے کا اعلیٰ افسر اور اس کا عہدہ بھی خدا کی امانت ہے اور ایک سیکورٹی گارڈ و چپڑاسی اور اس کا عہدہ بھی خدا کی امانت ہے۔ہمارے ہاں عمومی طور پر یہ تصور سرے سے ہے ہی نہیں اور اگر کہیں ہے بھی تو وہ صرف یاافسرانِ بالا کے بارے میں یا قومی امانت کا ایک دھندلا سا تصور پایا جاتا ہے۔ لیکن اسلام نے ان کو خدا کی امانت قرار دے کر ان کی پہرادای کے لیے خدائی نگرانی کا تصور دیا ہے تاکہ ہر شخص کو اپنی ذمہ داری کا احساس رہے۔ حکومت کے سامنے جوابدہی کے ساتھ خدا کے سامنے بھی جوابدہی کا تاثر اس شخص کے ذہن میں رہے اور وہ اپنی ذمہ داری دیانتداری سے انجام دے سکے۔ کسی بھی ادارے میں پائے جانے والے افراد کے اندر اس چیز کا احساس پیدا ہو جائے، یہ عہدہ ومنصب اس کے پاس خداتعالیٰ کی امانت ہے تو وہ اس ذمہ داری کو بخوبی انجام دے گا۔وہ امانت سے کام لے گا، دیانت داری سے کام کرے گا، اپنے کام وقت پر کرے گا، حاضری وغیاب پر نظر بھی رکھے گا اور ساتھ ہی کام کو بھی پوری ذمہ داری سے کرے گا۔وہ تحائف وصول نہیں کرے گا اور کام میں ڈنڈی نہیں مارے گا۔

---

[1] النساء،59

3-احساس ذمہ داری:

اللہ تعالی کے نیک بندے عہدوں وذمہ داریوں سے دور رہتے ہیں اور اگر کہیں ان پر کسی قسم کا بوجھ ڈال دیا جائے تو وہ نہ صرف ان کی فکر کرتے ہیں بلکہ لمحہ بہ لمحہ انھیں اس کا احساس رہتا ہے اور اس کے بوجھ تلے دب کر رہتے ہیں۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب خلافت کے لیے نامزد کیا گیا تو انھیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نصیحتیں فرماہیں:

"میں اپنے پیچھے ایک عظیم الشان ذمہ داری چھوڑے جارہا ہوں اور اسی کو سامنے رکھ کر میں نے تمھیں خلیفہ نامزد کیا ہے۔ اور چونکہ تم نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اٹھائی ہے۔۔۔، جب تک تم اللہ سے ڈرتے ہو گے اور اپنی ذمہ داری کو نبھاتے رہو گے تو لوگ تم سے ڈرتے رہیں گے۔[1]

کسی بھی ادارے کے افراد میں اگر احساس ذمہ داری پیدا ہو جائے تو یہ اس ادارے کی آبادکاری اور اس ملک کی آبادکاری کے لیے کافی ہو گا۔ پھر وہ شخص اپنی ڈیوٹی پوری کرے گا صرف وقت گزاری نہیں کرے گا۔ بلکہ اللہ کے سامنے جوابدہی کا تصور لیے ادارے کے ترقی کو کوشش بھی کرے گا۔

4-اکل حرام سے بچنا:

اسلام حرام کی کمائی سے سختی سے منع کرتا ہے خواہ وہ حرام چیزون کی کمائی ہو یا حرام طریقے سے کمائی ہو۔ قران مجید میں ارشاد ہے:

﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ[2]﴾ اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ۔

اب اسلام کے اس پہلو کو سامنے رکھا جائے تو ہر ادارے کے ہر ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ اکلِ حرام سے بچے۔ وہ شخص اپنی ذمہ داریوں کو سمجھے اور احسن طریقے سے انجام دے تو اکلِ حرام سے بچ سکے گا اور اسی طرح حرام اشیاء سے بھی بچے گا

5-خیانت:

کسی بھی ادارے کی ترقی میں افراد کا امین ہونا بھی ضروری ہے۔ انھیں خیانت سے بچنا چاہیے۔ اسلام نے خیانت کرنے والوں کی مذمت بیان کی ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ[3]﴾ بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی ذمہ داریوں میں کوتائی اور خیانت کو اللہ اور اس کے رسول کی خیانت قرار دیا ہے۔ ﴿يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمَانَاتِكُمْ

---

[1] امام، ابو یوسف، **کتاب الخراج**، ص، 6-7

[2] النساء: 29

[3] الانفال: 58

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ[1]﴾اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو اور آپس کی امانتوں میں بھی خیانت نہ کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔اور ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا[2]﴾بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچادو۔

اس آیت میں جہاں میرٹ پر تقرر کا مفہوم مترشح ہوتا ہے وہاں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اپنی ذمہ داری کو اور ڈیوٹی کو بھی پورا کیا جائے۔اور بخوبی انجام دیا جائے۔اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے۔﴿وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ[3]﴾ اور جو کوئی خیانت کرے گا تو اس چیز کو قیامت کے دن لائے گا جو خیانت کی تھی۔

6-رشوت:

رشوت معاشرے کی ایک بہت بڑی برائی ہے اور کسی بھی ادارے کی تباہی میں اس کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے۔کسی بھی ادارے کو تباہ کرنا ہو تو رشوت لے کر نااہل کو اہل بنادو۔ادارہ اس کی نااہلی کی وجہ سے خود بخود تباہ ہو جائے گا۔قرآن وسنت میں اس پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔اگر ہم قرآن وسنت کے ان اصولوں کو اپنالیں اور رشوت سے معاشرے اور اداروں کو پاک کردیں تو ادارے نہ صرف آباد ہو جاہیں گے بلکہ منافع کما کر ملک کی ترقی میں حصہ لیں گے۔انھیں حکومت سے سبسڈی نہیں لینی پڑے گی بلکہ وہ حکومت کو منافع دیں گے۔قرآن میں اس سے منع کیا گیا ہے کہ آدمی کسی کے مال کو ناجائز طریقہ سے کھائے، جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ[4]﴾اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ۔اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

---

[1] الانفال:27

[2] النساء:58

[3] ال عمران، 161

[4] النساء، 29

((اَلرَّاشِیْ وَالْمُرْتَشِیْ کلھما فِی النَّارِ[1]))رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ایک جگہ ارشاد ہے ((لَعَنَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ الرَّاشِیَ وَالْمُرْتَشِیَ فِی الْحُکْمِ[2])) رسول اللہ ﷺ نے مقدمات میں رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

ان باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے عمال وحکمران اور اسی طرح ہمارے حکومتی اداروں میں کام کرنے والے افسرانِ بالا وزیریں ملازمین اگر رشوت سے بچ جائیں تو حکومتی املاک کی آبادکاری ممکن ہو سکتی ہے۔

7- امراءوحکام کو تحائف:

اسلام نے جہاں امانت کو اس کے اہل کے حوالے کرنے کا نظام دیا ہے ساتھ ہی امراء وحکام کی نگرانی کا سسٹم بھی دیا ہے۔جس پر تفصیلاً گفتگو ہو چکی ہے۔اسی طرح اسلام نے امراء، حکام اور ادارے کے کسی بھی ملازم کو تحفے تحائف لینے سے منع کیا ہے۔کوئی کام کروانے کے لیے امراءوحکام کو تحائف دینا ولینا سب حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ رشوت ہی کی ایک شکل ہے اور آپ ﷺ نے اسے سخت ناپسند کیا ہے اور نہ صرف ناگواری کا اظہار کیا بلکہ ان سے تحائف لے کر سرکاری خزانے میں جمع کروادیے۔ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

((انَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ ھدایَا الْأُمَرَاءِ غُلُوْلٌ[3]))رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"اُمراء"حکام اور اہل اختیار"کے ہدایا اور تحفے غلول وغبن ہیں۔

ایک مقام پر حضرت عمر نے ارشاد فرمایا:"اے لوگو تم میں سے کوئی ہمارے کام پر عامل بنایا گیا پھر اس میں سے سوئی یا اس سے اوپر کوئی چیز ہم سے چھپائی تو وہ خائن ہے اور اسے قیامت کے دن لائے گا۔[4]ایک مقام پر ارشاد فرمایا: ((مَنْ شَفَعَ لِأَخِیْهِ شَفَاعَةً فَأَهْدَی لَهُ عَلَیْهَا هَدْیَة فَقَبَّلَهَا فَقَدْ أُتِیَ بَاباً عَظِیْماً مِنْ أَبْوَابِ الرِّبَا[5])) جس نے اپنے بھائی کی شفاعت کی اور اسے اس کے بدلے کوئی تحفہ دیا اور اسے قبول کر لیا تو وہ سود کے بڑے دروازوں میں سے ایک دروازے پر آ گیا۔

---

[1]طبرانی: **معجم الصغیر**،57/1

[2]ترمذی، سنن الترمذی،**کتاب الاحکام، باب ماجاء فی الراشی والمرتشی فی الحکم**،ح1336۔

[3]ابی شیبہ، محمد بن ابراہیم،**المصنف، کتاب البیوع والاقضیۃ، باب فی الوالی والقاضی یھدی الیہ**۔ح21531۔

[4]ابن حزیمہ، **صحیح ابن خزیمہ**،53/4،ح،238

[5]ابوداؤد، **سنن ابی داؤد، کتاب الاجارۃ**،291/3،ح3541

8- سودی لین دین:

اسی طرح بعض اداروں میں سودی لین دین کے معاملات ہوتے ہیں جو کہ سراسر اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ چناچہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبَا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰا[1]﴾ جو لوگ سود کھاتے ہیں قیامت کے دن وہ نہیں اٹھیں گے مگر جس طرح کہ وہ شخص اٹھتا ہے جس کے حواس جن نے لپٹ کر کھو دیے ہیں۔

یہ حالت ان کی اس لیے ہو گی کہ انہوں نے کہا تھا کہ تجارت بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ پھر ارشاد فرمایا: ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ[2]﴾ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ((لَعَنَ آكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهُ وَشَاهِدَيْهِ وَكَاتِبَهُ[3])) سود کھانے والے، لینے والے، دیکھنے والے اور لکھنے والے پر لعنت کی۔ دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((الرِّبَا سَبْعُونَ حُوبًا، أَيْسَرُهَا أَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ أُمَّهُ[4])) سود کے ستر درجے ہیں ان میں سب سے ہلکا یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے نکاح کرے۔ ان آثار سے سود کی حرمت واضح ہو جاتی ہے، لہذا جن اداروں میں سودی معاملات ہو رہے ہیں ان کی آبادکاری اور ان کی بہتری میں پہلا قدم یہ اٹھایا جائے کہ انھیں سود کی لعنت سے پاک کیا جائے۔

9- آسامیوں کی تخلیق:

اسی طرح املاک کی آبادکاری میں جہاں باقی عوامل کا لحاظ ضروری ہے وہاں نئی آسامیوں کی تخلیق اور اس پر اہل افراد کی تقرری بھی ضروری ہے۔ اس کام کے لیے سسٹم کی بہتری کی بھی ضرورت ہے جس پر پہلے بھی ضمناً بات ہو چکی ہے۔ لہذا املاک کی آباد کاری کے لیے ضروری ہے کہ محکمہ جات نئی آسامیاں تخلیق کریں اور پھر میرٹ پر اہل افراد کا تقرر بھی کریں تاکہ جہاں پرانے

---

[1] البقرۃ:275

[2] البقرۃ:276

[3] مسلم، صحیح مسلم، 1291/3، ح-1598

[4] منذری، الترغیب والترھیب۔ 6/3، ح2584

افراد کی ریٹائر منٹ سے آسامیان خالی ہوتی ہیں وہیں نئے شعبوں کے قیام سے نئی آسامیاں بھی تخلیق ہوتی ہیں۔ ان سب آسامیوں پر اہل افراد کا تقرر ہو، جو ان اداروں کی آبادکاری کا ذریعہ ہو گا۔

وفاقی حکومت کے تحت آنے والے اداروں کی آبادکاری:

ائیر پورٹس اور بندرگاہیں:

پاکستان کی معیشت کی بہتری میں ان دو اداروں کی اہمیت مسلم ہے۔ اگر ان میں بہتری لائی جائے تو وہ ملکی معیشت کی ترقی میں بہت حد تک معاون ہو سکتی ہے۔ پاکستان ائیر لائن ایک عرصہ میں دنیا کی سب سے اچھی ائیر لائن شمار ہوتی تھی مگر اب زوال کا شکار ہے۔ اس کی تباہی کی ایک بنیادی وجہ جو پہلے بھی ذکر ہو چکی ہے کہ وہ میرٹ کی پامالی ہے۔ اور دوسری وجہ افراد کی دینی تربیت کی کمی ہے جس کی وجہ سے افراد اپنے فرائض کو ایمانداری سے ادا نہیں کرتے۔ اسی طرح امپلائز کی ضروریات کا لحاظ اس ادارے کی آبادکاری میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اور سالانہ بنیادوں پر ان کی تنخواہوں میں معقول اضافہ، آئے روز نئی تبدیلی سے ہم آہنگی، ان کی نئی پیشہ ورانہ تربیت کا انتظام وانصرام اس ادارے کی آبادکاری میں معاون ثابت ہو گا۔

اسی طرح جب ہم پورٹس کی بات کریں گے تو وہاں پر ان تمام امور کے ساتھ ساتھ ملازمین کی تعطیلات وغیرہ پر ان کو سہولیات دینا ادارے کی آبادکاری میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہو گا۔ ائیر پورٹس اور بندرگاہوں میں اوقات کی پابندی پر سختی سے عملدرامد بھی اس ادارے کی ترقی کا ضامن ہے۔ اعلی افسران وعہدیداران کے لیے فلائٹس کی تاخیر بھی عوام سے اس ادارے کا اعتماد اٹھا رہی ہیں۔ جس پر غور وخوض اس ادارے کی بہتری کا ضامن ہے۔

یونیورسٹیز:

تعلیمی ادارے کسی بھی قوم کا مستقبل سنوارنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ تباہ ہو جائیں تو آنے والی نسلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ کم قسمتی سے ہمارے ہاں تعلیمی اداروں کی زبوں حالی ہماری نسلوں کے مستقبل کے بارے میں ہمیں چیخ چیخ کر بتا رہی ہے کہ انھیں تباہی سے بچالو۔ ان تعلیمی اداروں میں سر فہرست ملکی جامعات ہیں۔ ان جامعات کی آبادکاری میں سب سے پہلی چیز وائس چانسلر کے تقرر کے معاملہ کو مکمل میرٹ پر کیا جائے تو بہت حد تک جامعات کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ ہر فیکلٹی کے ڈین اور ایچ-او-ڈی کی تقرری کو بھی اسی نظر سے دیکھا جائے تو مزید بہتری لائی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اسلامی طرز تعلیم کو ملحوظ رکھا جائے۔ مخلوط نظام تعلیم نہ صرف ہمارے معاشرے کی خرابی کا باعث ہے بلکہ اسلامی تعلیمات کے بھی سراسر منافی ہے۔ اس نظام تعلیم کی

خرابیوں اور سقم کو دور کر کے ان میں بہتری لانا بھی ان کی آبادی کاری میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح ان اداروں کے تمام امپلائیز میں امانت، دیانت، صداقت، اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس، وقت کی پابندی، ذمہ داری کا احساس، فرائض کی ادائیگی، طلبا کے مستقبل کی فکر، ادارے کو قومی ادارہ سمجھنا اور دیگر اہم ذمہ داریوں کے احساس کو پیدا کرنے کے لیے اور دوسرے امور میں بہتری لانے کے لیے پروگرامات، ورکشاپس اور تقریبات کا انعقاد بھی سود مند ہو سکتا ہے۔ یونیوسٹیز کے طلباء وطالبات کی تعلیم کے ساتھ تربیت کی فکر بھی لازمی امر ہے جو باعمل طلباء وطالبات کی تخریج کا ذریعہ ہے اور یہ ان اداروں کی آبادکاری میں سنگ میل ثابت ہوگا۔ یونیورسٹیز کی آبادکاری میں ایک اہم قدم، قابل طلباء وطالبات میں وظائف اور اسکالر شپس کی سہولت مہیا کرنا ہے جس سے جامعات کے نتائج پر اثر پڑے گا اور عوام کا رجحان بڑھے گا۔ بہترین کارگردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلباء اور اساتذہ میں حسن کارگردگی ایواڈ بھی ذوق وشوق کا باعث ہوگا جو ادارے کی آبادکاری میں اہم کردار ادا کرے گا۔

صوبائی حکومت کے تحت آنے والے ادارے:

ہسپتال:

عموماً ہسپتال صوبائی حکومتوں کے تحت آتے ہیں۔ اور ان ہسپتالوں کی آبادکاری میں بنیادی چیز کوالیفائیڈ ڈاکٹرز کی تقرری، ملاوٹ سے پاک ادویات کی فراہمی، جعلی دواؤں پر سختی سے پابندی، اور مریضوں کو بہترین سے بہترین سہولیات مہیا کرنا ہے یہ امور ہسپتالوں کی آبادکاری میں اہم کردار ادا کریں گے۔ طبّی عملہ کی وقتاً فوقتاً ٹریننگ اور اعلی کارگردگی پر حوصلہ افزائی بھی ان اداروں کی کارگردگی پر اثر اندوز ہوگی۔ اسی طرح عمارتوں کی بہتری اور صفائی ستھرائی وغیرہ بھی ایسے عوامل ہیں جو ان اداروں کی کارگردگی کو بہتر بنانے میں معاون ہوں گے۔ اسی طرح آئے روز میڈیکل کے شعبے میں نت نئی چیزیں آرہی ہیں۔ نئے آلات کی فراہمی اور جدید سہولیات کا استعمال بھی اس نظام کو زیادہ بہتر کر سکتا ہے۔

کالجز اور سکولز:

تعلیمی اداروں کی آبادکاری کے ذیل میں سکولز اور کالجز کی بہتری کے لیے بھی سب سے بنیادی بات میرٹ کی بالادستی ہے۔ اساتذہ اور عملے کے تقرر کے طریقہ کار کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی جائے اور فیئر سلکشن کی جائے۔ ایک اہم چیز انتقامی تبادلہ جات ہیں جو ادارے کی کارگردگی پر اثر اندوز ہوتے ہیں اور ایک بہترین معلم کی زندگی میں منفی تبدیلی لانے کا سبب بنتے ہیں۔ ایسے عوامل کا سدباب کیا جائے۔ اساتذہ کرام کی جائزہ رپورٹ مرتب کی جائے اور بہتر نتائج کے لیے ورکشاپس کا اہتمام کیا

جائے۔اور اسی طرح طلباء وطالبات کو کار گردگی کی بنیاد پر انعامات سے نوازا جائے اور ان کے وظائف جاری کیے جاہیں تاکہ عوام میں شوق ورغبت پیدا ہو اور ان اداروں سے کماحقہ مستفید ہوں۔

پبلک سروس کمیشن:

پبلک سروس کمیشن امتحانات لینے کا ایک ادارہ ہے جو کسی بھی دوسرے ادارے کے لیے گزیٹڈ اور نان گزیٹڈ افراد کا انتخاب کرتا ہے۔عام طور پر اس ادارے میں سفارشی عناصر اور نااہل افراد کا تقرر نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی ایسی بہت سی مثالیں ہیں جو اس سسٹم کو خراب کر دیتی ہیں۔اس ادارے کی آبادکاری کے لیے سب سے اہم امر اس ادارے میں ایماندار، صادق، حق گو، بہادر، امانت دار، اور بے باک افراد کا تقرر کیا جائے۔جو دیگر اداروں کے لیے اپنے چنے ہوئے افراد فراہم کر کے باقی اداروں کی بھی بہتری کا سبب بنے۔اسی طرح اس ادارے کا جائزہ بھی لیا جائے تاکہ آئے روز اس کی کار گردگی میں بہتری لائے جاسکے۔اور اس ادارے کے پاس آزادانہ اور منصفانہ انتخاب کا اختیار ہو اور ہر قسم کے سیاسی اثر ورسوخ سے مبرا ہو۔تاکہ اس کے توسط سے پورے معاشرتی سسٹم میں بہتری لائی جاسکے۔

باب ششم: احکام اسلام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹیں اور ان کا حل

فصل اول: احکام اسلام کی تنفیذ کی کوششوں کا جائزہ

فصل دوم: احکام اسلام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹیں

فصل سوم: شرعی احکام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کے خاتمے کے لئے تجاویز

فصل اول: احکام اسلام کی تنفیذ کی کوششوں کا جائزہ

فصل اول: احکام اسلام کی تنفیذ کی کوششوں کا جائزہ

پاکستان وہ واحد ملک ہے جو صرف اسلامی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وجود میں آیا۔ جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک ایسا الگ ملک ہونا چاہئے جہاں مسلمان شریعی احکامات کا نفاذ کر سکیں اور جدید دنیا کے لئے ایک نمونہ بن سکیں۔ بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح اور تحریک پاکستان کے صف اول کے قائدین نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ پاکستان کا دستور اسلامی اصولوں پر مبنی ہو گا اور قرآن و سنت کی تعلیمات سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا اور اسلامی شریعت سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اس ملک کی پالیسی وضع کی جائے گی۔

قائدِ اعظم نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ کہا تھا اور اسے ایک ایسی تجربہ گاہ قرار دیا تھا جس نے عملاً دنیا کو یہ ثابت کر کے دکھانا تھا کہ اسلامی اصول آج کی اس جدید دنیا میں بھی اتنے ہی قابل عمل ہیں جتنے نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ہوا کرتے تھے اور جتنے اسلام کے ابتدائی دور میں تھے۔

ہندوستان کی تقسیم کا عمل برطانوی پارلیمنٹ سے منظور شدہ ایکٹ "قانون آزادی ہند مجریہ 1947ء کے تحت مکمل ہوا تھا۔ اس ایکٹ میں یہ درج تھا کہ پاکستان اور بھارت کی قانون ساز اسمبلیاں جب تک اپنے اپنے ملکوں کے لیے مستقل آئین وضع نہیں کر لیتیں وہ "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ 1935ء کے تحت ملکی معاملات چلاتی رہیں گی لہذا قیام پاکستان کے موقع پر اس ایکٹ میں چند ضروری اور جزوی تبدیلیاں کر کے اسے مملکت خداداد پاکستان کا عارضی دستور قرار دے دیا گیا۔

قیام پاکستان سے لیکر تقریباً چھ ماہ تک پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس نہیں ہوا۔ باوجود اس کے کہ پاکستان ابھی نیا نیا بنا تھا اور اسے بہت سے مسائل درپیش تھے۔ مثلاً: مہاجرین کی آبادکاری، وسائل کی کمی، انتظامی مشینری کی قلت وغیرہ لیکن اس سب کے باوجود یہ جواز پیش نہیں کیا جا سکتا کہ ہم اپنا علیحدہ ملک حاصل کرنے کے آٹھ نو سال بعد تک اپنا دستور نہیں بنا سکے تھے۔ اس دوران آزاد مملکت پاکستان کا حکومتی انتظام وانصرام برطانوی پارلیمنٹ سے پاس شدہ "انڈیا ایکٹ مجریہ 1935ء کے تحت ہی چلتا رہا۔

عدالتی امور بھی انگریزوں کے چھوڑے ہوئے قوانین کے تحت چلائے جاتے رہے مثلاً: تعزیرات ہند 1860ء، ضابطہ فوجداری 1898ء، ضابطہ دیوانی 1908، اور پولیس ایکٹ 1868ء وغیرہ، تمام قوانین جو انگریزی استعمار کے دور میں نافذ کیے گئے تھے جوں کے توں جاری رہے اور سالہا سال تک ان میں کسی تبدیلی کا تو کیا ذکر، ان میں ضروری ردوبدل پر بھی کسی نے سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ آزاد ملک کے آزاد شہریوں کے لیے پولیس ایکٹ بھی من و عن وہی نافذ کر دیا گیا اور آج تک نافذ ہے جو انگریز حکمرانوں نے اپنے غلاموں کو کنٹرول کرنے کے لیے بنایا تھا۔

اسلامی قوانین کے نفاذ کی ضرورت واہمیت:

اسلامی قوانین کا نفاذ اس ہمہ گیر اور بھرپور تبدیلی کا ایک اہم حصہ ہے جسے ہم اقامتِ دین، نفاذ شریعت یا نظام اسلام کا قیام کہتے ہیں اس پورے عمل میں سب سے اہم اور بنیادی کام اسلامی معاشرے میں مختلف میدانوں کے لیے افراد کا تیار کرنا ہے۔ اس طویل عمل میں ایک ایسے نظام معیشت کا قیام بھی شامل ہے جو اسلام کے عدل اجتماعی کے تصور کے مطابق کاروبار اور لین دین کے نظام کو از سرِ نو منظم اور مرتب کرتا ہو، اس میں افراد کے آپس میں تعلقات کی وہ نہج بھی شامل ہے جو قرآن وسنت نے متعین کی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر اس عمل کا ایک لازمی حصہ ایک ایسی حکومت کے ڈھانچے کی تشکیل بھی ہے جو ایک اسلامی ریاست کا طرہ وامتیاز ہونا چاہیے جس کا کام معروفات کا قائم کرنا اور منکرات کو ختم کرنا ہے۔ یہ ایک بھرپور اور ہمہ گیر عمل ہے جس کا ایک جزو اسلامی قوانین کا نفاذ بھی ہے۔

ہم میں سے بہت سے لوگ اس حقیقت کو بڑی آسانی سے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قانون از خود کوئی معاشرتی اصلاح نہیں کر سکتا بلکہ جب معاشرتی اصلاح کا عمل مکمل ہو جائے یا ایک خاص سطح تک پہنچ جائے تو اس اصلاح کے تحفظ اور اس کے خلاف کارفرما قوتوں کا راستہ روکنے کے لیے قانون کا وجود ضروری ہے، جب تک کوئی اسلامی معاشرہ موجود نہ ہو جہاں خاندان اسلام کے نظام و تعلیم کے مطابق استوار نہ ہوں اور جہاں معاشرت، لین دین، اخلاق و کردار، طرز عمل اور افراد کے درمیان ہر قسم کے معاملات شریعت کے تابع نہ ہوں اس وقت تک قانون کے ذریعے کسی ایسے معاشرے کو قائم نہیں کیا جا سکتا جو وہاں پہلے سے موجود نہ ہو، اس سلسلہ مین نبوی نمونہ عمل ہمارے سامنے ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے تیرہ سال تک مکہ میں اسلام کی دعوت دی، افراد اور خاندانوں کو تیار کیا اور ایک ایسی امت مسلمہ تشکیل فرمائی جس کے تحفظ اور فروغ کے لیے اور اسلام کے عمومی مقاصد واہداف کی تکمیل کے لیے ریاست کی ضرورت پیش آئی، پھر ریاست کی بقاء اور تحفظ کے لیے قوانین ناگزیر ہوئے، یوں قوانین کے نفاذ کا مرحلہ سب سے آخر میں آتا ہے۔ نفاذ قانون سے پہلے ریاست کی ضرورت ہے، ریاست سے پہلے معاشرے کی، معاشرے سے پہلے خاندان کی اور خاندان سے پہلے افراد کی ضرورت ہے اور ان سب چیزوں کو منضبط اور منظم کرنے کے لیے ایک ایسی زبردست اور ہمہ گیر تحریک کی ضرورت ہے جس کے نتیجہ میں یہ سارے کام ایک ترتیب سے ہوتے چلے جائیں[1]۔

---

[1] ڈھلوں، ڈاکٹر عرفان خالد، **علم اصول فقہ ایک تعارف**، (شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، 189/3)

اسلامی قوانین کا نفاذ کیسے ہو:

اسلامی قوانین کا نفاذ ایک اسلامی ریاست کی اولین ذمہ داری ہے کیوں کہ جب تک شرعی قوانین کا نفاذ نہ ہو وہ ریاست اسلامی ریاست کہلانے کے لائق نہیں ہے۔ موجودہ جمہوری دور میں ریاست کو اسلامی اصولوں پر کیسے استوار کیا جائے؟ اس کے لیے سب سے پہلے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ شریعت کے احکام تین طرح کے ہیں جن کو علامہ ماوریؒ نے اپنی شہرہ افاق کتاب "الاحکام السلطانیہ" میں ذکر کیا ہے۔ سب سے پہلے وہ بنیادی احکامات ہیں جن کی تصریحات قرآن وحدیث میں واضح طور پر موجود ہیں اور وہ اسلامی شریعت کا لازمی حصہ ہیں اور یہ اسلامی ریاست کے بنیادی عناصر شمار ہونے ہیں ان کو نظر انداز کر کے کوئی معاشرہ اسلامی معاشرہ نہیں کہلا سکتا۔ دوسرے احکامات وہ ہیں جو اجتہادی نوعیت کے ہیں۔ جن کو فقہانے شریعت کی روشنی میں اپنے اجتہادی اصولوں سے مرتب کیا ہے اور ان میں ہر دور میں اختلاف کی گنجائش رہی ہے۔ تیسری قسم کے احکامات انتظامی نوعیت کے ہیں۔ ہر دور میں مسلمان حکمرانوں نے ملکی نظم ونسق کو چلانے کے لیے مختلف ادارے قائم کیے ہیں۔ آج کے دور میں ایک اسلامی ریاست میں کون سی قسم کے احکامات کا نفاذ ہوگا؟ کیا تینوں قسم کے احکامات کا نفاذ ضروری ہے؟ قرآن وسنت اور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تینوں قسم کے احکامات مختلف نوعیت کے ہیں۔ جو احکامات کتاب وسنت سے ثابت ہیں وہ بعینہ واجب التعمیل ہیں ان میں کسی قسم کی لچک کی گنجائش نہیں ہے۔ اور جو احکامات فقہاء کے اجتہاد سے ثابت ہیں ان میں وقت کے فقہاء، مجتہدین اور مفکرین کو اختیار ہے کہ وہ نظری اعتبار سے موجودہ وقت کے تقاضے کے پیش نظر اگر ضرورت محسوس کریں تو مناسب تبدیلی کریں یا نئے احکامات وضع کریں۔ اور جو انتظامی نوعیت کے احکامات ہیں ان کے بارے میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا وہ اس دور کے تقاضوں سے مطابقت بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ ان احکامات میں حالات کے موافق رد وبدل کی گنجائش بہر حال موجود رہتی ہے۔ ان سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے اور اگر کوئی اور بہتر صورت سامنے آئے تو ان کو منسوخ بھی کیا جاسکتا ہے۔

کچھ مسلمان مفکرین ان احکامات کی تقسیم کا لحاظ نہیں کرتے جس کی وجہ سے فکری الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اور دین سے بد ظنی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ آخری قسم کے احکامات کو پہلا درجہ دے دیتے ہیں اور ان کے ذہن الجھنوں اور شبہات کا شکار رہتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ لوگوں دین کے علمبردار بنے ہوتے ہیں وہ ان احکامات کی ان تمام اقسام کو جوں کا توں نافذ کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، اس صورتحال نے شرعی احکام کے نفاذ کے معاملہ کو پیچیدہ بنالیا ہے۔

پاکستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ:

پاکستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ قیام پاکستان کے روز اول ہی سے کسی نہ کسی حد تک جاری رہا بعض حضرات یہ بات بلکہ الزام کثرت سے دہراتے رہتے ہیں کہ پاکستان نے اسلامی قوانین کے نفاذ میں کوئی پیش قدمی نہیں کی اور ہمارا نامہء اعمال اس معاملہ میں صفر کی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ تاثر درست ہیں ہے ہم نے الحمد للہ بہت پیش قدمی کی ہے اور اس معاملہ میں پاکستان کا ریکارڈ دنیا کے بیشتر ممالک سے زیادہ خوش آئند ہے لیکن اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا مطلوبہ کام پورا ہو گیا ہے تو اس رائے سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا جتنا کام ہوا ہے وہ بہت تھوڑا ہے اس کے مقابلہ میں جتنا کام ابھی کیا جانا باقی ہے وہ بہت زیادہ ہے۔

1940ء سے لیکر 1960ء کے بیس سالوں کے درمیان دنیائے اسلام کے کئی ممالک آزاد ہوئے، انڈونیشیا 1945ء مین آزاد ہوا شام اور عراق کو 1946ء میں برطانیہ سے آزادی ملی، پاکستان 1947ء میں وجود میں آیا ان سب ممالک میں مصر، انڈونیشیا، شام، عراق، پاکستان اور سوڈان کے حالات تقریبا ایک جیسے رہے ہیں ان سب ممالک میں عوام کی طرف سے اس بات کا مطالبہ کیا گیا کہ وہاں اسلامی قوانین نافذ کیے جائیں، اسلامی احکامات کے مطابق نظام ریاست قائم کیا جائے اور شریعت کے نفاذ کے اس عمل کو شروع کیا جائے جو مسلم اقوام کی اور ہر مسلمان کے دل کی آرزو ہے۔

پاکستان کی یہ خوش نصیبی تھی کہ اسے بعض ایسے جید اور صاحب بصیرت مدبرین کی فکری اور سیاسی رہنمائی حاصل تھی جن کی وجہ سے پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا عمل صحیح خطوط پر شروع کیا جا سکا اور ایک ایسی مضبوط بنیاد بن گئی جس کو آنے والا کوئی حکمران کبھی ختم نہ کر سکا، اس بنیاد کو کمزور کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں اور اس کو بدلنے کی کوششیں بھی ہوئیں لیکن اللہ تعالی کے فضل و کرم سے یہ بنیاد اتنے مضبوط اتنے معقول اور اتنے منطقی خطوط پر قائم تھی کہ اس کو مٹایا نہیں جا سکا۔

قرارداد مقاصد:

پاکستان کے جید اصحاب علم نے جن میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، سردار عبد الرب نشتر، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مولانا سید ابوالاعلی مودودی، ڈاکٹر عمر حیات ملک، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا راغب احسن، مولانا عبد الحامد بدایونی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، اور مولانا ظفر انصاری شامل تھے یہ طے کیا کہ اسلامی نظام کی سمت میں پیش قدمی کا سب سے اولین اور ابتدائی قدم یہ ہونا چاہیے کہ پاکستان میں ایسے دستور کی تشکیل وتدوین کی جائے جس میں اسلام کے بنیادی تصورات اور احکامات کو سمو دیا گیا اور اسلامی قوانین کے نفاذ کی دستوری ضمانت دی گئے ہو، ریاست کو اس بات کا پابند بنایا گیا ہو کہ وہ ان معروفات کو قائم کرے جن کو قائم کرنے اور ان منکرات کو ختم کرے جن کا ختم کرنے کا قرآن وسنت میں حکم دیا گیا ہے، یہ مطالبہ ایک دستاویز کی شکل میں مرتب کیا گیا اور پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اسے آئینی زبان میں حکومتِ پاکستان اور ریاستِ پاکستان کے ایک اجتماعی نصب العین کے طور پر اختیار کرلے چنانچہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے (جو تحریک پاکستان کے صفِ اول کے قائدین پر مشتمل تھی اور جس کو پاکستان کی نامور مذہبی قیادت کا تعاون اور رہنمائی حاصل تھی) ان سب حضرات کے مشورہ سے جو پہلا کام اپنے ذمہ لیا وہ ایک اہم قرارداد کی تدوین اور اس کو منظور کرنے کا تھا جسے تاریخ پاکستان میں قرارداد مقاصد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے[1]۔

9 مارچ 1948ء کو منظور ہونے والی یہ قرارداد آج تک ایک متفق علیہ قانونی اور دستوری دستاویز کے طور پر پاکستان کے ہر دستور میں شامل رہی ہے پاکستان میں ہر طرح کی حکومت آئی، سیکولرازم کی علمبردار حکومتیں بھی آئیں، اسلام کا نام لینے والی حکومتیں بھی آئیں، جمہوریت کے نعرے الاپنے والوں نے بھی حکومت کی اور ڈکٹیٹر شپ کو سراہنے والے بھی آئے لیکن یہ قرارداد پاکستان کے ہر آئین کا حصہ رہی، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرارداد مقاصد میں شامل بنیادی تصورات پر پاکستان میں ہمیشہ اتفاق رائے پایا جاتا رہا ہے افسوس ہے اس طرح کی کوئی جامع اور متفق علیہ دستاویز مسلم دنیا کے کسی اور ملک کے دستور میں شامل نہیں ہے اسی لیے بہت سے مسلم ممالک میں نفاذ اسلام کے بارے میں پاکستان جیسا کوئی آئینی اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔

اس قرارداد میں مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار بلکہ دنیا کی تاریخ میں بھی پہلی بار، اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ دور جدید کے تمام جمہوری تصورات کو اسلام کے دستوری احکامات سے اس طرح ہم آہنگ کردیا جائے کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اسلامی تعلیم کے فلاں پہلو کی خلاف ورزی کی گئی ہے اور جمہوری تصورات کا بڑے سے بڑا علمبردار یہ نہ کہہ سکے کہ اس میں جمہوریت کے

---

[1] قرارداد مقاصد-آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا۔https://ur.wikipedia.org/wiki

اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا یہ قرار داد اسلامی دستوری اصولوں اور جدید نمائندہ حکومت کی ضرورتوں کے درمیان ایک مثالی متوازن اور ہم آہنگ سلسلہ استدلال پیش کرتی ہے۔

اس قرار داد میں سب سے پہلے دستوری زبان میں اس حقیقت کا اعلان و اعتراف کیا گیا کہ پوری کائنات پر حاکمیت اعلیٰ (Sovereignity) صرف اللہ تعالیٰ کی ہے عوام کے ذریعے مملکت پاکستان کو جو اختیارات حاصل ہوئے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر استعمال کیا جائے گا اس میں یہ بھی قرار دیا گیا کہ جو لوگ حکومت میں آئیں گے وہ عوام کے معتمد علیہ اور چنیدہ نمائندے ہوں گے، یہاں چنیدہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس میں منتخب لوگ بھی شامل ہیں اور ایسے غیر منتخب شدہ لوگ بھی ہیں جو کسی رسمی الیکشن کے ذریعے تو نہ آئے ہوں لیکن عامۃ الناس کے بہترین لوگ سمجھے جاتے ہوں اور مسلمانوں میں اعلیٰ ترین اخلاقی اور دینی معیار کے حامل ہوں قرار داد میں یہ بھی اعلان کیا گیا کہ مملکت خداداد پاکستان میں اسلام کے بتائے گئے جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور سماجی انصاف کے اصولوں کی پوری طرح پابندی کی جائے گی، قرار دار مقاصد نے اسلامی معاشرے کے بعض شعبوں میں پائی جانے والی ان بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا جن کا تعلق ایک جدید، ترقی پسند اور مستقبل پر نظر رکھنے والے معاشرے میں ریاست کے اسلامی تصور کے نشو و نما پانے کی صلاحیت سے تھا اس نے ایک ایسی مشترک بنیاد فراہم کی جس سے عامۃ الناس کے دونوں دھاروں کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ دو سو سال تک ایک نو آبادیاتی ملک میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے ہوئے روایتی مسلم علماء اور جدید مغربی ذہن رکھنے والے دانشور ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔

جب ہم پاکستان کی آئینی تاریخ کا موازنہ بعض دوسرے مسلم ممالک کے سیاسی ارتقاء سے کرتے ہیں تو قرار داد مقاصد کی اہمیت اور زیادہ نکھر کر سامنے آجاتی ہے یہ قرار داد اسلام کے دستوری نظریات کو واضح شکل میں پیش کر کے پاکستان میں اسلامی دستوری فکر کو ایک نمایاں جہت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو ایک واضح شکل بھی دیتی ہے پاکستان میں آئین سازی کی طویل تاریخ مین نہ صرف آئین سازوں نے بلکہ اعلیٰ عدالتوں نے بھی اسے ملک میں نہایت اہم عدالتی دستاویز کے طور پر لیا ہے، ہماری بعض اعلی عدالتوں کے فیصلوں میں قرار دادِ مقاصد کو ملک میں دستور سازی کے لیے ایک مثالی نمونہ اور نقطہ آغاز قرار دیا گیا ہے۔

تاہم اپنی اس تمام تر اہمیت کے باوجود اس قرار داد نے صرف ایسے بنیادی تصورات مہیا کیے جن کی روشنی میں مزید تفصیلات کا تعین جدید دنیا کی عملی حقیقتوں، تاریخی روایات اور مسلمانوں خصوصا برصغیر کی مسلم تاریخ کے تجربات اور یہاں کی اجتماعی اقدار کو سامنے رکھ کر کیا جانا تھا، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دو اہم کوششیں کی گئی ایک غیر سرکاری سطح پر اور دوسری سرکاری سطح پر۔

بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ:

سرکاری سطح پر کی گئی کوشش "بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ" کی شکل میں سامنے آئی یہ بورڈ پاکستان کی مجلس آئین ساز کے تحت وجود میں آیا جس کا کام اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آئین سازی کے معاملات میں مشاورت اور معاونت تھا حکومت پاکستان کی دعوت پر مشہور دانشور اور مفکر علامہ سید سلیمان ندویؒ پاکستان تشریف لائے اور اس بورڈ کی سربراہی کے فرائض کو اختیار کیا اسی طرح اس بورڈ کے دیگر ممبران میں بڑے بڑے دانشور اور مفکرین شامل کیے گئے جیسا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ اور مفتی محمد شفیعؒ وغیرہ۔

بنیادی اصولوں کی ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جس کا یہ کام تھا کہ وہ دستور کا ایک خاکہ تیار کرے اور بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ کی سفارشات کی روشنی میں اس دستوری خاکہ کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنائے اور اس کو اسمبلی میں پیش کرے، ستمبر 1950ء کو جب کمیٹی کا بنایا ہوا دستوری خاکہ منظر عام پر آیا تو اس کی بہت زیادہ تنقید کی گئی کیونکہ یہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے مشابہ تھا اور اس میں بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ کہ بہت سی تجاویز کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور اسکی اکثر سفارشات اسلامی تعلیمات، جموری تقاضوں اور قرارداد مقاصد سے متصادم تھیں۔

رپورٹ میں صرف اس بات پر زور دیا گیا کہ مسلمانوں کے لئے قرآن کی تعلیمات کو ضرور قرار دیا جائے اس کے علاوہ قرآن کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرنے اور منکرات کو مٹانے کے فرائض سے رپورٹ یکسر خالی تھی اور اس میں اس قسم کی کوئی بحث اور سفارش موجود نہ تھی علماء اکرام نے جب اس چیز کو دیکھا تو انہوں نے اس رپورٹ کی شدید مخالفت کی اور اس پر بہت زیادہ تنقید کی گئی چنانچہ دستور ساز اسمبلی نے علماء کی ان تنقیدوں کا نوٹس لیا اور اس بارے میں عوامی رائے طلب کی گئی اور اس رپورٹ پر بحث کو ملتوی کر دیا گیا۔

علماء کرام کا بائیس نکاتی فارمولا:

اسلامی آئین سازی کے حوالے سے جدید اسلامی تاریخ میں سب سے بہترین کوشش غیر سرکاری سطح پر کی گئی جس کے نتیجہ میں ایک جدید اسلامی ملک میں اسلامی آئین کی تدوین کے لیے بائیس نکاتی فارمولا اپنایا گیا یہ فارمولا ملک کے مختلف مذہبی اور فقہی پس منظر رکھنے والے دانشوروں اور علماء کرام نے ملکر تیار کیا جن کہ تعداد تینتیس تھی، تاریخ اسلام میں یہ پہلی مثال تھی جس میں مختلف مکتبہ ہائے فکر کے علمائے دین اور فقہاء نے ملکر کر ایک اہم فقہی اور قانونی مسئلے پر اتفاق رائے سے ایک جامع اور قابل عمل دستاویز تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی، اسلامی تاریخ میں ایسی مثالیں تو ملتی ہیں کہ مختلف قانونی معاملات میں ایسے فقہاء اور علمائے دین نے اجتماعی فیصلہ دیا جن کا تعلق ایک مشترکہ روایت، مکتب فکر یا طرز عمل سے تھا لیکن ایک ایسے قانونی فیصلے کی اولین

مثال شائد بائیس نکاتی فامولے کی صورت میں پہلی بار سامنے آئی تھی، جسے مختلف مذہبی فرقوں اور مختلف فقہی مکاتب فکر کے شارحین نے متفقہ طور پر جاری کیا تھا، ان میں سنی، شیعہ، حنفی، شافعی، مقلد، غیر مقلد مذہبی علماء سب شامل تھے ان حضرات نے بائیس نکات پر مشتمل ایک ایسا مسودہ تیار کیا جس کے بارے میں ان حضرات نے اپنے انتہائی علم و بصیرت کے مطابق یہ قرار دیا کہ اگر یہ بائیس نکات کسی دستور میں سمو دیئے جائیں تو وہ دستور اسلامی دستور کہلائے گا، اس دستور کی بنیاد پر جو ریاست قائم ہو گی وہ اسلامی ریاست کہلائے گی اور وہ ریاست جو قوانین نافذ کرے گی وہ اسلامی قوانین ہوں گے۔

بائیس نکاتی یہ فارمولا ایک کنونشن میں متفقہ طور پر منظور کیا گیا جو جنوری 1951ء میں کراچی میں منعقد ہوا تھا۔

وہ بائیس نکات درج ذیل ہیں:

1- اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

2- ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہو گا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو، اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب و سنت کے خلاف ہوں تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیئے جائیں گے۔

3- مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہو گی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

4- اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلامی کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

5- اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ مسلمانان عالم کے رشتہ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی و لسانی علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

6- مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہو گی جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں، یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعی اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

7- باشندگان ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں یعنی حدودِ قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو، آزادی مذہب و مسلک، آزادئ عبادت، آزادئ اکتساب رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

8- مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سند جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیٔ موقعۂ صفائی و فیصلۂ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

9- مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہیں کے قاضی یہ فیصلہ کریں۔

10- غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب وعبادت، تہذیب وثقافت اور عیسائی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم ورواج کے مطابق کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

11- غیر مسلم باشندگان مملکت سے حدود شریعہ کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوق شہری کا ذکر دفعہ نمبر 7 میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگان ملک اور مسلم باشندگان ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

12- رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

13- رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا البتہ وہ اپنے خیالات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

14- رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکان حکومت اور منتخب نمائندگان جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

15- رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کلی یا جزوی معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

16- جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرت آراء سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

17- رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

18- ارکان وعمال حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون وضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

19- محکمۂ عدلیہ، محکمۂ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئتِ انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

20- ایسے افکار ونظریات کی تبلیغ واشاعت ممنوع ہوگی جو مملکت اسلامیہ کے اساسی اصول ومبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

21- ملک کے مختلف ولایات واقطاع مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں، محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیاست کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

22- دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔

22 دسمبر ۱۹۵۲ء کو مجلس دستور ساز میں مذکورہ بالا رپورٹ پیش کی گئی تو اس اجتماع کے دوبارہ منعقد کیے جانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس میں شرکت کے لیے انہی اصحاب کو دعوت دی گئی جو جنوری ۱۹۵۱ء کے اجتماع میں مدعو تھے۔

درجہ بالا نکات پر اس وقت کے جید علمائے کرام نے دستخط کیے جن میں سید سلیمان ندویؒ، مفتی محمد شفیع عثمانیؒ، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ مولانا یوسف بنوریؒ اور مولانا ادریس کاندھلویؒ جیسے علماء کرام شامل تھے۔[1]

ان بائیس نکات میں سے کچھ نکات کو دستور سازی کے دوران قبول کر لیا گیا اور وہ دستور میں شامل کر لیے گئے لیکن کچھ نکات ایسے بھی تھے جن کو شامل نہیں کیا گیا، وہ نکات جن پر اتفاق رائے ہوا ان میں سے ایک اہم اور بنیادی نکتہ یہ تھا کہ دستور میں واضح طور پر لکھا جائے کہ ملکِ پاکستان کا کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ اور اگر بنا دیا جائے تو اسے ایک خاص طریق کار کے ذریعے چیلنج اور منسوخ کیا جا سکے گا اور جو قوانین پہلے سے پاکستان میں رائج ہیں ان کو ایک خاص مقررہ مدت کے اندر اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے گا۔ یہ واضح اعلان پاکستان کے دستور میں 1952ء سے آج تک لکھا جا رہا ہے اور اس وقت بھی لکھا ہوا ہے۔

قانون کو غیر اسلامی قرار دینے کا اختیار کسے ہو:

پاکستان میں اس بات پر تو کبھی اختلاف نہیں ہوا کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ کیے جائیں اور جو سابقہ قوانین موجود ہیں انہیں اسلام کے مطابق بنا لیا جائے لیکن اس کام کا طریقہ کار کیا ہو؟ اس کے بارے میں پاکستان میں بحث ہوتی رہی ہے دنیائے اسلام کے کئی اور ممالک میں بھی یہ سوال پیدا ہوا۔ اس کے لیے مختلف تجاویز اور تدابیر اختیار کی گئیں۔ ایک تجویز یہ سامنے آئی کہ اس کام کے لیے جید علماء پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا جائے اور جب کوئی قانون اسمبلی میں زیرِ بحث آئے یا کسی قانون کے بارے میں سوال پیدا ہو کہ یہ شریعت سے متعارض ہے یا نہیں تو اسے اس بورڈ کو بھیج دیا جائے اور وہ جو فیصلہ کرے اس کے مطابق زیر بحث معاملہ کو طے کر لیا جائے لیکن یہ تجویز ایسی تھی جس پر بعض دینی قائدین نے بھی چند تحفظات کا اظہار کیا اور بیشتر سیاسی قائدین نے بھی اس سے اتفاق نہیں کیا۔

سیاسی قائدین کا اعتراض یہ تھا کہ ایسا کرنا جمہوری اقدار کے خلاف ہے اس لیے پارلیمنٹ کو جو عوام کی مجاز نمائندہ اور ترجمان ہے مکمل طور پر بااختیار ہونا چاہیے اور اس کے فیصلوں کے اوپر ایک نامزد مجلس کو خواہ وہ کتنے ہی جید اہل علم حضرات پر مشتمل ہو، مقرر کرنا اور اسے پارلیمنٹ کے فیصلوں کی منسوخی کا اختیار دینا جمہوری تصورات کے خلاف ہے اس لیے قابل قبول نہیں ہے۔

دینی قائدین کو جو تحفظات تھے وہ یہ ہیں کہ اگر یہ اختیار حکومتوں کو دے دیا جائے کہ وہ بورڈ قائم کریں تو پھر اس بات کی بڑی گنجائش ہے کہ حکومتیں اپنی پسند کے مولویوں اور دین فروشوں کو مقرر کر دیں اور جس چیز کو چاہیں شریعت سے متعارض اور جس

---

[1] **31 علمائے کرام کے بائیس دستوری نکات**، (ادارہ ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، جولائی 2015، شمارہ 7 ج 6-4/26

چیز کو چاہیں شریعت سے ہم آہنگ قرار دلوالیں۔ان سے چاہیں تو بینک کے سود کو منافع کے نام پر جائز کروالیں اور چاہیں تو انشورنس اور بیمہ کی تمام رائج الوقت صورتوں کو جائز کروالیں۔

تاہم یہ تجویز پاکستان کے دوسرے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے قبول کرلی۔انہوں نے 5فروری1952ء کو جو مسودہ قانون اسمبلی میں پیش کیا تھااس میں یہ تجویز شامل کرلی گئی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان میں مرکز اور ہر صوبے میں ایک ایک بورڈ ہو گا جس میں پانچ پانچ علماء ہوں گے، مرکز میں اسے صدر مقرر کرے گا اور صوبوں میں بورڈوں کا تقرر گورنر کریں گے۔جب بھی نئے انتخابات منعقد ہوں گے اور اسمبلی بنے گی تو اس کے ساتھ ہی علماء کا نیا بورڈ بھی وجود میں آجائے گا۔اس پر مولانا سید ابوالاعلی مودودی اور دوسرے بہت سے حضرات نے اعتراض کیا۔ مولانا مودودی نے کراچی میں وکلاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر الیکشن کے بعد جب سیاسی افراتفری مچے گی اور جو مولوی الیکشن ہار جایا کریں گے وہ گورنروں اور صدر کے پیچھے پھرا کریں گے اور ان مذہبی بورڈوں میں جگہ لینے کی کوشش کریں گے پھر اپنی نامزدگی کروا کے ہر جائز اور ناجائز کام میں حکومتوں کی تائید کیا کریں گے اس لئے یہ تجویز ہمیں قبول نہیں ہے۔

اس تجویز پر دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ اس کے نتیجہ میں ابہام اور فکری ژولیدگی جنم لے گی یاد رہے کہ اس وقت پاکستان میں نو صوبے تھے آٹھ صوبے مغربی پاکستان میں تھے ایک صوبہ مشرقی پاکستان تھا اور دسواں حصہ مرکز تھا یوں علماء کے دس بورڈ بننے تھے۔اعتراض کرنے والے حضرات کا کہنا تھا کہ یہ پچاس علماء مختلف فتوے دیں گے ایک چیز پنجاب میں جائز ہو گی اور بہاولپور میں ناجائز مشرقی بنگال میں مستحب ہو گی اور مرکز میں حرام اس سے شریعت ایک مضحکہ بن کر رہ جائے گی۔

سیاسی قائدین کی طرف سے دوسری متبادل تجویز یہ آئی کہ یہ اختیار پارلیمنٹ کو دے دیا جائے کہ وہ جس قانون کے بارے میں طے کرے کہ وہ شریعت سے متعارض نہیں ہے اس کو باقی رہنے دیا جائے۔اس تجویز کی تائید میں یہ کہا گیا کہ پارلیمنٹ اگر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو گی تو عوام اگر اسلام اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے حق میں ہوں گے وہ یقیناً ایسے لوگوں کو منتخب کر کے پارلیمنٹ میں بھیجیں گے جو شریعت کا علم رکھتے ہوں اور شریعت سے مخلص ہوں۔ایسے منتخب نمائندے شریعت کے خلاف کسی قانون کو پاس نہیں ہونے دیں گے اور موجودہ غیر اسلامی قوانین کو منسوخ یا تبدیل کروادیں گے اس لیے عوام کو اہتمام کرنا چاہیے کہ یہ اختیار پالیمنٹ کو ملے۔ اس تجویز کے علمبردار اس دور کے سیاسی قائدین تھے آج بھی اکثر سیاسی قائدین یہی بات کہتے ہیں۔علامہ اقبالؒ نے بھی بعض تحفظات اور ضمانتوں کے ساتھ اس طرح کی تجویز پر غور کرنے کی دعوت دی تھی۔ انہوں نے اپنے خطبہ "الاجتہاد فی الاسلام" میں پارلیمنٹ کے ذریعہ اجتماعی اجتہاد کیے جانے کو دور جدید کے بہت سے

مسائل کا حل بتایا تھا وہ چاہتے تھے کہ پارلیمنٹ میں علماء کی مؤثر شرکت کے عمل کو یقینی بنایا جائے لیکن افسوس کہ علامہ اقبالؒ کے ان افکار پر کوئی سنجیدہ توجہ نہیں دی گئی۔

تاہم اس دور کے دینی قائدین نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور اصرار کیا کہ یہ اختیار پارلیمنٹ کو نہ دیا جائے ان کو اس بات کا شدید خدشہ تھا کہ پارلیمنٹ میں جو حضرات منتخب ہو کر آئیں گے وہ اپنے علم دین، کارکردگی اور اپنے اخلاقی معیار کے اعتبار سے اس اعلیٰ سطح پر فائز نہیں ہوں گے کہ ان کے اجتہادات کو عوام میں وہ پذیرائی حاصل ہو سکے جو امام ابو حنیفہؒ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبلؒ جیسے بزرگوں کے اجتہادات کو حاصل ہوئی۔ مخلص اور متقی اہل علم کی شرکت کے بغیر پارلیمنٹ کے اجتہاد کی وہی حیثیت ہو گی جو اکبر کے دین الٰہی اور ابوالفضل اور فیضی کے خیالات کو حاصل ہوئی تھی۔

ایک تیسری تجویز بھی سامنے آئی جو پہلی دونوں تجاویز سے زیادہ بہتر اور معتدل تھی وہ تجویز یہ تھی جو مذکورہ بارہ بائیس نکات پر دستخط کرنے والے تمام علمائے کرام نے بالاتفاق 1950ء، 1952ء، اور پھر 1953ء میں پیش کی کہ یہ اختیار نہ تو علماء کے کسی بورڈ کو دیا جائے اور نہ پارلیمنٹ کو بلکہ یہ اختیار اعلیٰ عدلیہ کو دے دیا جائے ان حضرات نے کہا کہ دنیا کے تمام وفاقی ممالک میں سپریم کورٹ یا اعلیٰ عدالتوں کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ ایسے قانون کو جو دستور کے خلاف ہو یا ایسا حکم نامہ جو ملک کے بنیادی قانون سے متعارض ہو اس کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ اگر قرآن و سنت پاکستان کا سپریم قانون ہو یا قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی کرنا ریاست کی آئینی ذمہ داری ہو تو پھر پاکستان میں سپریم کورٹ کو یہ اختیار خود بخود حاصل ہونا چاہیے کہ وہ کسی ایسے قانون کو جو قرآن و سنت سے ہم آہنگ نہ ہو کالعدم قرار دے سکے۔ امریکہ میں بھی یہ اختیار سپریم کورٹ کے پاس ہے اور 1779ء سے لیکر جب سے امریکی دستور بنا ہے 114 سے زائد قوانین کو منسوخ کیا جا چکا ہے حالانکہ وہ قوانین کانگریس نے منظور کیے تھے لہذا ان حضرات کی رائے یہ تھی کہ پاکستان میں بھی شریعت کے معاملہ میں یہ اختیار سپریم کورٹ کو دے دیا جائے۔

ان لوگوں کی رائے پر عمل کرتے ہوئے محمد علی بوگرہ نے اپنے دور میں یہ اختیار سپریم کورٹ کو دینا منظور کر لیا چنانچہ 1954ء میں جو دستور تیار ہوا اس کے آرٹیکل چار میں یہ لکھ دیا گیا کہ سپریم کورٹ کو ہی یہ اختیار حاصل ہو گا کہ وہ کسی شہری کی درخواست پر کسی بھی ایسے قانون کو کالعدم قرار دے جو سپریم کورٹ کے خیال میں شریعت سے متعارض ہو۔ یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ جس کی نظیر نہ آج کے دور میں ملتی ہے اور نہ ماضی قریب میں ملتی تھی اور علماء کرام نے یہ اہم حق روایتی مذہبی اسکالروں یا علماء کے بجائے ججوں کی ایک ایسی جماعت کو دینے پر اتفاق کیا تھا جو اینگلو سیکسن قانونی روایات میں تربیت یافتہ تھے اور اس طرح کا حق کسی بھی دوسری اسلامی ریاست میں جدید عدلیہ کو اس انداز میں کبھی نہیں دیا گیا۔

ایران میں بھی خمینی انقلاب کے بعد مذہبی علماء پر مشتمل اداروں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں کہ کون کون سے قوانین شریعت کے منافی ہیں اور کون سے منافی نہیں ہیں۔

1954ء کے اس مسودہ آئین میں سپریم کورٹ کو دیئے گئے اس اہم دائرہ اختیار سے مالیاتی قوانین کو مستثنیٰ کر دیا گیا تھا ان قوانین کے بارے میں ذمہ دار حضرات کا کہنا تھا کہ ملک کا نظام سود پر استوار ہے اور یہ لعنت اتنی جا گزیں ہو گئی ہے کہ ایک دو سالوں میں اس کا متبادل تلاش کرنا مشکل ہے اس لئے حکومت پاکستان کو وقت دیا جائے اور جب سود کا متبادل تلاش کر لے تو مالیاتی قوانین کے بارے میں بھی اختیار سپریم کورٹ کو دے دیا جائے گا اور اسمبلی سے اس کے لیے 25 سال کا وقت ملا تھا لیکن اس دستور کی منظوری سے پہلے ہی اکتوبر 1954ء کو گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز سمبلی توڑ دی نتیجتاً یہ ساری کامیابی جو بالکل آخری مراحل میں تھی صفر ہو گئی۔

1956ء کا دستور:

1956ء کے دستورِ پاکستان کے وقت پھر سیاسی قائدین نے اصرار کیا کہ کسی قانون کو شریعت کے منافی قرار دینے کا اختیار صرف پارلیمنٹ ہی کو حاصل ہونا چاہیے۔ ان حالات میں کسی بڑے اختلاف سے بچنے کے لئے ایک درمیانی راستہ کے طور پر طے کیا گیا کہ کسی قانون کے خلاف شریعت ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے کا اصل آئینی اختیار تو اسمبلی ہی کو ہو گا البتہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کو مشورے دینے کے لیے ماہرین پر مشتمل ایک "اسلامک لاء کمیشن" بنا دیا جائے جو رائج شدہ قوانین کا جائزہ لے کر ان کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کے لیے اقدامات کی سفارش کرے اور جب کوئی قانون پارلیمنٹ میں زیر بحث ہو اور اس کے بارے میں یہ سوال اٹھایا جائے کہ وہ شریعت سے ہم آہنگ ہے یا نہیں تو وہ قانون بھی اس ادارے کو بھیج دیا جائے اور ادارے کی ماہرانہ رائے آنے کے بعد اس قانون کے بارے میں فیصلہ کر دیا جائے۔

اس ضمن میں 1956ء کے دستور میں جو دفعات رکھی گئی تھیں وہ اتنی غیر مؤثر تھیں کہ ان کا عملی طور پر ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ اس میں لکھا گیا تھا کہ اس دستور کے نفاذ کے ایک سال کے اندر صدر ایک اسلامک لاء کمیشن بنائے گا جس کے فرائض یہ ہوں گے کہ وہ اسلامی قوانین واحکام کو مناسب صورت میں مرتب کرے، رائج الوقت قوانین کا جائزہ لے اور اسمبلی کے ریفرنس کا جواب دے۔ کمیشن کی رپورٹ حتمی ہو یا وقتی اسمبلی کے سامنے پیش کر دی جائے گی اور اسمبلی اس سلسلہ میں قوانین بنائے گی۔ یہ سوال کہ اسمبلی کمیشن کی تجاویز کو لے گی یا نہیں؟ مسترد کر دے گی یا نہیں؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا گیا صدر پاکستان نے جو کمیشن ایک سال میں تیار کرنا تھا وہ نہ ہو سکا اور اس پر ایک دن بھی کام نہیں ہوا۔

1956ء کے آئین میں قرار داد مقاصد کو دستور کے مقدمہ کے طور پر اختیار کیا گیا اور علماء کرام کے بائیس نکاتی فارمولے میں سے بہت سی باتوں کو اس میں شامل کیا گیا لیکن اس پر بھی کسی قسم کا کوئی کام نہ ہو سکا اور مدت پوری ہو گئی۔

پاکستان کا یہ پہلا باقاعدہ دستور جو تقریباً نو سال کے عرصہ بعد بنا وہ تیس ماہ سے زائد مدت تک نافذ نہ رہ سکا اور اکتوبر 1958ء میں یہ دستور منسوخ کر دیا گیا اس عرصہ کے دوران 1956ء کے دستور کے تحت قوانین کو اسلامیانے کے حوالے سے سرے سے کوئی کام نہیں ہوا۔

مسلم عائلی قوانین:

اکتوبر 1958ء کو مارشل لاء کے نفاذ پر 1956ء کے آئین کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ 1958ء 1962ء تک چوالیس ماہ سے زائد عرصہ تک ملک پر بغیر کسی آئین کے حکومت کا نظام چلتا رہا اس عرصہ میں مارشل لاء حکومت نے ایک ایسا اہم قدم اٹھایا جس نے عائلی قوانین کے میدان میں شریعت کے نفاذ پر گہرا اثر چھوڑا۔ 1961ء میں اس وقت کی حکومت مغربی پاکستان یعنی موجودہ پاکستان نے نفاذ شریعت آرڈیننس جاری کیا جن کے مطابق عائلی قوانین سے متعلق تمام معاملات مثلاً شادی، طلاق، وراثت، ہبہ اور وقف کے بارے میں فیصلہ کیا گیا کہ یہ سب معاملات شریعت کے مطابق طے ہوں گے۔ ان موضوعات سے متعلق اسلامی احکام کو تحریری طور پر مدون کیے بغیر براہ راست شرعی قوانین نافذ کر دیے گئے لیکن اس میں ایک استثناء موجود رہا جس کا ماحصل یہ تھا کہ والیان ریاست یا وہ لوگ جن کو اس قانون کی رو سے خاص استحقاق حاصل تھا ان کے لیے وراثت کا قانون انگریزوں کے اصول ہی پر جاری رہے گا وہ یہ تھا کہ نواب یا جاگیر دار کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا وارث ہو گا اور اس کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا وارث ہو گا باقی چھوٹے بیٹوں اور بہنوں کو کچھ حاصل نہ ہو گا[1]۔

اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل:

1962ء کے آئین کے تحت اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل کا تصور دیا گیا تھا اور یہ کونسل پہلی بار 1963ء میں قائم ہوئی، کونسل نے متعدد قوانین پر غور کر کے ان کو اسلام کے مطابق بنانے کے لیے تجاویز مرتب کیں۔ کونسل یک طرفہ طور پر وقتاً فوقتاً اپنی سفارشات پیش کرتی رہی لیکن نہ تو اس کی یہ رپورٹیں شائع کی گئیں اور نہ حکومت نے انہیں کبھی سنجیدگی سے لیا۔

---

[1] ڈھلوں، ڈاکٹر عرفان خالد، **علم اصول فقہ، ایک تعارف**، (شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد)، 207/3

1973ء کا دستور اور اسلامی نظریاتی کونسل:

1971ء میں سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے حکومت کو سنبھالنے کے بعد ایک مستقل آئین تیار کروایا جو اگست 1973ء کو نافذ کیا گیا۔ اس آئین میں ایک بار پھر معمولی ردوبدل کیساتھ وہی شقیں شامل کی گئی جو 1956ء کے آئین میں شامل تھیں۔ کمیشن اور اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل کے بجائے اب اس ادارہ کو کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی یا اسلامی نظریاتی کونسل کا نام دیا گیا۔ اس کونسل نے 1974ء کے آغاز سے کام شروع کیا اور تین سال تک بڑی تندہی سے اسے جاری رکھا۔ کونسل نے حکومت کو بڑی مفید سفارشات پیش کیں اور معاشرے کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کے لئے مختلف سرکاری اداروں کو بہت سے ایسے اقدامات کی تجاویز دیں جن سے یہ کام آسان ہو سکتا تھا۔

اس کونسل نے ایک جامع اسکیم بنائی تاکہ موجودہ قوانین پر اس خیال سے نظر ثانی کی جائے کہ انہیں اسلامی احکام سے ہم آہنگ بنایا جاسکے اور مختلف رپورٹس تیار کیں اور حکومت وقت کو پیش کی گئیں لیکن حکومت وقت نے اس پر کسی قسم کی سنجیدگی کا اظہار نہ کیا اور نتیجتاً وہ تمام رپورٹس سرد خانوں کے حوالے ہو گئیں۔ عملاً 1963ء تا 1977ء کی تمام کونسلوں کی سفارشات سرد خانے ہی کی نذر ہوتیں رہیں یہ سفارشات اس سرکاری خط و کتابت تک محدود رہیں جو کونسل اور حکومت وقت کی ایجنسیوں کے درمیان ہوئی اور بالآخر یہ تمام سفارشات و تجاویز متعلقہ سرکاری فائلوں میں دفن ہو گئیں[1]۔

1977ء کا مارشل لاء:

جولائی 1977ء میں ملک میں پھر مارشل لاء نافذ کر دیا گیا البتہ دستور 1973ء کو منسوخ نہیں کیا گیا بلکہ اسے معطل کر دینے پر ہی اکتفاء کیا گیا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ اسلامیانے کے عمل کو تیز تر کر کے ملک میں خود بخود آگے بڑھنے والا ایک آئینی و قانونی نظام دیں گے اور یہ کہ اس نظام کے تحفظ اور تسلسل کو یقینی بنایا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے وہ بہت سے اہل علم اور دانشوروں سے ملے اس مشاورت کے نتیجے میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی کی تشکیل نو کا فیصلہ کیا۔ نو تشکیل شدہ کونسل کو فعال بنایا گیا اور ملک میں نفاذ اسلام کی ایک جامع حکمت عملی تیار کرنے کے کام کا آغاز ہوا۔

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ انتہائی ناگزیر ضرورت کے تحت آئین میں ترمیم کر سکتے ہیں تو اس فیصلے کی روشنی میں اسلامی نظریاتی کونسل نے تجویز پیش کی کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر آئین میں ایسی ترامیم کر دیں جن کے ذریعے

---

[1] عثمانی، مفتی محمد تقی، **نفاذ شریعت اور اس کے مسائل**، (مکتبہ دارالعلوم کراچی) ص 31

اعلیٰ عدالتوں کو یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ وہ موجودہ قوانین کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھ سکیں اور ان قوانین کو منسوخ کر سکیں اور شقوں کو کالعدم قرار دے سکیں جو قرآن وسنت کے احکام سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی تجاویز کو اصولی طور پر منظور کرتے ہوئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے دستور میں ضروری ترامیم کر دیں اور 10 فروری 1979ء کو ایک اہم دستوری ترمیم کے ذریعے یہ اختیار عدالتوں کو مل گیا۔

10 فروری 1979ء کو ہونے والی اس ترمیم کے ذریعے چاروں ہائی کورٹوں میں ایک ایک شریعت بنچ اور سپریم کورٹ میں شریعت ایپلیٹ بنچ قائم کیا گیا جن کو اختیار دیا گیا کہ کسی بھی شہری کی درخواست پر کوئی بھی قانون ہائی کورٹ دیکھ سکتی ہے اور اس کا جائزہ لے سکتی ہے کہ کیا وہ قانون یا اس قانون کی کوئی شق اسلامی احکام کے منافی تو نہیں جیسا کہ قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ میں درج ہے۔ یہ بہت بڑا قدم تھا جو جنرل ضیاء الحق نے اٹھایا تھا لیکن اس میں بھی بعض بڑی خامیاں اور کمزوریاں رہ گئیں یا جان بوجھ کر چھوڑ دی گئیں وہ یہ کہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے یہ اختیار عدلیہ کو پانچ استثناءات کے ساتھ دیا جن میں سے ایک عارضی تھا اور چار مستقل تھے۔ جو چار مستقل استثناءات تھے ان میں ایک تو خود آئین تھا، ایک پرسنل لاز یعنی شخصی قوانین تھے، ایک پروسیجرل لاء تھا اور ایک مارشل لاء کے ریگولیشن تھے۔ جو عارضی تھا وہ مالیاتی قوانین کا تھا اور ابتداءً تین سال کے لیے کیا گیا تھا۔

ان پانچ استثناءات کے علاوہ بقیہ تمام قوانین جن میں دیوانی فوجداری اور تجارت وغیرہ کے قوانین شامل تھے سب شریعت بنچوں کے دائرہ اختیار میں آ گئے اور ان پر شریعت بنچوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ فروری 1979ء سے لے کر 26 مئی 1980ء تک چاروں ہائی کورٹس میں شریعت بنچ کام کرتے رہے اور انہوں نے تیزی سے مقدمات نمٹانے شروع کر دیے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے چودہ ماہ سے زائد عرصہ کے مسلسل کام اور پر جوش کوشش کے بعد پانچ ایسے مسودات قوانین کی سفارشات تیار کیں جن کا تعلق جائیداد کے تحفظ اور معاشرے کی اخلاقیات کی حفاظت سے تھا۔ ان سفارشات کے ذریعے چوری، ڈاکہ زنی، زنا، قذف اور شراب نوشی وغیرہ جرائم سے متعلق مروجہ قوانین کو بدل کر اسلامی قوانین کا نفاذ کر دیا گیا تھا اور ان جرائم کے ارتکاب پر قرآن وسنت کی مقرر کردہ سزائیں نافذ کر دی گئیں۔

10 فروری 1979ء کو صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے ایک حکم کے ذریعے مندرجہ ذیل حدود آرڈیننس جاری کیے۔

1۔ جائیداد سے متعلق جرائم (نفاذ حدود) آرڈیننس 1979ء۔

2۔ جرم زنا (نفاذ حدود) آرڈیننس 1979ء۔

3۔ جرم قذف (نفاذ حدود) آرڈیننس 1979ء۔

4۔ حکم امتناع (نفاذ حدود) آرڈیننس 1979ء۔

5۔ سزائے تازیانہ کا آرڈیننس 1979ء

مندرجہ بالا پانچوں حدود آرڈیننس کو 1985ء میں کی گئی آٹھویں ترمیم کے ذریعے آئینی تحفظ حاصل ہو گیا۔

شریعت بنچوں کے ایک سال 1979ء تا 1980ء کے تجربے کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ بجائے اس کے چار مختلف کورٹوں میں چار شریعت بنچ ہوں ایک مستقل عدالت قائم کر دی جائے جو چاروں ہائی کورٹوں کی نمائندگی کرے کیوں کہ چار شریعت بنچوں کے کام کرنے سے بعض مسائل بھی سامنے آئے مثلاً ایک ہی مسئلہ پر متضاد فیصلے اور تشریحات ہو رہی تھیں جس سے بچنے کے لئے ضروری تھا کہ ان چاروں کو ختم کیا جائے اور اس کی جگہ کسی ایک عدالت کو قائم کیا جائے چنانچہ 26 مئی 1980ء کو وفاقی شرعی عدالت قائم کر دی گئی جس کا صدر دفتر اسلام آباد میں تھا۔ سپریم کورٹ کے ایک سابق جج وفاقی شرعی عدالت کے سربراہ بنے اور چاروں ہائی کورٹوں سے ایک ایک جج لیا گیا۔ اس پانچ رکنی وفاقی شرعی عدالت نے کام شروع کر دیا لیکن فروری 1981ء میں اس عدالت نے سزائے رجم کے بارہ میں ایک فیصلہ دیا جس پر بڑی تنقید کی گئی اور اس کو ایک غلط فیصلہ قرار دیا گیا۔ پاکستان میں ایک چھوٹا سا طبقہ ہے جو سنت رسول ﷺ کو شریعت کا ماخذ تسلیم نہیں کرتا بلکہ صرف قرآن مجید کو شریعت اسلامی کا ماخذ ماننے کا دعویٰ کرتا ہے اس طبقہ کے بعض حضرات نے وفاقی شرعی عدالت میں درخواست دی کہ پاکستان میں زنا سے متعلق قانون میں بدکاری کی سزا رجم قرآن سے متعارض ہے قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے اور جن احادیث میں رجم کے بارے میں بیان کیا گیا ہے وہ ساری کی ساری غیر مستند ہیں لہذا اس سزا کو شریعت کے خلاف قرار دیا جائے۔ اس وقت وفاقی شرعی عدالت میں جو جج حضرات بر سر کار تھے ان میں سے بعض شریعت کا اس درجہ کا تحقیقی اور عمیق علم نہیں رکھتے تھے جو اس طرح کے فیصلوں کے لیے ضروری تھا وہ ان حضرات کے دلائل سے متاثر ہوئے اور جمہور مسلمانوں کا موقف سنے بغیر انہوں نے کثرت رائے سے یعنی پانچ میں سے تین ججوں نے یہ فیصلہ کر دیا کہ رجم کی سزا شریعت کے متعارض ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کا یہ فیصلہ اسلام کے ایک ایسے حکم کے خلاف تھا جو ہمیشہ سے مسلمانوں کے درمیان متفق علیہ رہا ہے اس فیصلہ پر دنیائے اسلام کی طرف سے انتہائی شدید رد عمل ہوا، خود صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی بڑی سبکی ہوئی۔ اب انہوں نے ایک نئی دستوری ترمیم کی جس کی رو سے وفاقی شرعی عدالت کی توسیع کر کے تین علماء کرام کو اس کا جج مقرر کیا گیا وہ تین علماء کرام جو سب سے پہلے وفاقی شرعی عدالت کے جج مقرر کیے گئے یہ ہیں: جناب پیر محمد کرم شاہ صاحب مرحوم، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، اور ملک غلام علی صاحب مرحوم۔ 1980ء میں قیام سے لے کر آج تک وفاقی شرعی عدالت نے سینکڑوں قوانین کا جائزہ لیا ہے اور ان میں سے بہت سے قوانین

کی جزوی ترامیم کا حکم دیا ہے اور حکومت کو مجبوراوہ ترامیم کرنی پڑیں یوں پاکستان میں سینکڑوں قوانین کو وفاقی شرعی عدالت کے ذریعے اسلام کے مطابق بنایا جا چکا ہے اور یہ اتنی بڑی کامیابی ہے جو پاکستان کے علاوہ کسی اور ملک میں حاصل نہیں کی جا سکتی، پاکستان میں اس کامیابی کا سہرا وفاقی شرعی عدالت کے سر ہے۔

20 جون 1980ء میں تجرباتی بنیاد پر ملک بھر میں زکوٰۃ اور عشر آرڈیننس نافذ کر دیا گیا جس میں زکوٰۃ کی وصولیابی کو رضاکارانہ قرار دیا گیا۔ اس آرڈیننس کے ذریعہ ایک سال کے لیے زکوٰۃ کی جمع آوری اور تقسیم کا ابتدائی تجربہ کیا جانا پیش نظر تھا پھر اس تجربے کی روشنی میں ایک مستقل نظام اختیار کیا جانا تھا۔ ایک سال بعد جون 1981ء میں لازمی زکوٰۃ کی وصولیابی شروع ہو گئی۔ اس وقت سے زکوٰۃ اور عشر کی وصولی کا نظام جاری ہے اگرچہ اس میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن یہ پاکستان کے موجودہ حالات کے لحاظ سے بڑی حد تک ایک مفید کام تھا جس کے مفید نتائج نکلے نظام زکوٰۃ سے متعلق کئی اہم معاملات میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو نظر انداز کر دیا گیا اور کونسل کی سفارشات سے اتفاق نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے وہ نتائج سامنے نہیں آئے جو آنا چاہئیں تھے[1]۔

زکوٰۃ و عشر کے نظام کو زیادہ سے زیادہ بہتر، مؤثر اور شفاف بنانے کی غرض سے ایک منفرد اور مستقل نظام قائم کیا گیا جس کے تحت پورے ملک میں کم و بیش چالیس ہزار مقامی زکوٰۃ کمیٹیاں، سو سے زائد ضلعی زکوٰۃ کمیٹیاں، کئی سو تحصیل زکوٰۃ کمیٹیاں اور چار صوبائی زکوٰۃ کونسلیں قائم کی گئیں۔ مرکزی سطح پر ایک زکوٰۃ کونسل قائم کی گئی جس کی سربراہی کے لیے سپریم کورٹ آف پاکستان کے حاضر سروس جج کو نامزد کیا جاتا ہے۔ اس پورے نظام کا مقصد یہ ہے کہ زکوٰۃ کا نظام ملک کے عام سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ سے الگ تھلگ رہ کر خالص دینی اور انسانی بنیادوں پر کام کرے۔ اگرچہ اس مقصد کی کلی طور پر تکمیل نہیں ہو سکی اب ضرورت اس بات کی ہے کہ گزشتہ سالوں کو سامنے رکھتے ہوئے زکوٰۃ کے نظام میں جو خامیاں رہ گئی ہیں ان پر غور و حوض کیا جائے اور ان خامیوں کو ختم کر کے اسے مکمل طور پر اسلامی بنایا جائے[2]۔

پاکستانی معاشرے کو اسلامیانے کے حوالے سے رائے عامہ کی اہمیت اور اس کی تیاری کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی ہدایت پر اسلام آباد میں کئی کانفرسوں کا انعقاد کیا گیا۔

اگست 1980ء میں علماء کنونشن منعقد ہوا جس میں مختلف مکاتب فکر کے ایک سو کے قریب نامور علماء کو مدعو کیا گیا۔ شرکائے کنونشن نے ملک میں معاشرے کو اسلامیانے کے سلسلے میں حکومت کے اقدامات کا جائزہ لیا اور اس کام کو بہتر بنانے کے لئے

---

[1] ڈاکٹر محمد امین، **عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون**، (ادارہ ترجمان القرآن، پرائویٹ لمیٹڈ، اردو بازار لاہور۔) ص158

[2] جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمن، **پاکستان میں شرعی قوانین کا نفاذ**، ص204

تجاویز مرتب کیں۔ صدر مملکت نے اس کنونشن میں بنفس نفیس شرکت فرمائی اور کنونشن کی سفارشات پر عمل درآمد کے لئے چھ کمیٹیوں کی تشکیل کا اعلان کیا۔ کنونشن نے اپنی سفارشات میں ملکی نظام تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے، موجودہ نظام قانون کو فی الفور ختم کرنے، اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹیں عوام کے لئے شائع کرنے اور ان پر عمل کرنے، ملکی معیشت سے سود کے عمل دخل کو جلد از جلد ختم کرنے، زکوٰۃ و عشر آرڈیننس میں اسلامی تعلیمات کے مطابق تبدیلیاں کرنے اور قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے کام کو تیز کرنے جیسی تجاویز کا ذکر کیا لیکن نہ ان کمیٹیوں نے کوئی قابل ذکر کام نہ کیا اور نہ کنونشن کی سفارشات پر عمل درآمد ہوا۔ اسی طرح دستمبر 1982ء میں صدر ممکت نے نفاذ اسلام کانفرنس بلوائی جس میں ان تمام افراد اور اداروں کو مدعو کیا گیا جو کسی بھی حوالے سے اسلامائزیشن کے کام میں مصروف تھے اس کانفرنس میں جو سفارشات مرتب کی گئیں ان میں یہ باتیں شامل تھیں کہ اسلامائزیشن کے طریق کار پر تفصیل سے غور کر کے ترجیحات کا تعین کیا جائے اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹوں کو عوام کے لئے شائع کیا جائے اور ان پر عمل کیا جائے۔ جون 1983ء تک مروجہ قوانین بھی شریعت کے مطابق ڈھال دیے جائیں۔ صدر مملکت نے اس کنونشن میں بھی شرکت فرمائی اور متعلقہ محکمہ جات کو ان پر کام کرنے کے احکامات جاری فرمائے۔

جنوری 1984ء میں سرکاری سطح پر ایک اور علماء کنونشن کا انعقاد ہوا یہ کنونشن بھی اسلام آباد میں منعقد ہوا اور اس کی صدارت بھی صدر ممکت نے کی کنونشن میں صدر پاکستان نے اسلامائزیشن کے حوالے سے حکومت کو درپیش مشکلات کا ذکر کیا اور شرکائے کنونشن سے ان مشکلات کو دور کرنے کے لئے تجاویز طلب کیں۔ اس کنونشن میں بھی مختلف سفارشات پیش کی گئیں جن پر عمل درآمد کے لئے صدر ممکت کی طرف سے ذاتی طور پر وعدے تو بہت ہوئے لیکن سرکاری سطح پر ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کوئی قابل ذکر اور نتیجہ خیز اقدام نہیں کیا گیا۔

10 جولائی 1983ء کو مولانا ظفر احمد انصاری کی صدارت میں ایک کمیشن قائم کیا گیا جس کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ وہ ایسے اصول تجویز کرے جن کی بنیاد پر ملک کے لئے ایک مثالی اسلامی اور جمہوری سیاسی آئینی ڈھانچہ تشکیل دیا جاسکے۔ اس کمیشن میں علماء، قانون دان، اعلیٰ عدالتوں کے ریٹائرڈ جج صاحبان اور اہل قلم شامل تھے۔ کمیشن نے ان مختلف کمیٹیوں کی طرف سے کئے جانے والے اقدامات کا بھی جائزہ لیا جو ابتداء میں اس مقصد کے لئے قائم کی گئی تھیں۔ کئی ہفتوں کے طویل غور فکر اور مشاورت کے بعد کمیشن نے اپنی رپورٹ صدر کو پیش کر دی اس میں 54 کے قریب سفارشات پیش کی گئیں۔ رپورٹ میں پاکستان میں کئے جانے والے آئینی تجربات کا تجزیہ شامل تھا اور ماضی میں جو حل اختیار کئے گئے تھے ان کی ناکامی کے اسباب کا ذکر بھی اس رپورٹ میں شامل تھا اور چند نئے طریقے بھی پیش کیے گئے۔ صدر نے ان میں سے چند سفارشات کو منظور کر لیا اور 1985ء کے آئین کی

آٹھویں ترمیم میں شامل کر لیا گیا۔ ان میں ایک اہم اور بنیادی سفارش یہ بھی تھی کہ قرارداد مقاصد کو آئین کا فعال اور مؤثر حصہ قرار دیا جائے۔ چنانچہ مارچ 1985ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے قرارداد مقاصد کو 1973ء کے آئین کا باقاعدہ عملی حصہ بنادیا گیا جو کہ اس سے قبل ایک دیباچے کے طور پر آئین کا حصہ تھی۔

نفاذ اسلام کی راہ میں حائل مشکلات کو دور کرنے کے لیے جوئی 1985ء میں سینیٹر قاضی عبد اللطیف اور سینیٹر مولانا سمیع الحق نے ملکر سینٹ میں ایک پرائیویٹ شریعت بل پیش کیا جس میں بڑی نیک خواہشات کا اظہار کیا گیا تھا لیکن اس پر بھی ماسوائے بحث ومباحثہ کے کوئی خاص کام نہیں کیا گیا لیکن اس کی وجہ سے پاکستان کے لوگوں میں سے دو گروہ سامنے آئے ایک وہ جو شدت سے اسلام کے نفاذ کے حامی تھے اور دوسرے وہ جو شدت سے اس کی مخالفت کرتے تھے۔ دسمبر 1985ء میں حکومت وقت نے ایک درمیانی راستہ نکالا اور سینٹ میں نواں دستوری ترمیمی ایکٹ پیش کر دیا جو جولائی 1986ء میں سینٹ سے منظور ہو گیا۔ اس ترمیمی ایکٹ میں یہ کہا گیا کہ اسلام کے احکام جیسا کہ وہ قرآن وسنت سے ماخوذ ہوں ملک کا بالاتر قانون اور رہنمائی کا مآخذ ہوں گے اور پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے وضع کردہ قوانیں کے ذریعے نافذ ہوں گے۔ یہ ایکٹ صرف سینٹ سے پاس ہوا تھا اس سے پہلے کہ قومی اسمبلی اس پر بحث کرتی 1988ء کو جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے وزیر اعظم محمد خان جونیجو مرحوم کی حکومت اور قومی اسمبلی کو توڑ دیا اور حکومت کی نامی کے اسباب یہ بیان فرمائے کہ یہ حکومت اسلامائزیشن کے لیے کام کرنے میں ناکام رہی ہے۔

15 جون 1988ء کو صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے نفاذ شریعت آرڈیننس جاری کیا جو کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے تیار کیا گیا تھا جس میں کہا گیا کہ شریعت ملکی قانون کا بالاتر مآخذ ہے اور یہ ریاست میں پالیسی سازی کے لئے اولین ہدایت کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر کسی عدالت میں یہ سوال پیدا ہو کہ کوئی قانون شریعت کے مطابق ہے یا نہیں تو اسے وفاقی شرعی عدالت کے پاس بھیجا جائے گا، جو امور اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں ان کے لئے ہائی کورٹ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ ہائی کورٹوں کی رہنمائی کے لئے مفتی مقرر ہونگے۔ علماء کا تقرر بطور جج ہو سکے گا وہ وکیل کی حیثیت سے بھی کام کر سکیں گے۔ عدلیہ کے موجودہ ارکان کے لئے شریعت وفقہ کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا جائے گا۔ ملک کے تعلیمی اور معاشی نظاموں کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لئے صدر آرڈیننس کے اجراء کے ایک ماہ کے اندر دو مستقل کمیشن قائم کرے گا جو ایک سال کے اندر صدر کو رپورٹ پیش کریں گے اور متعلقہ شعبوں میں اسلامائزیشن کے پروگراموں کی نگرانی کریں گے۔

یہ آرڈیننس 14 فروری 1989ء کو زائد المیعاد ہو کر از خود ختم ہو گیا اور حکومت نے اس کی مدت میں نہ تو توسیع کی اور نہ یہ آرڈیننس منظوری کے لئے قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا[1]۔

خلاصہ:

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا اور پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ کے نعرہ سے 14 اگست 1947ء کو معرض وجود میں آیا۔ اس وقت حکومت پاکستان کے پاس کوئی آئین نہیں تھا، انگریز کے وضع کردہ 1935ء کے آئین کو ہی تعزیرات پاکستان کے نام سے موسوم کیا گیا جس میں یہ شرط بھی تھی کہ جب تک حکومت پاکستان اپنا آئین مرتب نہیں کر لیتی اس کی حیثیت برطانوی حکومت کے تابع رہے گی چنانچہ پاکستانی آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس قریباً ایک سال بعد 10 اگست 1948ء کو ہوا لیکن کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی البتہ مارچ 1949ء میں صرف قرار دادِ پاکستان پاس ہوئی اور اسے بھی صرف مقدمہ آئین میں رکھا گیا۔ پورے 9 سال تک کوئی آئین مرتب نہ ہو سکا۔ یکم جنوری 1955ء کو پاکستان کو صرف جمہوریہ قرار دیا گیا اور 23 جون 1955ء کو پہلا آئین قانون ساز اسمبلی میں پیش ہوا جسے 29 فروری 1956ء کو منظور کیا گیا اور 23 مارچ 1956ء سے نافذ کیا گیا، جس کے ذریعے ملک کا نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" رکھا گیا لیکن 1958ء میں ایوب خان کے مارشل لاء نے اسے ختم کر دیا۔ 1962ء میں صدر ایوب خان نے صدارتی نظام حکومت کی طرز کا ایک آئین بنوا کر نافذ کر دیا۔ 1973ء میں مسٹر بھٹو نے ایک نیا آئین مرتب کروایا جو پارلیمانی طرز حکومت کی ترجمانی کرتا تھا۔ 1977ء میں ضیاء الحق کا مارشل لاء آیا جس میں اس آئین کو معطل تو نہیں کیا البتہ بے اثر ہو کر رہ گیا۔ 1985ء کو شریعت بل کے نام سے ایک بل پیش کیا گیا جو اعتراضات کے بعد دوبارہ ترمیم کے ساتھ 1990ء کو سینٹ میں پیش ہوا اور منظور کر لیا گیا۔ قواعد کے مطابق منظوری کے نوے دن کے اندر اندر قومی اسمبلی میں پیش کیا جانا ضروری تھا یہ مدت 11 اگست 1990ء کو مکمل ہونا تھی لیکن 10 گست 1990ء کو اسمبلی توڑ دی گئی اور شرعی قوانین کا راستہ روک دیا گیا اس کے بعد بھی مختلف ادوار میں شریعت کی بالادستی کے لیے اسمبلی فورم پر کوششیں ہوتی رہیں جن کو کوئی خاص پزیرائی حاصل نہ ہو سکی نتیجتاً شرعی قوانین کے نفاذ کا دیرینہ خواب آج تک شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

---

[1] ڈھلوں، ڈاکٹر عرفان خالد، **علم اصول فقہ، ایک تعارف**، (شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد)، 235/3

فصل دوم: احکام اسلام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹیں

فصل دوم: احکام اسلام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹیں

کیا اسلام ہمیں ایک مکمل قانونی نظام دیتا ہے؟ احکام اسلام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا ذکر کرنے سے پہلے ایک سوال کا جواب دیا جانا ضروری ہے تاکہ قاری کے ذہن میں کسی قسم کی کوئی الجن باقی نہ رہے وہ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام ہمیں مکمل قانونی نظام دیتا ہے؟ جس کا ایک لفظی جواب تو یہ ہے کہ "ہاں" لیکن اس "ہاں" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قانون سے متعلق تمام جزئیات قرآن وسنت میں موجود ہیں یا یہ نظام اپنی ساری تفصیلات سمیت منزل من اللہ ہے یعنی اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی ہیں اور اس میں انسانی عقل وتدبر کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس موقف کی توضیح کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم مختصراً بتائیں کہ خود اسلام کیا ہے؟ زندگی کے بارے میں اس کا نقطہ نظر کیا ہے؟ اور انسان کے قانونی مسائل کو وہ کس طرح حل کرتا ہے؟

کرہ ارض پر انسانی زندگی کے بارے میں انسانوں میں دو قسم کے رویے پائے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ انسان طبعی قوانین کی پیداوار ہے اس کا کوئی خالق نہیں یہ کسی کو جواب دہ نہیں، کسی اخلاقی پابندی کی کوئی اساس نہیں۔ اس نقطہ نظر کو لادینی نقطہ نظر کہا جاسکتا ہے اور دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ کائنات ایک خالق کی پیدا کردہ ہے اور انسان کو وجود بخشنے والا بھی وہی ہے جس نے پوری کائنات کو ایک حکمت کے ساتھ پیدا کیا اور اس میں کارفرما تدبر ہر سو عیاں ہے۔ بلکل اسی طرح اس ذات نے انسان کو بھی عبث پیدا نہیں کیا۔ اس نے انسان کو صرف پیدا ہی نہیں کیا اور اسے اپنی مرضی کے مطابق یا اس کے مخالف زندگی بسر کرنے کی آزادی ہی نہیں دی بلکہ اس کو یہ بتانے کا انتظام بھی کیا ہے کہ اس دنیا فانی میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے، صحیح زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ اللہ رب العزت نے انسانوں کو بتایا ہے اس کا نام ہے "اسلام" اس دوسرے نقطہ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ بندہ ہے۔ ارادے کی جو آزادی اور کائنات میں تصرف کی جو سہولت اسے اس محدود عمر میں دی گئی ہے وہ در اصل اس کے امتحان کے لئے ہے اگر وہ اس آزادی کو خالق کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے اس کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے تو وہ در حقیقت کامیاب ہے اس دنیا کی فانی زندگی میں بھی اور آخرت کی حقیقی اور پائیدار زندگی میں بھی جہاں اسے خالق کی خوشنودی حاصل ہوگی اور ہر وہ نعمت میسر ہوگی جس کا تصور وہ کر سکتا ہے نیز یہ کہ خالق نے اپنا پسندیدہ طرز زندگی اسے بتانے کے لئے یہ انتظام کیا کہ خود بنی نوع انسان میں سے ہی کسی ایک فرد کو چن کر اسے براہ راست اپنی ہدایت سے نوازا اور پھر دوسرے انسانوں کو کہا کہ یہ میرا نمائندہ ہے اور تمہارے لئے ایک عملی نمونہ ہے اگر میری اور میرے احکام کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنا چاہتے ہو تو میرے اس بندے کی اطاعت کرو۔

اب جو آدمی اس فلسفہ تسلیم ورضا کو مان لے اور اپنی مرضی کو بغیر کسی جبر کے اور اپنے خود مختار ارادے سے اللہ رب العالمین کی مرضی کے تابع کردے اور اس کے رسول کو اس کا نمائندہ مان کر اس کا مطیع بننا قبول کرلے تو اس کے لئے زندگی گزارنے کے

قواعد وضوابط (قانون) خدااور رسول ہی بنائیں گے وہ خود تو نہیں بنائے گا ہاں اسے یہ آزادی ضرور حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اس نقطہ نظر کا انکار کر دے اور خدااور رسول کے وجود سے انکار کر کے اپنی زندگی اپنی خواہشوں کے مطابق بسر کرے لیکن یہ ایک انتہائی غیر منطقی بات ہو گی، اگر وہ حاکم ورب تو مانے خدا کو مطاع تو مانے اس کے رسول کو لیکن ان کی اطاعت نہ کرے اور زندگی گزارے اپنی مرضی سے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ نہ تو اس خدااور رسول کے ساتھ مخلص ہے جن کی اطاعت کا اس نے دم بھرااور نہ ہی وہ اپنی ذات کے ساتھ مخلص ہے کہ وہ ایک چیز بقائمی ہوش وہواس صحیح مانتا تو ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا نفاق کا یہ رویہ کفر سے بدتر ہے اسی کا سخت ترین عذاب دیا جائے گا۔

یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اللہ تعالی ہی انسان کا خالق ومالک ہے اور وہ ہی بہتر جانتا ہے کہ انسان کو کس چیز کی ضرورت ہے اور انسان کیسی کیسی نئی چیزیں ایجاد کر رہا ہے۔ ہر زمانے میں رسول اور نبی آتے رہے لیکن ان کی شریعتیں وقتی ہوا کرتی تھیں لیکن آخر میں اللہ رب العزت نے حضرت محمد ﷺ کو دائمی شریعت دے کر بھیجا اور ایسا قانون دے کر بھیجا جو انسانوں کے لئے بہتر تھا اور تمام کے تمام انسانوں کے لئے قیامت تک دے کر بھیجا، ساتھ اس کے کہ اس کو حالات کے تغیر و تبدل کا علم بھی تھا۔ اس کو آج کے زمانے کے لوگوں کے مسائل کو علم بھی تھا۔ یہاں یہ بھی ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ مشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ چند سال قبل جو قوانین بنائے گئے تھے اب ان کو بدل دیا گیا ہے یا ان میں ترامیم کر دی گئیں ہیں کیوں کہ وہ اس زمانے کے ساتھ ہم آہنگ نہ تھے تو ایسے کیسے ممکن ہے کہ چودہ سو یا پندرہ سو سال پہلے کے قوانین ابھی بھی لاگو ہو سکیں؟ بظاہر سوال بڑا منطقی ہے لیکن اللہ رب العزت نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر منطقی جواب ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالی نے تفصیلی، قطعی اور ناقابل تغیر احکام صرف دو طرح کے معاملات میں دیئے ہیں ایک تو وہ معاملات جن کے بارے میں انسانی عقل اپنے محدود دائرہ کار کی وجہ سے حکم نہیں لگا سکتی اور اگر لگانے کی کوشش کرے تو ٹھیک نتیجے پر پہنچنے کی کوئی گارنٹی نہیں مثلاً عبادات کہ نماز کیسے پڑھی جائے؟ کب پڑھی جائے؟ کتنی رکعت پڑھی جائے؟ روزے کب رکھے جائیں وغیرہ ان معاملات میں صرف عقل عام پر اعتماد کر کے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالی نے کمال نوازش سے ان معاملات کی تفصیل ہمارے لئے بیان فرمادیں۔

دوسرے وہ انتہائی اہم معاملات جن کے بغیر کسی سوسائٹی کا ڈھانچہ بھلائی اور خیر پر قائم ہی نہیں رہ سکتا یعنی ایمان، جان، مال، نسل اور عقل کے تحفظ کا انتظام (حدود اللہ)۔

ان دو صورتوں کے علاوہ وہ معاملات جو کائنات میں انسان کے تصرف اور اس کی تمدنی ترقی یا وقت اور مقام کے بدلنے کی وجہ سے اس کی رہنے سہنے کی عادات اور ضروریات سے تعلق رکھتے ہیں ان میں اس ذات حکیم نے قطعی اور تفصیلی احکام دینے کے بجائے

صرف بنیادی اصول دینے پر اکتفا کیا اور پھر یہ امت کے صاحب علم لوگوں پر چھوڑ دیا کہ وہ نصوص کی روشنی میں اور اس کے بتائے ہوئے قواعد کے مطابق اور اس کی روح اور مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی تفصیلات طے کر لیں۔ یہ وہ طریق کار ہے جسے اجتہاد کہا جاتا ہے اور جو علماء و فقہاء اس ذمہ داری کو نباہتے ہیں انہیں مجتہد کہا جاتا ہے۔ اس طرح خود شریعت کی اجازت اور اس کے بتائے ہوئے طریقوں اور اس کی روح کے مطابق جو تفصیلات یہ مجتہدین طے کرتے ہیں وہ اگرچہ شریعت نہیں ہوتیں منزل من اللہ نہیں ہوتیں کیونکہ ان کے طے کرنے میں انسانی عقل و فہم کا استعمال ہوتا ہے لیکن وہ شریعت کے خلاف بھی نہیں ہوتیں بلکہ اسی کے ماتحت اور اسی کے مطابق ہوتی ہیں۔ ان اجتہادی احکام کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ وحی پر مبنی نصوص کی تعداد محدود ہے جب کہ انسانی تمدن کی بوقلمونیوں اور اس کے وسعت ادراک و اعمال کی کوئی حد نہیں، جزئیات کا کوئی شمار نہیں جس طرح کہ اللہ تعالی نے شوری کا حکم دیا ہے اور فرمایا: ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ[1]﴾ اور فرمایا: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ[2]﴾ اور آپ ﷺ صحابہ اکرام سے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں مشورہ کیا کرتے تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک اور حدیث میں اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی گئی کہ شوریٰ کا ڈھانچہ کیسا ہو اس کے ارکان کتنے ہوں اس میں کثرت رائے کو ترجیح دی جائے یا کوئی طریقہ ہو، اس طرح کی تفاصیل اللہ نے انسانوں کے ذمہ ڈال دیں تاکہ ہر زمانے کے لحاظ سے لوگ ان چیزوں کو قائم کر سکیں۔

اب فرض کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اگر شوریٰ کے انتخاب کا ایک طریقہ مقرر فرما دیتے اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ طریقہ موزوں نہ رہتا تو پھر کیا ہوتا؟ تو پتہ چلتا ہے کہ شارع نے جن معاملات میں تفصیلی احکام نہیں دیے وہ عمداً نہیں دیئے کیونکہ اس میں ہماری بھلائی ہے۔ شارع ہمیں تنگی سے بچانا چاہتے ہیں اور ہمارے لیے ایسے اصول وضع کرنا چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے قابل عمل ہوں اور اس کے لیے وہی طریقہ مثالی تھا جو اس نے اختیار کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے ہمیں ایک مکمل قانونی نظام تو دیا ہے اور یہ نظام اپنی اصل میں خدائی نظام ہی ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلامی قانون جامد قانون ہے جو زمانے کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتا یا اس میں انسانی عقل کا کوئی کام نہیں بلکہ اس کے برعکس اس میں انسانی عقل و تدبر کا دائرہ عمل خاصا وسیع ہے جو اجتہاد کہلاتا ہے لیکن یہ کام بہرحال مغرب کی خود مختار قانون سازی سے میل نہیں کھاتا بلکہ ان حدود کے اندر رہ کر ہی انجام پاتا ہے جن کی نشاندہی ان نصوص سے ہوتی ہے جنہیں اللہ تعالی نے ہمارے لیے ناقابل تغیر بنایا ہے۔

پاکستان میں احکام اسلام کی تنفیذ کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہیں یہاں ان میں سے چند کو ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[1] الشوریٰ: 38

[2] آل عمران: 159

1۔ عوام میں دینی جذبہ کی کمی:

پاکستان کے اندر ایسے ماحول کی کمی ہے جو دینی احکامات پر عمل درآمد کے لئے سازگار ہو، دینی احکامات و قوانین کا نفاذ اور ان پر عمل بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ بقول ڈاکٹر عرفان خالد: "اس کام کے لئے ہمت اور جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے، عوام کے اندر اس جذبہ اور حوصلے کی کمی ہے اور اس طرح کا جذبہ اور حوصلہ پیدا کرنے کے لیے حکومتوں، سوشل اور پرنٹ میڈیا اور ممبر و محراب کو زیر استعمال لانے کی اشد ضرورت ہے۔ ہم میں سے کتنے ایسے لوگ ہیں جو اپنے ذاتی مفاد پر زد پڑنے کے وقت شریعت سے پہلو تہی نہیں کرتے؟ ایسے لوگ کتنے ہیں جو سال ختم ہونے پر بینکوں سے رقم نہ نکلوائیں تاکہ ان کا مال زکوۃ کی ادائیگی کے نتیجے میں پاک ہو جائے؟ معاشرے میں اسلام کے عملی نفاذ کی اصل طلب اور جوش و جذبہ عوام کی طرف سے ہونا چاہیے جب تک وہ نہیں چاہیں گے اور اس بارے میں پرجوش نہیں ہوں گے اس وقت تک اسلامی نظام کے نفاذ میں صحیح پیش رفت نہیں ہو سکتی"۔[1]

2-سیاسی سطح پر قوت فیصلہ کی کمی اور عدم دلچسپی:

پاکستان میں قوانین کو اسلام کے مطابق بنانے کے لئے ایک بڑی رکاوٹ حکومتی سطح پر قوت فیصلہ کی کمی ہے۔ اسلامی قوانین کے نفاذ کا کام جب کیا جائے گا تو اس سے بہت سے لوگوں کے مفادات پر زد پڑے گی کئی بڑے بڑے برج گریں گے اس کام میں سیاسی مفادات اور دباؤ کی پروانہ کرتے ہوئے حکومت کو جرات مندانہ اقدام اٹھانا پڑیں گے، حضرت عثمان غنیِ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا کہ حکومت ایک پہرے دار ہے اور اسلام ایک بنیاد ہے جس عمارت کا پہرے دار نہ ہو اسے لوٹ لیا جاتا ہے اور جس عمارت کی بنیاد ہی نہ ہو وہ ضرور گر جاتی ہے۔ لہذا اسلام کی عمارت قائم رکھنے کے لئے ایک مضبوط بنیاد اور ایک طاقتور اور دیانتدار چوکیدار کی ضرورت ہے۔

3-ملک کے بااثر طبقات:

اسلام کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہمارے ملک میں بااثر طبقات ہیں جو اپنے طبقاتی مفادات کا ہر صورت میں تحفظ چاہتے اور کرتے ہیں۔ پاکستان کے ٹیکسوں کا نظام انتہائی بگڑا ہوا ہے اکثر حصہ ٹکس وصول کرنے والوں کی جیبوں میں جاتا ہے اسی طرح زکوۃ کا نظام بھی ہے جب زکوۃ کا نظام لایا گیا تو اسلامی نظریاتی کونسل نے کہا تھا کہ زکوۃ کے نظام کو کامیاب بنانے کے لئے ٹیکسوں کے نظام میں بڑی اور انقلابہ تبدیلیاں کرنی پڑیں گی ورنہ زکوۃ کا نظام کامیاب نہیں ہو گا اس وقت کی حکومت نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ٹیکسوں کے نظام کی بہتری کے لیے کوشش کرے گی اور اس بارے میں بہت سی سفارشات بھی پیش کی گئیں لیکن ٹیکسوں کا

---

[1] ڈھلوں، ڈاکٹر عرفان خالد، **علم اصول فقہ، ایک تعارف**، (شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد)، 236/3

نظام کیا بہتر ہوتا الٹا زکوۃ کے نظام کو بھی بگاڑ کر رکھ دیا گیا ہے کیوں کے ٹیکسوں کے نظام کو سدھانے سے کئی بااثر طبقات کے مفادات متاثر ہوتے تھے۔

4-شریعت کے ماہرین کی کمی:

پاکستان میں نفاذ شریعت کے کام کے لئے جس طرح کے ماہرین درکار ہیں وہ بہت کم یاب بلکہ نایاب ہیں۔ نفاذ اسلام کے لئے مختلف شعبوں میں جس طرح کے ماہرین درکار ہیں اس طرح کے ماہرین تیار کرنے کا پاکستان میں کوئی جامع انتظام نہیں ہے۔ اگر آج ایک ایسی حکومت آ جائے جو شریعت کو مکمل طور پر نافذ کرنا چاہ رہی ہو تو ہمارے پاس کتنے لوگ تیار ہیں جو جدید بنکاری کے نظام کو مکمل طور پر اسلامی طرز پر چلانے کی استطاعت رکھتے ہیں اور اسی طرح ہمارے دنیاوی اعتبار سے ماہر وکلاء حضرات اور ججز حضرات اور قانون دان کتنے ایسے ہیں جو دینی معلومات بھی مکمل رکھتے ہوں یہی حال ہمارے معاشرے میں دیگر اداروں اور محکموں کا بھی ہے اور یہ ایک ایسا پہلو ہے کہ جس پر جتنی جلد توجہ دی جائے اتنا ہی ضروری ہے۔ جب تک ایسی ٹیم تیار نہیں ہو گی اور مطلوبہ افراد میسر نہیں ہوں گے کام نہیں ہو سکتا اس لئے ملک میں اسلام کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ ایسے ادارے بنائے جائیں جن میں مطلوبہ لوگ تیار کئے جا سکیں۔

5-مذہبی سیاست:

پاکستان میں مذہب کے نام پر بہت سی پارٹیاں سیاست کر رہی ہیں جن کا خالصتا مقصد اپنے سیاسی مفادات کو حاصل کرنا ہوتا ہے اور مذہب سے ان کا دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا انہوں نے مذہب کا لبادہ اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اوڑھا ہوتا ہے ایسے مذہبی گروپس بھی پاکستان میں نفاذ اسلام کے راستہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہیں ج۔ یسے جیسے یہ سیاسی پارٹیاں انتخابی میدان میں سرگرم ہوتی جاتی ہیں ملک میں فرقہ ورانہ تنازعات کی شدت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے فرقہ ورانہ تنازعات کی شدت میں اسلام کے عمومی مقاصد پس پشت چلے جاتے ہیں اور جزوی اور فروعی تنازعات اہمیت اختیار کر لیتے ہیں[1]۔

---

[1] ڈھلوں، ڈاکٹر عرفان خالد، **علم اصول فقہ، ایک تعارف**، (شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد)، 236/3

6-لادین حکمران اور حکومتیں:

اسلامی کو بحثیت نظام زندگی غالب کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ لادین حکمران اور حکومتیں ہیں اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے نفاذ کے عمل کو روکنے کے لئے ہر دور میں لادین حکمرانوں نے بھرپور کوشش کی اس کے پیچھے ان کے کیا مقاصد تھے یہ تو ظاہر ہے[1]۔

7-مسلمان عوام کی غفلت اور لاعلمی:

ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمان عوام اس سے غافل اور لاعلم ہے کہ اس کے کیا فوائد ہیں، مختلف مسلمان ممالک میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد تعلیم سے بے بہرہ ہے اور جو چند لوگ تعلیم یافتہ ہیں وہ بھی اس نظام تعلیم سے فارغ التحصیل ہیں جو انہیں ایک اچھا مسلمان بنانے سے بھی قاصر ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ایک مسلمان کو اس امر کا احساس ہی نہیں ہے کہ مسلمانوں کی ذلت وخواری کا سب سے بڑا سبب نظام شریعت پر ان کا عمل درآمد نہ کرنا ہے۔ ان کی غالب اکثریت کو اس امر کا شعور ہی نہیں اور اگر کچھ شعور ہے تو اس کے تقاضوں کا احساس نہیں[2]۔

8-غیر ملکی دباؤ:

پاکستان میں جب بھی شریعت کے نفاذ کی بات کی جاتی ہے تو پاکستان پر غیر ملکی دباؤ بڑھ جاتا ہے جو کہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ ہماری بڑی بڑی طاقتور حکومتیں اس کو برداشت نہیں کر پاتی اور اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں اور شریعت کے نفاذ سے باز آجاتی ہیں اس کی مثالیں تو بہت دی جاسکتی ہیں لیکن یہاں صرف ایک مثال پر اکتفاء کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو گا کہ پاکستان میں غیر ملکی دباؤ کا کس حد تک اثر ہے، پاکستان میں توہین رسالت کا قانون (Blasphemy Law) کوئی نیا نہیں ہے بلکہ یہ قانون تو انگریزوں کے دور کا ہے 1927ء میں (The Criminal Law Amendment Act XXV) کے تحت انڈین پنل کوڈ 1860ء میں ایک نئی دفعہ 295 اے کا اضافہ کیا گیا تھا جس کی روح سے مذہبی عقائد کی توہین قابل تعزیر جرم قرار دی گئی تھی بعد میں بھی اسی طرح کی دفعات کا اضافہ کیا جاتا رہا، 1980ء کے عشرہ میں چند اور ترامیم کی گئیں جس کی رو سے امہات المؤمنین، اہل بیت اطہار، ﷺ کی توہین کے مجرم کے لئے موت یا عمر قید کی سزا مقرر کی گئی، اکتوبر 1990ء میں وفاقی شرعی عدالت کے ایک حکم اور خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کی بے حرمتی کو فوجداری جرم بنا دیا گیا اور ایک نئی دفعہ 295 سی کا

---

[1] محمد امین، ڈاکٹر، **عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون**، ص 140

[2] ایضاً: ص 140

اضافہ کیا گیا جس کے تحت پیغمبر اسلام کی توہین کے سلسلہ میں ایک متفقہ قرارداد کی رو سے 30 اپریل 1991ء سے توہین رسالت کے مرتکب کی سزا صرف موت مقرر ہو گئی لیکن اس قانون پر اتنا دباؤ ہے کہ توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والوں کو مغربی سفارتخانوں سے مفت ویزے ملتے ہیں اور وہ جیل سے براہ راست ائیر پورٹ اور وہاں سے مختلف مغربی ممالک پہنچا دیئے جاتے ہیں اور ان کے خلاف مقدمہ درج کرنے والے مدعی کے پیچھے بین الاقوامی ادارے اس طرح ہاتھ دھو کر لگ جاتے ہیں جیسے وہ خود ہی کوئی مجرم ہو۔

مذکورہ رکاوٹوں پر اچھی طرح غور و خوض کر کے جب تک ان کا مؤثر سد باب نہ کیا جائے گا اس وقت تک پاکستان میں نفاذ اسلام کے باب میں فعال اور تیز رفتار پیش رفت مشکل ہو گی۔ ملک کے مذہبی اور دینی حلقوں اور جماعتوں میں اس طرح ہم آہنگی پیدا ہونی چاہیے کہ وہ ملک و ملت کے متفق علیہ اور مشترکہ اہداف کے بارے میں یکساں نقطہ نظر رکھتے ہوں۔

فصل سوم: شرعی احکام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کے خاتمے کے لئے تجاویز

فصل سوم: شرعی احکام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کے خاتمے کے لئے تجاویز

پاکستان کو آزاد ہوئے آج 75 سال گزر چکے ہیں لیکن ملک میں شرعی قوانین کا نفاذ عمل میں نہیں آسکا جس کی وجوہات کو ہم نے گزشتہ فصل میں ذکر کیا ہے اس فصل میں ہم ان وجوہات یا رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے کچھ تجاویز کو بیان کریں گئے جن پر عمل کر کے ہم ملک پاکستان کو ایک حقیقی اسلامی ریاست بنا سکتے ہیں۔

متذکرہ بالا خامیوں کو دور کرنے کے لیے اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے ذیل میں چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

1- قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قانون سازی کا ماخذ تسلیم کیا جائے اور قانون سازی کی بنیاد بنایا جائے۔

2- مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے انتخابات کے دوران اس بات کا خیال کیا جائے کی بالغ رائے دہی کے ذریعے ہوں اور جس کے پاس دینی تعلیم ہو اور دینی شعار کی پرواہ کرتا ہو صرف اسی کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہو۔

3- الیکشن کمیشن (جو خود ثقہ ترین آدمیوں پر مشتمل ہو) کی ذمہ داری ہو کہ کوئی ایسا فرد شوریٰ کی نمائندگی کے لیے اہل نہ ہو جو دینی فرائض کو پورا نہ کرتا ہو اور منکرات سے مجتنب نہ ہو۔ ایک خاص حد تک تعلیم یافتہ ہو (حکومتی یونیورسٹی یا دینی جامعہ کا فارغ التحصیل ہو) اور اخلاق کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی کے لحاظ سے معروف ہو۔

4- قانون سازی کے اختیارات سارے ہاؤس کے بجائے ایک مجلس اجتہاد کے پاس ہوں اور اس مجلس میں ماہر قانون دان ہونے کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم سے بہرہ ور افراد ہوں۔

5- ایسے تعلیمی ادارے بنائے جائیں جن میں دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا بھی پورا پورا خیال رکھا گیا ہو اور تعلیم کے ساتھ تقویٰ اور خدا خوفی کی تربیت بھی دی جاتی ہو۔

6- موجودہ تعلیمی اداروں میں اسلامیات کو ہر ایک کیلئے خواہ وہ کسی بھی فیلڈ میں ہو لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جائے تاکہ ہر فرد اسلامی تعلیمات سے واقف ہو سکے اور اسلام کے بہترین نظام کا خواہشمند ہو سکے۔

7- سیاسی جماعتوں کو پہلے سے متنبہ کر دیا جائے کہ ان کی لسٹوں میں سر فہرست ایک تعداد اسلامی سکالرز اور جید علماء کی ہونی چاہیے جو اس اجتہاد کمیٹی کے ممبر بن سکیں۔

اس اجتہاد کمیٹی میں ہر پارٹی کو اس کی جیتی ہوئی نشستوں کے تناسب سے حصہ ملے۔

ان علماء اور سکالرز میں پائی جانے والی مطلوبہ صفات کا ذکر آئین میں کر دیا جائے اور یہ وہ صفات ہوں جو اصولیوں کے نزدیک متفقہ طور پر کسی مجتہد میں کم از کم پائی جانی چاہییں، یعنی قرآن و حدیث کے علوم میں رسوخ، عربی زبان پر عبور، فقہ و اصول فقہ میں

درک اور استنباط کا ملکہ، حسن سیرت اور تقویٰ کے لحاظ سے معروف ہونا، عوامی مسائل کو جاننا اور عوام کے نزدیک ثقہ ہونا وغیرہ۔

8۔ یہ کمیٹی ایک خود مختار اور بااختیار ادارہ ہو گی اگر وہ کثرت رائے سے محسوس کرے کہ اس کمیٹی کے لئے نامزد کردہ کسی ممبر میں کم از کم صفات نہیں ہیں جو دستور میں مذکور ہیں تو وہ اس کی رکنیت کو قبول کرنے سے انکار کر سکتی ہے تا آنکہ متعلقہ سیاسی جماعت اس ممبر کی جگہ کوئی دوسرا قابل قبول ممبر دے یا اس سیٹ کے خالی ہونے کا نقصان اٹھائے۔

9۔ اس کمیٹی کے پاس کردہ بلوں کے قانونی صورت اختیار کرنے سے پہلے قومی اسمبلی یا صدر مملکت اگر چاہیں تو نظر ثانی کے لئے (مطلوبہ تبدیلیوں کے ذکر کے ساتھ) مسودہ قانون کمیٹی کو واپس بھجوا سکتے ہیں لیکن اس کو رد نہیں کر سکتے اور نظر ثانی کے بعد اس کمیٹی کا فیصلہ آخری ہو گا۔

10۔ حکومتی یا پرائیویٹ بل نہ ہونے کی صورت میں یہ کمیٹی اپنی مجموعی رائے سے یا اپنے کسی ممبر کے توجہ دلانے سے کوئی قانون بنا کر حکومت اور اسمبلی کو بھجوا سکتی ہے اور کسی غیر اسلامی قانون کی جگہ اسلام کے مطابق دوسرا قانون بنا کر نفاذ کے لئے بھجوا سکتی ہے اور عام ممبران اسمبلی اس پر بحث و مباحثہ تو ضرور کر سکتے ہیں لیکن اسے نامنظور نہیں کر سکتے۔

11۔ دستور میں کسی ترمیم کے لئے بھی اس کمیٹی کی رضامندی ضروری ہونی چاہیے۔

12۔ پارلیمنٹ کا کوئی ممبر، حکومت یا پبلک کا کوئی فرد اگر سمجھے کہ اس مجلس کا پاس کردہ کوئی قانون شریعت کے منافی ہے تو وہ اسے سپریم کورٹ میں چیلنج کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کورٹ کے جج مجتہدین پر مشتمل ہوں۔

13۔ یہ مجلس اگر چاہے تو مستقبل کی مجلس کے لئے یعنی مجتہدین کی پہچان اور تعین کے لئے کوئی دوسرا مناسب لائحہ عمل متفقہ رائے سے تجویز کر سکتی ہے۔

14۔ اگر متناسب نمائندگی کے نظام کو نہ اپنایا جائے اور مروجہ طریقے سے جماعتی یا غیر جماعتی انتخابات ہوں تو یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے کہ جتنے بھی علماء اور اسلامی سکالرز اسمبلی میں پہنچیں ان پر مشتمل مذکورہ کمیٹی بنا دی جائے۔

15۔ اگر اس طرح کے الیکشنوں میں کم تعداد میں علماء اور سکالرز اسمبلیوں میں پہنچیں تو مجتہدین کی پہچان و تعین کے دوسرے ذرائع آزمائے جا سکتے ہیں الیکشن کمشن دستور میں مذکور صفات کے حامل علماء و سکالرز کی ایک لسٹ پارلیمنٹ میں پیش کرے اور پھر ارکان شوریٰ اس لسٹ میں سے مطلوبہ تعداد میں اہل علم کو چن لیں اس طرح یہ اہل علم بھی گویا منتخب قرار پائیں گے۔

ہمارے لاء کالجز میں اسلامی قانون کی تدریس کا انتظام انتہائی غیر تسلی بخش ہے چاہیے تو یہ کہ اسلامی ممالک میں اسلامی قوانین کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے لیکن موجودہ حالات کے پیش نظر ہماری اس میں چند تجاویز ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

1۔لاء کالجوں میں عربی زبان کی تدریس لازمی ہو اولا تو ایسے طلباء کو داخلہ دیا جائے جنہیں پہلے سے عربی زبان آتی ہو اور جب تک یہ صورت نہ ہو اس وقت تک قانون کے طلبہ کو عربی پڑھانے پر خصوصی توجہ دی جائے تاکہ وہ اسلامی قانون کے مصادر سے براہ راست استفادہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔

2۔ جب تک مروج قوانین کی اسلامائزیشن کا کام مکمل نہیں ہو جاتا یا نئے اسلامی قوانین نہیں بن جاتے اس وقت تک مروج قوانین کے کیف و کم کے برابر اسلامی قوانین پڑھائے جائیں یعنی ایسا نہ ہو کہ چھ پرچے مروج قوانین کے ہوں تو ایک پرچہ اسلامی قانون کا ہو بلکہ چھ کے چھ پرچوں میں سے ہر پرچے کا آدھا مواد اسلامی قانون پر اور آدھا مواد انگریزی یا مروجہ قانون پر مشتمل ہونا چاہئے یا تین پرچے اسلامی قانون کے اور تین پرچے مروجہ قوانین کے ہونے چاہئے۔

3۔ایک بہتر صورت یہ بھی ممکن ہے کہ تقابلی مطالعے کا اہتمام کیا جائے مثلا جہاں مروج ضابطہ فوجداری پڑھایا جائے وہاں اسلام کا قانون جرم و سزا بھی پڑھایا جائے جہاں مروج قوانین مدنی، سول لاء، پڑھائے جائیں وہاں اسلامی قوانین مدنی بھی پڑھائے جائیں پھر اعلیٰ تقابلی مطالعہ کی صورت اختیار کی جائے تاکہ عملی میدان میں استحقاق کی بنیاد پر شریعت کی بالادستی اذہان میں راسخ ہو سکے۔

4۔ قانون کی تعلیم کے بعد جو لوگ قضاء(Judiciary) میں جانا چاہیں ان کے لئے اضافی تدریس کا انتظام ہو تاکہ وہ اس کام کی اہمیت اور تقاضوں کو سمجھ سکیں اور ان کی اضافی اخلاقی تربیت کا اہتمام بھی ہو سکے۔

5۔لاء کالجوں میں صرف قانون اور اسلامی قانون کی تدریس ہی کا انتظام نہیں ہونا چاہیے بلکہ قانون پڑھنے والے طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی خصوصی اہتمام ہونا چاہیے کیونکہ اسلامی معاشرے میں ایک قاضی اور مفتی کا بہت اونچا مقام ہوتا ہے اور ماضی میں عموما ایسے ہی لوگ اس منصب پر کام کرتے رہے ہیں جو کردار و اخلاق میں عام لوگوں سے بڑھ کر تھے۔

6۔ جب تک حکومت اس بارے میں باقاعدہ کوئی فیصلہ کرے پرائیویٹ سیکٹر میں ایسے لوگوں کو حرکت میں آنا چاہیے جو شعبہ قانون سے متعلق ہوں اور شریعت کا درد بھی رکھتے ہوں اور ایسے لاء کالج کھولنے کی کوشش کی جانی چاہیے جن میں قانون اور شریعت دونوں پڑھائے جائیں۔

7۔ایسے لاء کالج جہاں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا انتظام ہو وہاں اسلامی قانون میں اعلیٰ پائے کی ریسرچ کا اہتمام بھی ہونا چاہیے خصوصا مروج قوانین اور شرعی قوانین میں تقابلی مطالعے کی اہمیت اور ضرورت تو دو چند ہے اور اس سلسلے میں بہت بڑا خلاء محسوس ہوتا ہے اس خلاء کو پر کرنے کی جدوجہد فی الفور شروع کی جانی چاہیے۔

8۔اس کے ساتھ ہی عبوری دور کی ضرورت کے پیش نظر بنیادی فقہی کتب کے عربی سے اردو میں ترجمے کی کوششیں بھی ہونی چاہئیں تاکہ جو لوگ ملک کے عدالتی ڈھانچے میں پہلے سے کام کر رہے ہیں وہ اسلامی قانون سے معقول حد تک واقف ہو سکیں۔

9۔ اگرچہ تدریس کا براہ راست تعلق ان طلباء ہی سے ہے جو قانون پڑھنا چاہتے ہیں اور اس میدان میں مستقبل بنانا چاہتے ہیں لیکن ان لوگوں کی تدریس و تربیت کا بھی بہر حال انتظام ہونا چاہیے جو اس وقت ملک کے قانونی ڈھانچے کو عملا چلا رہے ہیں اس غرض کے لئے عدالتی افسروں کی اسلامی قانون میں تربیت ناگزیر ہے، جس میں نچلے درجے کی عدالتوں اور بڑی عدالتوں میں کسی امتیاز کی ضرورت نہیں کیونکہ ان سب کو اسلامی قانون کی تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے۔

خلاصہ بحث:

"شرعی احکام کی تنفیذ میں اسلامی ریاست کے فرائض واختیارات: (پاکستان کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ)" کے عنوان کے تحت اس بحث کو مقدمہ کے بعد چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پاکستان چونکہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے معرض وجود میں آیا۔ ایک آزاد مملکت کا قیام، جہاں شرعی احکام کا نفاذ ہو، برصغیر کے مسلمانوں کا دیرینہ خواب تھا۔ یوں تو برصغیر پر مسلمانوں نے صدیوں حکومت کی لیکن چونکہ اس خطہ میں مختلف قومیں آباد تھیں جن کا رہن سہن، بود و باش، عقائد و نظریات، معاشرت و معاملات اور عبادات ورسومات مسلمانوں سے جدا تھے، اس لیے ایک ایسا ملک جہاں شریعت کا نفاذ ہو اور مسلمان آزادانہ طور پر اپنے دین اور شریعت کی پیروی کر سکیں، اس ضرورت کے پیشِ نظر مسلمانوں نے ایک الگ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے جد وجہد کی اور نتیجۃً پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ اس پس منظر میں پہلے باب میں اسلامی ریاست کی حیثیت سے پاکستان کی تشکیل اور شرعی احکام کی تنفیذ میں اس کے فرائض واختیارات کو ذکر کیا گیا ہے۔ اور ایک ریاست، حقیقی اسلامی ریاست تب ہی کہلائے گی جب اس میں سو فیصد شریعی احکام کی تنفیذ ہو۔ عبادات، اخلاقیات، معاملات اور معاشرت سب اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں، اس ضمن میں دوسرا باب عبادات سے متعلق شرعی احکام کی تنفیذ کے بارے میں ہے جس میں نماز کی اقامت، نظام زکوٰۃ کا قیام اور حج اور روزہ سے متعلق امور کو ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں پاکستان میں تعلیمی امور میں اسلامی احکام کی تنفیذ کو ذکر کیا گیا ہے، جس کے تحت اختلاف رائے کے آداب، مخلوط تعلیم کے مسائل اور غیر نصابی سرگرمیوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ چوتھے باب میں پاکستان میں سماجی مسائل کے حل کے لیے احکام اسلامی کی تنفیذ کو ذکر کیا ہے جس کے ذیل میں پردہ ولباس سے متعلق معاملات، سوشل میڈیا کے استعمال کے آداب اور جنسی مصنوعات کی فروخت کی حدود کو ذکر کیا گیا ہے۔ پانچواں باب پاکستان کے معاشی مسائل کے حل کے لیے احکام اسلامی کی تنفیذ سے متعلق ہے اور اس باب میں مہنگائی کے مسائل، نظام اراضی کی اصلاح اور سرکاری املاک کی آبادکاری کے متعلق اسلامی احکام کی تنفیذ کو ذکر کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں پاکستان میں احکام اسلام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹیں اور ان کا حل ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب میں پاکستان میں احکام اسلام کی تنفیذ کی کوششوں کا جائزہ، احکام اسلام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹیں اور احکام اسلام کی تنفیذ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کے خاتمے کے لئے تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ زندگی کے تمام شعبوں میں احکام اسلام کی تنفیذ ریاست کی ہی ذمہ داری ہے، اور ان احکامات کی تنفیذ کے لیے ریاست وسیع تر اختیارات کی حامل ہوتی ہے، اس لیے پاکستانی ریاست جو خالص

اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آئی ہے، اس کی اولین ذمہ داری ہے کہ اپنے وسیع تر اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ملک میں شرعی احکام کے نفاذ کے لیے عملی جدوجہد کرے تاکہ پاکستان ریاست مدینہ کا نمونہ بن کر ساری دنیا کے لیے مثال بن جائے۔

نتائج بحث:(Conclusion)

زیر نظر بحث سے حاصل ہونے والے نتائج درج ذیل ہیں۔

- حقیقی اسلامی ریاست وہ ہے جس میں شریعت کے قوانین کا نفاذ ہو۔
- اسلامی ریاست کے بنیادی فرائض اقامت صلوۃ، زکوۃ کا نظام قائم کرنا، نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہیں۔
- اسلامی ریاست میں سزاؤں کا نفاذ سربراہ ریاست کی ذمہ داری ہے اور وہ سزا تجویز بھی کر سکتا ہے مگر حدود اللہ کے نفاذ میں کوتاہی اور تبدیلی اس کے دائرہ اختیار سے خارج ہے۔
- اسلامی ریاست کا حکمران مطلق العنان نہیں ہوتا۔ وہ قرآن وسنت کے منافی قانون سازی نہیں کر سکتا۔
- پاکستان میں نفاذ اسلام کی کوششوں کا دستوری آغاز قرارداد مقاصد سے ہوا جو 12 مارچ 1949ء کو دستور ساز اسمبلی میں پیش کی گئی۔ اس میں یہ عہد کیا گیا کہ پاکستان میں اسلامی تعلیمات کے مطابق جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں پر عمل کیا جائے گا۔
- پاکستان کو شریعت کے نفاذ میں جن چیلنجز کا سامنا ہے ان میں عوام میں دینی جذبہ کی کمی، ملک کے بااثر طبقات، حکومتی سطح پر قوت فیصلہ کی کمی، غیر ملکی دباؤ اور شریعت کے ماہرین کی کمی ہے۔
- قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ کو قانون سازی کا ماخذ تسلیم کیا جائے اور قانون سازی کی بنیاد بنایا جائے۔
- مجلس شوریٰ کے انتخابات کے دوران اس بات کا خیال کیا جائے کے بالغ رائے دہی کے ذریعے ہوں۔
- اسلامی ریاست کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔
- معاشرے کو اسلامی اصولوں کے مطابق استوار کرنے کے لیے کردار ادا کرنا پاکستانی ریاست کی ذمہ داری ہے۔
- پاکستانی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کے منافی کسی قسم کی قانون سازی نہ ہونے دے۔
- جو قوانین پہلے سے اسلامی تعلیمات کے منافی بن چکے ہیں انھیں اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ریاست کردار ادا کرے۔

تجاویز وسفارشات:(Recommendations)

- اس مقالہ کی اہم تجاویز وسفارشات درج ذیل ہیں۔
- سفارشات برائے محققین علوم اسلامیہ:
- درج ذیل عنوانات پر تحقیق کی جاسکتی ہے۔
- 1-مختلف اسلامی ممالک میں نفاذ شریعت کے لیے کی جانے والی کوششوں کا تقابلی جائزہ۔ مثلاً پاکستان اور مصر
- 2-پاکستان میں اسلامی نظام کے بارے میں پھیلائے جانے والے شکوک وشبہات اور ان کا ازالہ۔
- 3-پاکستان میں شرعی احکام کی تنفیذ کی کوششیں اور اس پر فرقہ واریت کے اثرات کا جائزہ۔
- سفارشات برائے عوام الناس:
- عوام الناس ایسے حکمرانوں کا انتخاب کریں جو ملک میں شرعی نظام کا نفاذ کریں، اور وہ قول وفعل کے پکے ہوں اور ملک وقوم کے ساتھ مخلص ہوں۔
- سفارشات برائے حکومتی ودستوری ادارے:
- ملکِ خداداد پاکستان اسلام کے مقدس نام پر حاصل کیا گیا ہے لہذا ملک میں فوری طور پر اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔
- لوگوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگیاں گزارنے کے لیے سہولیات فراہم کی جاہیں۔
- ریاست عوام کے دینی تشخص، جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کو یقینی بنائے۔
- اقامت نماز کے لیے اقدامات کیے جائیں، سرکاری دفاتر میں، تعلیمی اداروں میں، کاروباری مراکز میں اور پبلک مقامات پر لوگوں کو اقامت نماز کے لیے سہولیات فراہم کی جائیں۔
- ملک پاکستان میں نظام زکوٰۃ کو بہتر اور فعال کیا جائے تاکہ ملک سے غربت وافلاس کا خاتمہ کیا جاسکے۔
- تعلیمی نظام کو بہتر بنایا جائے۔ تعلیم کاروبار بن چکی ہے، تعلیم خریدی جارہی ہے اور بیچی جارہی ہے، استاد کی ناقدری کی جا رہی ہے۔ بلکہ تعلیم تو یہاں تک کاوربار کی شکل اختیار کر چکی ہے کہ اگر شعبہ تعلیم سے روزگار نہیں مل سکتا تو اس کے حصول کی کوشش نہیں کی جاتی۔ تعلیمی اداروں کو باور کرایا جائے کہ تعلیم کو مادی آسائشوں کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ انسانیت کی خدمت کرنے کا ذریعہ بنایا جائے۔
- ملک میں اسلامی تہذیب وتمدن کو فروغ دیا جائے، اور مغربی تہذیب وتمدن کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ وہ اسباب جن کی وجہ سے تہذیبی وتمدنی مسائل پیدا ہورہے ہیں ان کو کنٹرول کیا جائے جیسے ٹی وی، کیبل، انٹرنیٹ، موبائل وغیرہ، جن

کی وجہ سے آج نئی نسل مغربی تہذیب کو بڑے فخر سے اپنا رہی ہے، فحاشی و عریانی، مردوں، عورتوں کا آزادانہ میل جول، ناچ گانے اور آتش بازی جیسی چیزیں ان کے اندر داخل ہو چکی ہیں۔

- معاشرت واخلاقیات کو درست کرنے کے لیے میڈیا کی بھی اصلاح کی جائے تاکہ غیر اسلامی اور حیاء سوز سرگرمیاں جیسے ویلنٹائن ڈے، بسنت کی بہار اور ہولی، دیوالی وغیرہ کی رسومات عوام میں سرایت نہ کر جاہیں۔ اور اداکار و فنکار غیر شرعی اور عریاں لباس کو متعارف نہ کروائیں۔

شرعی احکام کے نفاذ کے راستے میں حائل رکاوٹوں کو پہچان کر ان کا سد باب کیا جائے اور پاکستان کو ایک حقیقی اسلامی فلاحی ریاست بنایا جائے تاکہ دنیا کے لیے ایک مثال بن سکے۔

فہرست آیات

نمبر شمار	آیت	سورۃ	آیت نمبر	صفحہ نمبر
1	وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَآئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ	البقرۃ	30	58
2	وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ	البقرۃ	43	121
3	حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ	البقرۃ	109	121
4	قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ	البقرۃ	111	126
5	رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَه مِنَ	البقرۃ	126	178
6	مَاكَانَ اللہ لِيُضِيْعَ اِيمانكم	البقرۃ	143	111
7	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ	البقرۃ	183	100
8	الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ	البقرۃ	197	102
9	وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ	البقرۃ	213	118
10	وَعَسَى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ	البقرۃ	216	162
11	اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبَا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ	البقرۃ	275	218
12	قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا	البقرۃ	275	187
13	يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِى الصَّدَقَاتِ	البقرۃ	276	218
14	إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ	ال عمران	19	151
15	لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ	ال عمران	92	199
16	وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ	ال عمران	97	104
17	وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ	ال عمران	104	30
18	وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمَاوَاتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ	ال عمران	109	193
19	فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۖ	ال عمران	159	247،25،61
20	وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	ال عمران	161	215
21	وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ	النساء	5	210

22	يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ	النساء	29	215،214
23	أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ	النساء	54	121
24	اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا	النساء	58	215،209
25	يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ	النساء	59	213،58،24،
26	فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتَّىَ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ	النساء	65	22
27	إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا	النساء	103	77
28	اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ	المائده	3	151،57
29	أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَابَ بِٱلْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ	المائدة	48	21،57
30	اَلَا لَهُ الْحُكْمُ	الانعام	62	21
31	قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُونَ	الانعام	148	126
32	وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلَآئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ	الانعام	165	59
33	وَلَقَدْ مَكَّنَّكُمْ فِى ٱلْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا	الاعراف	10	58،36
34	يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ	الاعراف	26	153
35	اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِه	الاعراف	28	193
36	اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ	الاعراف	40	20
37	وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ	الاعراف	95	179
38	يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا	الانفال	27	214
39	اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ	الانفال	58	214
40	فان تَابُوْا وأَقَامُوْا الصَّلٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلهمْ	التوبه	5	109
41	فانْ تَابُوْا واقامُوا الصَّلاةَ وآتوا الزكٰوة فاخْوَانُكُمْ	التوبه	11	78
42	إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاء وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ	التوبة	60	143
43	وَٱلْمُؤْمِنُونَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ	التوبة	71	37
44	خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا	التوبة	103	86،74

45	وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً	هود	118	111،114
46	اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ	یوسف	54	21
47	اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ	یوسف	55	210
48	اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ	النحل	125	125
49	خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً	الکهف	81	85
50	فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا	مریم	17	137
51	إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَنِ صَوْماً	مریم	26	97
52	وَاَوْصِيْنِيْ بِالصَّلَاةِ والزَّكَاةِ مَادُمْتُ حيًا	مریم	31	109
53	كانَ يَأْمُرُ أهله بِالصَّلَاةِ والزَّكَاةِ وكانَ عِنْدَ رَبِه	مریم	55	109
54	وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا	طه	124	180
55	بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ	الانبیاء	26	17
56	ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ أَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا۟	الحج	45	13،19،20، 30،35،57، 62،
57	وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْن	المؤمنون	3	146
58	وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ	النور	31	79،153
59	اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ	القصص	26	215
60	إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَر	العنکبوت	45	76
61	وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ	العنکبوت	46	125
62	لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	الاحزاب	21	125
63	هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ	الاحزاب	43	75
64	وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ	الاحزاب	53	137
65	وَ مِنْ اٰیٰتِه اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا	الروم	21	169

111	22	الروم	وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ	66
127	24	سباء	وَإِنَّا أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَى هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ	67
59،57	26	ص	يَا دَاوُوْدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ	68
129	34	فصلت	وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ	69
115	13	شوریٰ	أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا	70
115	14	شوریٰ	وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا	71
247،62،25	38	شوریٰ	وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ	72
21	12	مؤمن	فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ	73
197	-63 64	الواقعة	اَفَرَاَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَه اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ	74
29	25	الحديد	لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ	75
22	7	الحشر	وَمَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا	76
187،181	9	الحشر	وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ	77
187	11	الجمعة	يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ	78
87	24	المعارج	وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ	79
183	11	نوح	فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا	80
197	24	العبس	فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِه اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا	81
185	6-1	المطففين	وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ	82
151	4	التين	لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ	83
111	19	العلق	وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ	84
76	5	البينة	وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ	85
118	2-1	ا لتكاثر	أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ، حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ	86

فہرست احادیث:

نمبر شمار	حدیث کا متن	کتاب کا نام	صفحہ نمبر
1	اجْمَعُوا لَهُ الْعَابِدِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَاجْعَلُوهُ شُورَى بَيْنَكُمْ	اعلام المعوقین	26
2	ادْرَؤوا الحُدودَ عن المسلِمينَ ما اسْتَطَعْتُم.....	جامع ترمذی	31
3	ادْفَعُوا الْحُدُودَ مَا وَجَدْتُمْ لَه مَدْفَعًا -----	سنن ابی داؤد	67
4	ادْفَعُوا الْحُدُودَ مَا وَجَدْتُمْ لَه مَدْفَعًا	ابن ماجہ	31
5	اِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ لَا خلَابَةَ بَيْنِى وَبَيْنَکَ وَلِىَ خِيَارٌ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ	صحیح بخاری	187
6	اذا بايعت فقل لا خلالبة بينى وبينک ولى خيار ثلاثة ايام----	صحیح بخاری	240
7	إِذَا حَكَمَ الحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ	صحیح بخاری	117
8	إِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ فَلْيَجِبْ، فَإِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ، وَإِنْ كَانَ مُفْطِرًا	صحیح مسلم	75
9	اسْتَأْخِرْنَ، فَإِنَّهُ لَيْسَ لَكُنَّ أَنْ تَحْقُقْنَ الطَّرِيقَ عَلَيْكُنَّ بِحَافَّاتِ الطَّرِيقِ-	سنن ابی داؤد	138
10	أَشَدَّ حياءً من العَذْرَاءِ في خِدْرِهَا، فإذا رأى شيئا يَكْرَهُهُ	صحیح بخاری	153
11	أقربُ مَا يَكونُ العبْدُ مِن ربِّهِ وَهَو ساجدٌ، فَأَكثِرُوا الدُّعاءَ-----	صحیح مسلم	109
12	أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى أَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ---------	مسند احمد	19
13	ألا لعلكم لا تروني بعد عامكم هذا» ثلاث مرات----	مسند الشامیین	157
14	اَلسَمْعُ وَالطَّاعَةُ حَقٌّ مَا لَمْ يُؤمَر بِالْمَعْصِيَةِ فَاِذَا اَمَرَ بِالْمَعْصِيَةِ فَلَا سَمْع	صحیح بخاری	35
15	اَللّٰهُمَّ مَن وَّلِيَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِيْ شَيْئًا، فَشَقَّ عَلَيهِمْ فَاشقق عَلَيْهِ ،------	صحیح مسلم	60
16	اللّٰهُمَّ لَاعَيْشَ اِلَّا عَيْش الَاخِرَةَ فَاغْفِرِ الْمُهَاجِرَ وَالَانْصَارَ	صحیح بخاری	80
17	اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلَهَ اِلَا اللهُ	صحیح بخاری	64
18	اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّى يَقُوْلُوْا لَااِلهَ اِلَا اللهُ فَاِذَا قَالُوْا وَصَلُّوْا----	صحیح بخاری	64
19	أَمَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِصَدَقَةِ الْفِطْرِ قَبْلَ أَنْ تَنْزِلَ---	سنن النسائی	87
20	انَّ اللهَ يَرْفَعُ بِهذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّيَضَعُ به اٰخَرِيْنَ----	صحیح مسلم	79
21	اِنَّ الْاَمِيْرَ اِذَا ابْتَغِىْ الرِّيْبَةَ فِىْ النَّاسِ اَفْسَدَهُمْ	سنن ابوداؤد	67
22	انَّ اللَّهَ لاَ يَنْزِعُ العِلْمَ بَعْدَ أَنْ أَعْطَاكُمُوهُ انْتِزَاعًا-----	صحیح بخاری	119

23	إنَّ اللهَ هو المسَعِّر القابضُ الباسطُ الرازقُ-----	سنن ابی داؤد	227
24	أنَّ النبي ﷺ بعث معاذًا إلى اليمن--------	صحیح بخاری	119
25	انَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ هدايَا الْأُمَرَائِ غُلُوْلٌ-----	مصنف عبد الرزاق	216
26	أن امرأة أتت رسول الله صلى الله عليه وسلم ومعها ابنة لها----	سنن ابی داؤد	132
27	أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ أَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الجَرَّاحِ----	صحیح بخاری	119
28	ان زاهرا باديتنا ونحن حاضروه-----	مرقاۃ المفاتیح	183
29	إِنْ عِشْنَا خَالَفْنَاهُمْ , وَصُمْنَا الْيَوْمَ التَّاسِعَ----	الامالی	169
30	إِنْ قَامَتِ السَّاعَةُ وَفِي يَدِ أَحَدِكُمْ فَسِيلَةٌ----	صحیح بخاری	198
31	إنما الأعمال بالنيات	صحیح بخاری	91
32	إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى-----	صحیح بخاری	124
33	اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا	ابن ماجہ	35
34	اِيَّاكُمْ وَالشُّخ، فَاِنَّهُ اَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ سَفَكُوْا دِمَاءَهُمْ	ادب المفرد	181
35	بعث معاذا إلى اليمن فقال:"إنك تاتي قوما اهل كتاب-----	سنن ابی داؤد	77
36	بُنِيَ الإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ:شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَا الله وَأَنَّ مُحَمَّدَا رَّسُوْلُ اللهِ	صحیح بخاری	73
37	بُنِيَ الإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ:شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَا الله وَأَنَّ مُحَمَّدَا رَّسُوْلُ للهِ	صحیح بخاری	77
38	بِئْسَ الْعَبْدُ الْمُحْتَكِرُ إِنْ أَرْخَصَ اللَّهُ الْأَسْعَارَ حَزِنَ وَإِنْ أَغْلَاهَا فَرِحَ	زاد الطالبین	182
39	بينما النبي صلى الله عليه وسلم في مجلس يحدث القوم جاءه أعرابي---	صحیح بخاری	215
40	التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ	سنن الترمذی	184
41	ثلاثٌ مَنْ جَمَعَهُنَّ فَقَدْ جَمْعَ الإِيْمَانُ: الإِنْصَافُ مِنْ نَفْسِكَ،	صحیح بخاری	128
42	ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ---	صحیح مسلم	185
43	حَصِّنُوا أَمْوَالَكُمْ بِالزَّكَاةِ، وَدَاوُوا مَرْضَاكُمْ بِالصَّدَقَةَ----	سنن ابی داؤد	145
44	خَمسُ صَلَواتٍ كَتَبهنَّ اللهُ عَلَى العِبَادِ، فَمَنْ جَاءَ بهنَّ لم يضيع	سنن ابی داؤد	77
45	خِيَارُ أَئِمَتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُوْنَهُمْ وَيُحِبُوْنَكُمْ ------	صحیح مسلم	60

46	خَيْرُ صُفُوفِ الرِّجَالِ أَوَّلُهَا، وَشَرُّهَا آخِرُهَا، وَخَيْرُ صُفُوفِ النِّسَاءِ----	صحیح مسلم	138
47	ذُكِرَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ عَاشُورَاءُ وَقِيلَ إِنَّهُ يَوْمٌ	الامالی	116
48	الرِّبَا سَبْعُونَ حُوبًا، أَيْسَرُهَا أَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ أُمَّهُ----	الترغیب والترھیب	217
49	سَبْعة يُظِلّهمُ الله فِيْ ظِلِه يَوْمَ لَاظِلَّ إِلَّا ظِلّه اَلْإِمَامُ الْعَادِلُ----	صحیح بخاری	94
50	السلطان ولی من لا ولی له-----	ابن ماجہ	97
51	صلاةُ المرأةِ في مَخدعِها أفضلُ من صلاتِها في بيتِها، وصلاتُها في بيتِها	سنن ابی داؤد	154
52	طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ	ابن ماجہ	34
53	عَنْ مَعْدِيْكَرَبٍ وَاَبِيْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِيﷺ قَالَ: إنَّ الأميرَ إذا ابتغى	سنن ابی داؤد	31
54	عَنْ مَعْدِيْكَرَبٍ وَاَبِيْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِيﷺ قَالَ: إنَّ الأميرَ إذا ابتغى	سنن ابی داؤد	98
55	فإذا كانت لك مائتا درهم، وحال عليها الحول، ففيها خمسة دراهم-	سنن ابی داؤد	133
56	فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُوْرِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا	صحیح بخاری	186
57	فأعطى النبي صلى الله عليه وسلم أكثرها للمهاجرين وقسمها بينهم	تلخیص ابی داؤد	195
58	فَاِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا ----	صحیح بخاری	64
59	فَإِيَّاكَ وَكَرَائِمِ أَمْوَالِهِمْ	صحیح بخاری	92
60	فَذَلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِيْ لَهٗ ذِمَّةَ اللهِ وَرَسُوْلِهِ فَلَا تَخْفُرُوْا اللهَ فِيْ ذِمَّتِهِ	صحیح بخاری	36
61	فَذَلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِيْ لَهٗ ذِمَّةَ اللهِ وَرَسُوْلِهِ فَلَا تَخْفُرُوْا اللهَ فِيْ ذِمَّتِهِ ---	صحیح بخاری	65
62	فُرِضَتْ عَلَى النَّبِيِّ صَلى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ أُسْرِي بِهِ الصَّلوَات----	سنن ترمذی	75
63	قال النَّاسُ يا رسولَ اللَّهِ، غلا السِّعرُ فسعِّر لَنا	سنن ابی داؤد	178
64	قطع أنفه يوم الكلاب، فاتخذ أنفا من ورق، فأنتن عليه----	سنن ابی داؤد	131
65	كَانَ النَّاسُ يَسْأَلُونَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الخَيْرِ----	صحیح بخاری	120
66	كَادَ الْفَقْرُ اَن يَّكُونَ كُفْراً	سنن بیہقی	178
67	كلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهُ وَمَالُهُ وعِرْضُهُ ----	صحیح مسلم	65
68	كُنَّا أَكْثَرَ الْأَنْصَارِ حَقْلًا فَكُنَّا نُكْرِي الْأَرْضَ، فَرُبَّمَا أَخْرَجَتْ---	صحیح بخاری	200
69	كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه	صحیح مسلم	36

70	لا تَتخِذوا الضَّيْعَةَ فترغَبُوا في الدنيا----	سنن ترمذی	196
71	لا تَحَاسَدُوا، ولا تَنَاجَشُوا ولا تَبَاغَضُوا، ولا تَدَابَرُوا----	صحیح مسلم	186
72	لا زكاة في مال الضِّمار	سنن ترمذی	90
73	لَا صَلوةَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ ---	سنن دار قطنی	81
74	لا يمنع فضل الماء-----	صحیح بخاری	205
75	لاَ يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ، حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ	صحیح بخاری	132
76	لَعَنَ آكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهُ وَشَاهِدَيْهِ وَكَاتِبَهُ----	صحیح مسلم	217
77	لَعَنَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ الرَّاشِیَ وَالْمُرْتَشِیَ فِی الْحُكْمِ----	سنن ترمذی	215
78	اللّٰهُمَّ لَاعَيْشَ اِلَّا عَيْش الاٰخِرَةَ ----	صحیح بخاری	83
79	لَوْ تَرَكْنَا هَذَا الْبَابَ لِلنِّسَاءِ،قَالَ نَافِعٌ: فَلَمْ يَدْخُلْ مِنْهُ ابْنُ عُمَرَ،	سنن ابی داؤد	138
80	ليس على المسلم صدقة في عبده ولا في فرسه----	صحیح بخاری	130
81	لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ صَدَقَةٌ، وَلَا فِيمَا دُونَ خَمْسِ أَوَاقٍ صَدَقَةٌ	مسند احمد	133
82	ما من رجلٍ يكونُ في قومٍ يعملُ فيهم بالمعاصي يقدِرون على أن----	سنن ابی داؤد	37
83	مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا، أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا، فَيَأْكُلُ منه طَيْرٌ أَوْ إِنْسَانٌ	صحیح بخاری	198
84	المراة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان----	جامع ترمذی	204
85	المسلِمونَ شُرَكاءُ في ثلاثٍ: في الكلأ، والماءِ، والنَّارِ----	سنن ابی داؤد	200
86	مَن أحيا أرضًا ميّتةً فَهيَ لَهُ وليسَ لعِرقٍ ظالمٍ حقٌّ----	سنن ابی داؤد	193
87	مِنْ اَيْنَ اِكْتَسَبَ وَفِيْمَا أَنْفَقَ ----	سنن الترمذی	188
88	مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ	سنن ابی داؤد	116
89	مَنْ دَعَا اِلٰی اَمَارَةٍ نَفْسِهِ اَوْغَيْرِهِ مِنْ غَيْرِ مَشْوَرَةٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ----	کنز العمال	26
90	من شفع لأخيه شفاعة فأهدى له عليها هدية فقبلها----	سنن ابی داؤد	216
91	مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا---	صحیح مسلم	186
92	مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ إِلَى بَيْتِ اللَّهِ وَلَمْ يَحُجَّ ، فَلَا عَلَيْهِ أَنْ يَمُوتَ	سنن الترمذی	109
93	النكاح من سنتي، فمن لم يعمل بسنتي فليس مني----	سنن ابن ماجہ	152

94	نَهَى رَسُوْلُ اللهِ صَلى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تَلَقِى الرُّكْبَانَ ---	صحیح بخاری	186
95	وَالَّذِىْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ سَرَقَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ لَقَطَعْتُ يَدَهَا ---	صحیح مسلم	39
96	وَالَّذِىْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ سَرَقَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ لَقَطَعْتُ يَدَهَا ---	صحیح بخاری	96
97	وَالَّذِىْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ سَرَقَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ لَقَطَعْتُ يَدَهَا ---	صحیح مسلم	70
98	وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِه! لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ، وَلَتَنهوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ-----	جامع ترمذی	38
99	وَإِنَّ اللهَ أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا حَتَّى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ----	صحیح مسلم	118
100	يَا رَسُولَ اللَّهِ يَدْخُلُ عَلَيْكَ البَرُّ وَالفَاجِرُ-----	صحیح بخاری	137
101	يايها الناس قولوا لا اله الا الله تفلحون	مسند احمد	19
102	يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ، مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ	صحیح بخاری	173

فہرست مصادر مراجع:

* ابن القیم الجوزیہ، ابو عبداللہ محمد بن ابو بکر، **إعلام الموقعین عن رب العالمین**، دار ابن الجوزیہ طبع اولی، 1423ھ
* ابن خلدون، **مقدمہ ابن خلدون**، دار النھضۃ مصر، طبع اولی 1377ھ
* ابن رشد، ابوالولید محمد بن احمد، القرطبیّ الاندلسی، **بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد**، دار التذکیر 2009ء
* ابن قدامۃ، ابو عبداللہ محمد بن احمد، **المغنی**، (کوئٹہ مکتبہ رشیدیہ 1996ء)
* ابن قدامہ، المقدسی، عبدالرحمن بن محمد، **الشرح الکبیر**، دار الکتب العربی، للنشر والتوزیع،
* ابن قیم الجوزیہ، محمد ابن ابی بکر، **اعلام المعوقین عن رب العالمین**، المحقق، مشہور بن حسن، (دار ابن الجوزیہ القاھرۃ)
* ابن کثیر، إسماعیل بن عمر، **تفسیر القرآن العظیم**، 403/6، المحقق: محمد حسین شمس الدین، (الناشر: دار الکتب العلمیۃ،
* ابن کثیر، حافظ عماد الدین، **تفسیر القران العظیم**، (دار الکتب العلمیۃ بیروت، لبنان، طبع اولی 1998)
* ابن منذور، **کتاب الاجماع**، موسوعۃ الاجماع: مکتبہ مکۃ الثقافیۃ، راس الخیمۃ
* ابن منظور، **لسان العرب**، محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری، دار صادر، بیروت 1956ء
* ابن مودود الموصلی، عبداللہ بن محمود، **الاختیار لتعلیل المختار**، مطبع الحلبی، القاھرۃ، 1937ء
* ابن نجیم، زین الدین، **البحر الرائق شرح کنز الدقائق ومنحۃ الخالق وتکملۃ الطوري**، المحقق: زکریا عمیرات، دار الکتب العلمیۃ، 1997ء
* ابوالولید، سلیمان بن خلف الباجي، **المنھاج في ترتیب الحجاج**، دار الغرب الاسلامی 2001ء
* ابو داؤد، سلیمان بن اشعث سجستانی (202۔275ھ/817۔889ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، 1414ھ/1994ء۔
* ابو یوسف یعقوب، بن ابراھیم: **کتاب الخراج**، (القاھرۃ، المطبعۃ السلفیۃ، ط6، 1397ھ)
* احمد بن حنبل، ابو عبداللہ شیبانی (164-241ھ/780-855ء)۔ **المسند**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی للطباعۃ والنشر، 1398ھ/1987ء۔
* أحمد بن فارس بن زکریاء القزویني الرازي، أبو الحسین (المتوفی: 395ھ)، **مقاییس اللغۃ**، المحقق: عبد السلام محمد ھارون الناشر: دار الفکر عام النشر: 1399ھ-1979م
* **اردو دائرہ معارف اسلامیہ**، جلد ۱۱، (ناشر دانش گاہ پنجاب لاہور، پنجاب یونیورسٹی لاہور، طبع اول، 1975ء)

* اصلاحی، امین احسن، مولانا، **اسلامی ریاست**، (اشاعت ثانی مطبع، گنج شکر پرنٹرز، دار التذکیر، تاریخ اشاعت 2006 رحمن مارکیٹ، اردو بازار لاہور)
* اصلاحی، امین احسن، مولانا، **اسلامی ریاست**، (اشاعت ثانی مطبع، گنج شکر پرنٹرز، دار التذکیر، تاریخ اشاعت 2006ء
* اعوان، امیر افضل، **مسلم معاشرہ میں حکمران کا کردار اور دور حاضر کے تقاضے**، (خبر نامہ رنگ ونور، 10 رمضان المبارک، 1440ھ)
* اکرام قریشی، **تاریخ تعلیم**
* آلوسی، محمود بن عبداللہ حسینی، **روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی**، لبنان دار احیاء التراث العربی۔
* ام عبد منیب، **مخلوط تعلیم**، مشربہ علم وحکمت، دار الشکر، 1429ھ
* امام فرید الدین، عالم بن علاء، **فتاویٰ تاتارخانیہ**، (مکتبہ زکریا، دیوبند، ہند، 1428ھ)
* امینی، تقی الدین، **اسلام کا زراعی نظام**، مطبوعہ، اشوکا پریس، دھلی، 1955ء
* انصاری، ظفر احمد، **ہمارے دستوری مسائل کا نظریاتی پہلو**، (آفاق پبلیکیشنز بندر روڈ کراچی)
* بخاری، ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (194-256ھ/810-870ء)۔ **الصحیح**، بیروت، لبنان+ دمشق، شام: دار القلم، 1401ھ/1981ء۔
* بدر الدین العینی، ابو محمد محمود بن احمد، **البنایۃ شرح الھدایۃ**، دار الکتب العلمیۃ، 2012ء
* البغوی، امام، الحسین ابن مسعود، **شرح السنۃ**، المکتبہ الاسلامی 1983ء
* بلیاوی، ابو الفضل عبد الحفیظ، **مصباح اللغات**، مکتبہ، قدوسیہ، لاہور۔
* بھٹی، محمد ارشد خان، **تہذیب اسلامی**، (اصباح الادب، لاہور، 1991)
* بھٹی، محمد اسحاق، **برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش**، (ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۰ء)
* بھٹی، البرٹ عروج، ایم ایم نیوز، 14 اگست 2020ء، https://mmnews.tv/urdu/creation-of-pakistan-objectives-and-historical-background/
* بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبداللہ بن موسیٰ (384-458ھ/994-1066ء)۔ **السنن الکبریٰ**۔ مکہ مکرمہ، سعودی عرب: مکتبہ دار الباز، 1414ھ/1994ء۔

* بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (384۔458ھ/994۔1066ء)۔ **شعب الایمان**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، 1410ھ/1990ء۔
* پروفیسر خورشید احمد، **اسلامی نظریہ حیات**، (شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، 1982)
* پروفیسر فواد، **سیاسی نظام**
* پیرزادہ، سید شریف الدین، **پاکستان منزل بمنزل**، گلڈ اشاعت گھر کراچی، 1965ء
* پیرزادہ، سید شریف الدین، **مسلم لیگ کا قیام پسِ منظر اور جدوجہد، مترجم: شمیم شاہ آبادی**، (نظریہ پاکستان فاونڈیشن، لاہور، اگست، 2006ء)
* تبسم، ڈاکٹر ہارون الرشید، **قرارداد پاکستان سے قیام پاکستان تک**، ھلال اردو، (افواج پاکستان کا مجلہ)، بحوالہ: دی ڈان، 23 مارچ 1944ء
* ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک سلمی، (210۔279ھ/825۔892ء)۔ **الجامع الصحیح**۔ بیروت، لبنان: دار الغرب الاسلامی، 1998ء۔
* تفتازانی، سعد بن عمر، **شرح العقائد النسفیہ**، (میر محمد کتب خانہ کراچی)
* تقی عثمانی، مفتی، **ملکیت زمین اور اس کی تحدید**، (مکتبہ دار العلوم کراچی)،
* الجرجانی، علی بن محمد، **التعریفات** (دار الکتب العلمیہ، بیروت لبنان، 1403ھ، 1983ء)،
* جرجانی، علی بن محمد السید شریف، **التعریفات الجرجانی**، دار الفضیلۃ للنشر والتوزیع والتصدیر، 1321ھ
* الجزیری، عبد الرحمن **الفقہ علی المذاہب الأربعۃ**، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، اشاعت دوم، 2003ء
* جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمن، **مجموعہ قوانین اسلام**، ادارہ تحقیقات اسلامی، راولپنڈی، اشاعت دوم، مارچ 1967ء
* جصاص، ابی بکر بن احمد، **احکام القرآن**، (دار الاحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان)، 1996)
* حافظ عبد السلام بن محمد، **احکام زکوۃ وعشر وصدقہ فطر**، **دار الاندلس، چوبرجی، لاہور**،
* حقانی، ابو محمد عبد الحق،: **تفسیر فتح المنان، المشہور بہ تفسیر حقانی**، (میر محمد کتب خانہ مرکز علم وادب، آرام باغ کراچی)
* حکیم محمود احمد ظفر، **پیغمبر اسلام اور تجارت**، بیت العلوم، 2010ء
* الحلبی، الحاجۃ نجاح، **فقہ العبادات علی المذہب الحنفی**، انٹرنیٹ س ن، طبع اولی 1986ء
* خالد علوی، ڈاکٹر، **اسلام کا معاشرتی نظام، اسلام اور جدید معاشی نظریات**، (الفیصل ناشران وتاجران کتب، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور، 2009ء)

* دریاآبادی، مولاناعبدالماجد، **تفسیر ماجدی**، پاک کمپنی اردو بازار، لاہور، 2007ء
* دریاآبادی، عبدالماجد، **نقوش واثرات حکیم الامت**، مکتبہ مدنیہ اردو بازار، لاہور، جون 1964
* دکتور محمد ضیاء الریس، **الخراج والنظم المالیۃ**، مکتبہ، دار التراث، القاھرۃ، 1985ء
* دھلوی، سید احمد، **فرھنگ آصفیہ**، ترقی اردو بیورو، نئی دھلی، 2000ء
* الدولابي، أبو بِشْر محمد بن أحمد، **الكنى والأسماء**، دار الکتب العلمیۃ، طبع اولی 1999ء
* ڈاکٹر خالد علوی، **اسلام کا معاشرتی نظام**، (الفیصل ناشران وتاجران کتب، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور)
* ڈاکٹر صالح بن عبداللہ حمید، **ادب الخلاف**،
* ڈاکٹر محمد امین، **عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون**، ادارۃ ترجمان القرآن، لاہور، 1989ء
* ڈھلوں، ڈاکٹر عرفان خالد، **علم اصول فقہ، ایک تعارف**، (شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد)،
* ذولفقار، غالم حسین، ڈاکٹر، پروفیسر، **پاکستان تصور سے حقیقت تک**، (بزم قبال 24۔۲ کلب روڈ لاہور،)
* راغب الاصفہانی، **المفردات في غريب القرآن**، (دار القلم بیروت)،
* رحمانی، مولانا خالد سیف اللہ، **قاموس الفقہ**، زمزم پبلیشرز، کراچی، 2007ء
* رفیق احمد، مفتی، بینات، **تحریک پاکستان میں علماء کا کردار ایک پروپیگنڈے کا جواب**، اپریل، 2016ء
* ریاض، سید حسن، **پاکستان ناگزیر تھا**، (شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی، 2010)
* الزبیدی، امام، ابو بکر بن علی، **الجوهرة النيرة على مختصر القدوري**، دار الکتب العلمیۃ بیروت، لبنان، 1971ء
* سعدی، عبدالرحمن بن ناصر، تفسیر سعدی، دار السلام، لاہور 2003ء
* سعید، احمد، پروفیسر، **موالنا اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی**،، (مجلس صیانۃ المسلمین لاہور، 1948ء)
* سوہاروی، حفظ الرحمن، **اقتصادی نظام**، (مکتبہ، شیخ الہند)
* سیوطی، جلال الدین ابوالفضل عبدالرحمن بن ابی بکر، **الدر المنثور فی التفسیر بالماثور**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ۔
* شام، شہزاد اقبال، ڈاکٹر، **دستور پاکستان کی اسلامی دفعات ایک تجزیاتی مطالعہ**، (شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد،،، 2011ء)
* شاہ ولی اللہ، **حجۃ اللہ البالغہ**، مترجم: مولانا خلیل احمد، (کتب خانہ شان اسلام، اردو بازار لاہور)
* شبیر احمد، پروفیسر، خالد، **اسلامی ریاست میں حکمرانوں کی ذمہ داریاں**، مجلسِ احرار الاسلام پاکستان۔

* الشجري، يحيى بن حسين، **الأمالي**، الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت - لبنان الطبعة: الأولى، ١٤٢٢ھ - 2001ء
* **شرح النووی مع صحیح مسلم**: (المطبعۃ المصریہ بالازھر، طبع اولی 1929)
* الشہرستانی، عبدالکریم: **نہایۃ الاقدام فی علم الکلام**، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، 1425ء
* الشیخ یاسر بن حسین برھامی، **ادب الخلاف**، الشبکۃ الإسلامیۃ http://www.islamweb.net الکتاب مرقم آلیا، ورقم الجزء ھو رقم الدرس - 9 دروس
* صدیقی، اقبال احمد (مترجم)، **قائداعظم: تقاریر و بیانات، جلد دوم**، ب (زم اقبال، لاہور نومبر 1998)
* صدیقی، اقبال احمد، (مترجم)، **علامہ اقبال تقریریں، تحریریں اور بیانات**، (اقبال اکیڈمی، لاہور، پاکستان، طبع دوم 2015ء)
* صلاح الدین، بسیونی رسلان: **الفکر السیاسی عند الماوردی**، (مکتبۃ نہضۃ الشرق۔1985)
* ضیاء الرحمن، مفتی، **خواتین کے زیب وزینت کے احکام اور ان کی سائنسی حکمتیں**،
* عائض بن عبد اللہ القرني، **الخلاف أسبابه وآدابه**، (الناشر: الكتاب منشور على موقع وزارة الأوقاف السعودية بدون بيانات)
* عبدالرحمن بن محمد بن سلیمان، **مجمع الانہر، دار الکتب العلمیہ**، (بیروت، ط، اولی، 1998ء)
* عثمانی: علامہ شبیر احمد: ترجمہ شیخ الہند، ادارہ تالیفات اشرفیہ، چوک فوارہ، ملتان،
* عثمانی، مفتی محمد تقی، **نفاذ شریعت اور اس کے مسائل**، (مکتبہ دار العلوم کراچی)
* عسقلانی، حفاظ ابن حجر، امام، **فتح الباري**، دار النشر الکتب الاسلامیہ، لاہور، 1981ء
* عظمی علی، **حکمرانوں کے فرائض**، (ایکسپریس نیوز، 28 دسمبر 2018)
* علاء الدین، علی بن سلیمان المرداوی، الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف، المحقق محمد حامد الفقی، مطبع السنۃ المحمدیۃ، 1956ء۔
* علاء الدین بن حسام الدین، **کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال**، (دار الاشاعت، ایم اے جناح روڈ، کراچی پاکستان)
* علاء الدین، امام ابو بکر بن مسعود، **بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع**، (طبع، ثانیہ، 2002ء بیروت)
* العلوانی، طہ جابر فیاض، **اسلام میں اختلاف کے اصول وآداب** (مکتبہ الکتاب اردو بازار لاہور)،
* علوی، مسعود احسن (مرحوم)، پروفیسر، **ارشاداتِ حکیم الامت**، (طبع ثانی: جنوری 1983ء، ادارہ اسلامیات لاہور)

* علیم اللہ صدیقی، مولوی، مترجم: **مسلمانوں کا نظم مملکت**، (دارالاشاعت، کراچی، 1958)
* الغامدی، جاوید احمد، **ماہنامہ "اشراق"** (دارالاشراق، لاہور، اکتوبر 1985)
* غامدی، جاوید احمد، **اسلامی ریاست کے بنیادی اصول، جدید اسلامی ریاست میں قانون سازی اور مسائل**۔ نٹ
* الغزالی، ابو حامد محمد بن محمد غزالی، طوسی، **احیاء علوم الدین**، دارالمعرفۃ، بیروت، لبنان۔ س ن
* غفاری، پروفیسر ڈاکٹر نور محمد، **نبی کریم ﷺ کی معاشی زندگی**، (دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، 1999ء
* غلام رسول سعیدی، **تبیان القرآن**، (فرید بک سٹال اردو بازار لاہور، الطبع الثالث: جون 1999)
* فتاویٰ ابن باز، 97/14، فتاوی اللجنۃ الدائمۃ،
* **فتاوی عالمگیری**، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور
* فرمودات قائد، قائد اعظم اکیڈمی، 2006ء
* فروز اللغات، مطبوعہ فروز سنز، لاہور
* فضل اللہ الصمد، **شرح ادب المفرد**، دارالکتب الثقافیۃ 1378ھ
* **فقہ الزکوۃ** از یوسف قرضاوی: 1/351-362،، **المیزان فی الاوزان** از مفتی عبدالرحمن رحمانی، **فتاویٰ اللجنۃ الدائمۃ**:،
* الفیومی، احمد بن محمد، **المصباح المنیر في غریب الشرح الکبیر**، دارالمعارف، القاھرۃ، طبع دوم، 2016ء
* القاری، ملا علی بن سلطان، **مرقاۃ المفاتیح، شرح مشکاۃ المصابیح**، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، طبع اولی، 2001ء
* القاسمی، مفتی، شبیر احمد، **فتاوی قاسمیہ**، مکتبہ اشرافیہ، دیوبند، الہند، پہلا ایڈیشن، 1437ھ
* قاضی ثناء اللہ، **تفسیر مظہری** مترجم، (ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، 2002ء)
* قرارداد مقاصد- آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا۔ https://ur.wikipedia.org/wiki
* قریشی، اشتیاق حسین، ڈاکٹر، **علماء میدان سیاست میں، مترجم: ہلال احمد زبیری**، (شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، جولائی 1994ء)
* القزوینی، احمد بن فارس، **مقاییس اللغۃ**، الناشر: دار الفکر عام النشر: 1399ھ-1979م.
* کمال بن السید سالم (2003)، **صحیح فقہ السنۃ وأدلتہ وتوضیح مذاھب الأئمۃ**، القاھرۃ: المکتبۃ التوفیقیۃ.
* کیلانی، عبدالرحمن، **احکام تجارت اور لین دین کے مسائل**، (مکتبۃ السلام، وسن پورہ، لاہور)،

* مالک، ابن انس بن مالکص بن ابی عامر بن عمرو بن حارث اصبحی (93۔179ھ/712۔795ء)۔ **الموطا**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی، 1406ھ/1985ء۔
* ماہانہ چراغ راہ، کراچی، **نظریہ پاکستان نمبر**، جلد 14، شمارہ 12، دسمبر 1960ء، مطبوعہ: مشہور پریس، کراچی
* **ماہنامہ الشریعہ** گوجرانوالہ، 31 علماء کرام کے 22 دستوری نکات، ادارہ،، جلد 26، شمارہ 7، جولائی 2015ء
* الماوردی، ابوالحسن علی بن حبیب البصری: **الاحکام السلطانیۃ والولایات الدینیۃ**، (المطبعۃ المحمدیۃ التجاریۃ بمصر)
* الجاہد، شریف، پروفیسر، **تحریک پاکستان پس منظر و تجزیہ**، (قائد اعظم اکادمی کراچی، 1987)
* محمد اسد، **اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول**، (مکتبہ رحمانیہ، ماڈل ٹاؤن لاہور، طبع 2006ء)،
* محمد امین جاوید، پروفیسر، **تعارف مدنیت**، (ایوان اداب: لاہور، 1992ء)
* محمد بن إبراهيم بن عبد الله التويجري، **موسوعة الفقه الإسلامي** (الطبعة الأولى، بيت الأفكار الدولية)
* محمد بن فرامرز بن علی، **درر الحکام شرح غرر الأحکام**، (الناشر: دار إحياء الكتب العربية)
* محمد شفیع، مفتی، **معارف القرآن**، (مکتبہ معارف القرآن، کراچی، طبع جدید، 2008ء)
* محمد عوامہ، **أدب الخلاف في مسائل العلم والدين**، دار البشائر الاسلامیۃ، بیروت، لبنان، 1997ء
* محمد وسیم اکبر، شیخ، **"اسلامی ریاست میں ذرائع ابلاغ کا کردار"** (مقالہ برائے پی ایچ ڈی گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان 1994)
* محمود، صفدر، ڈاکٹر، **پاکستان تاریخ وسیاست**، (جہانگیر بکس لاہور،)
* محی الدین، مولانا، سید صادق، **سربراہان مملکت کے فرائض**، روزنامہ سیاست، 2 جنوری، 2014
* مسلم، ابن الحجاج قشیری (206۔261ھ/821۔875ء)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔
* المناوی، زین الدین محمد، القاهری، **التيسير بشرح الجامع الصغير**، الناشر: مكتبة الإمام الشافعي - الرياض الطبعة: الثالثة، 1408ھ-1988م
* **منشورات محمد علي بيضون**، بیروت، الطبعة: الأولى 1419ھ۔)
* مودودی: سید ابوالاعلیٰ، **تفہیم القرآن**، (مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ملخصاً)
* مودودی، سید ابوالاعلی، **مقدمہ تفہیم القرآن**، (ادارہ ترجمان القرآن لاہور)
* مودودی، سید ابوالاعلی، **اسلامی ریاست**، (اسلامی پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور، 1985)

* **موسوعۃ الاجماع فی الفقہ اسلامی**، دار الہدی النبوی، للنشر والتوزیع، مصر، طبع اولی 2013ء
* **موسوعہ فقہیہ**: (اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا: جامعہ نگر، نئی دہلی)
* **موسوعہ فقہیہ**: اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا: جامعہ نگر، نئی دہلی
* مولوی سید احمد دھلوی، **فرھنگ آصفیہ**، (مطبع رفاع عامہ پریس لاہور، 1326ھ، 1908ء)
* الناصری، احمد بن خالد، **الاستقصا لاخبار دول المغرب الاقصی**، دار الکتاب، طبع ثالث، 1997ء
* نت: **وظائف الدولۃ**: دراسۃ فی الفکر العربی
* نثار احمد، ڈاکٹر، **عہد نبوی ﷺ میں ریاست کا نشوارتقا، نشریات**، (اردو بازار لاہور، 2008)
* نجیب آبادی، اکبر شاہ خان، مولانا، **آئینہ حقیقت نما، جلد اول**، در ہمدرد پریس واقع کوچہ چیالن طبع یافت
* نسائی، ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب بن علی، **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، 1416ھ/1995ء+حلب، شام: مکتب المطبوعات الاسلامیہ، 1406ھ/1986ء۔
* النسفی، عمر بن محمد، **طلبۃ الطلبۃ فی الاصطلاحات الفقہیۃ**، دار الطباعۃ العامرۃ، ومطبعۃ المثنی بغداد، 2017ء
* النسفی، نجم الدین عمر: **العقائد النسفیۃ**، (القاھرۃ دار احیاء الکتاب العربیۃ لاصحابہا عیسی البابی الحلبی وشرکاء)
* النووي، أبوزكريا محيي الدين يحيى بن شرف، **المجموع شرح المذہب**، الناشر: دار عالم الكتاب: 1423ھ–2003ء
* النووي، أبوزكريا محيي الدين يحيى بن شرف، **المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج**، (دار إحياء التراث العربي–بيروت، الطبعة الثانية، 1392۔)
* ہندی، حسام الدین علاء الدین علی متقی ، **کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، 1399ھ/1979ء۔
* یسین، محمد وسیم، **اسلامی ریاست میں عوام کے حقوق وفرائض**، ہماری ویب۔
* یوسف قرضاوی، ڈاکٹر، **فقہ الزکوۃ**، (البدر پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، طبع دوم، 1983)
* Al mujahid, sharif, **idelogical foundation of pakistan**, shari'ah academy, international islamic university islamabad, 2nd adition 2012, page, 144 - 145
* David Tod, Joanne Thatcher and Rehman, **Sports Psychology**, Palgrave Macmillan, U.K. 2010, P:1-12
* Dr Muhammad Hamidullah, **Muslim Conduct of State**. Islamic Book Trust, kuala lumpur, Malaysia, 2012.

* Dr Muhammad Iqbal, **The Reconstruction of Religious Thought in Islam**. Copyright: Dodo press, 2009.
* Dr. Khalifa Abdul Hakim, **Islamic Ideology**. Zakariya Publishers, New Delhi, India.
* **Encyclopaedia of Social Sciences** Newyork
* Encyclopedia Britannica.
* http://www.madaarik.net/mag5and6/12.htm.
* https://hamariweb.com/articles/90323
* Muhammad Asad. **The Principles of State and Government in Islam**. Islamic Book Trust, kuala lumpur, Malaysia. 1980.
* Rubya Mehdi **The Islamization of the Law in Pakistan (RLE Politics of Islam).**Edition:1st,First Published1994, eBook Published 8 May 2013,Pub. Location London.
* **Sharia Incorporated. A Comparative Overview of the Legal Systems of Twelve Muslim Countries in Past and Present**.Publisher: Leiden University Press. Publisher website: https://www.lup.nl/Publication 2010.
* Stanford Encyclopedia of Philosophy.
* The Encyclopedia of World Religions.
* Untitled. All rights reserved. | Design: HTML
* V.K. Verma, **Eduacation and Sports Psychology**, Educational Publishers and Distributors, 291, Bank Enclave, Laxmi Nagar, Dehli-110092, 2011, P: 1-4